پشیمان
Peshman
ریاض عاقب کوہلر
Kitab Nagri
www.kitabnagri.com

پشیمان

ریاض عاقب کوہلر

(روپیا، رتبہ اور شہرت کسی کے پاس بھی مستقل نہیں رہتے۔ ہر بلندی کے بعد پستی کی ذلت جھیلنا پڑتی ہے۔ اس لیے انسان کو اقتدار کے نشے، دولت کے غرور اور شہرت کی دیوی کی وجہ سے اپنی اصل کو نہیں بھولنا چاہیے۔)

”تم پاگل تو نہیں ہو....؟ اسوہ!“ رباب نے اسے سختی سے جھڑکا۔

”اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔“ اس نے منہ بنایا۔

”اور نہیں تو کیا، بے چارے نے ایسا کیا کر دیا کہ، تم نے اس کی اتنی زیادہ توہین کر دی۔“

”لڑکیوں کو گھورنے والے بے شرم مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ پھر موصوف کا سٹیٹس دیکھو، ایک کلرک کا بیٹا، اسوہ اسلم شکور خان سے عشق فرمانے چلا ہے۔“

رباب مزاحیہ لہجے میں بولی۔"وہ کیا کہتے ہیں....

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

"ایسی کی تیسی اس آتش کی۔"اسوہ نے قہقہہ لگایا۔"اور اس کی آتش پر تو میں نے ایسا پانی پھینکا ہے چنگاری بھی باقی نہیں رہی ہو گی۔"

رباب بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔"ویسے بڑی ظالم ہو یار!....اچھا خاصا ہینڈسم نوجوان ہے، پڑھائی کے لحاظ سے بھی کلاس کا نمایاں لڑکا ہے، کیا ہوا جو غریب ہے۔"

اسوہ نے آنکھیں نکالیں۔"اس کی طرف داری سے بہتر ہے خود اسے اپنالو۔"

"تمھیں تو پتا ہے نا یار!....میری منگنی ہو چکی ہے اور پھر اسوہ شکور کی موجودی میں کسی اور کی دال کہاں گلتی ہے۔"

"نفرت ہے مجھے مرد ذات سے۔"

رباب نے پوچھا۔"تو کیا ساری زندگی کنواری بیٹھی رہو گی؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟"اسوہ نے کندھے اچکائے۔

رباب نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ”حرج کا تو پتا نہیں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ فطرت سے مفر مشکل ہے۔“

”فطرت سے کون بھاگ رہا ہے یار!....“ اسوہ ہنسی۔ ”میں تو مردوں سے دور ہونے کی بات کر رہی ہوں۔“

”تو شادی فطرت ہی ہوتی نا محترمہ۔“

”دفع کرو اس موضوع کو، اگر کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو موڈ خراب نہ کرو۔“

رباب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہاں جی امیر زادیوں کے موڈ کی تو کیا بات ہے۔“

وہ اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولی۔ ”تم کون سا مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہو۔“

”ٹھیک کہا، مگر تمھاری طرح اکلوتی تو نہیں ہوں نا۔“

”اچھا اپنے منگیتر کی سناو...؟“

”کیا سناوں یار!....وہی پیسا کمانے کی مشین بنا ہوا ہے۔“

”کیوں، اب کال نہیں کرتا۔“

”کرتا ہے.... مگر اس کے پاس گپ شپ کا وقت نہیں ہوتا۔ بس خیریت پوچھ کر ایک دو رسمی سے جملے کہنا اور پھر وقت کی کمی کا رونا رو کر خدا حافظ۔“

”اتنا کچھ کم ہے کیا۔“

”کم تو ہے نا....پہلے گھنٹا بھر لمبی کالیں کیا کرتا تھا۔اب دو تین منٹ سے زیادہ اس سے بات نہیں ہو سکتی۔شاید ٹیلی فون کا بل محترم سے برداشت نہیں ہوتا۔“

”تمھارے لیے ہی کما رہا ہے محترمہ“!

”ہاں کہتی تو ٹھیک ہو، ویسے بھی جب مرد ہمارے لیے دن رات خوار ہوں، تو بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”مجھے تو کسی صورت بھی نہیں بھاتے۔“اسوہ نے منہ بنایا۔

رباب نے پوچھا۔”اپنے پاپا بھی اچھے نہیں لگتے۔“

”شٹ اپ یار!....ڈیڈی کیوں اچھے نہیں لگیں گے، میں عام مردوں کی بات کر رہی تھی۔“

رباب اس کے غصے کو خاطر نہ لاتے ہوئے ہنسی۔”انھی عام مردوں میں جب کوئی خاص بنتا ہے تو پھر اس جیسا خاص کوئی نہیں رہتا۔“

اس کی بات اسوہ کو مزید تپا گئی تھی۔”تیری سوئی ابھی تک اسی کمینے پر اٹکی ہوئی ہے۔“

”نہیں جی۔“رباب نے پر زور انداز میں اس کی تردید کی۔”میں اپنے کامی کو یاد کر رہی تھی۔“

اسوہ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔”ہاں یہ ٹھیک ہے۔، خبردار جو تم نے اس کی بات کی۔“

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔”محترمہ!....میں تو نہیں، البتہ تم بار بار اسی کا ذکر چھیڑ دیتی ہو۔“

”ذکر کیا کمینے کا اور وہ پہنچ گیا۔“اسوہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اس وقت یونیورسٹی کی کنٹین میں بیٹھی تھیں۔ رباب نے پیچھے مڑ کر دیکھا عمار نے حسبِ عادت اپنے لیے ایسی جگہ پسند کی تھی جہاں سے اس کی نظریں براہ راست اسوہ کے چہرے پر پڑ سکتی تھیں۔ اور بیٹھنے کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں نے اپنا دل پسند مشغلہ، مطلب اسوہ کے چہرے کا طواف شروع کر دیا تھا۔

"یہ ایسے باز نہیں آئے گا۔" اسوہ نے دانت پیستے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی، مگر رباب نے جلدی سے اس کی کلائی تھام لی۔

"پاگل مت بنو اسوہ!.... کیوں خود کو بدنام کرنے پر تلی ہو اور پھر یوں کسی کو بھی یونیورسٹی کی کنٹین میں بیٹھنے سے منع نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ غصے سے بولی۔ "میں کسی کے بیٹھنے پر نہیں دیدے پھاڑ کر گھورنے پر معترض ہوں۔"

"دیکھو!.... تھوڑی دیر پہلے تم نے اسے گیلری میں جھڑکا۔ بلکہ اس کی اچھی خاصی بے عزتی کی۔ حالانکہ اس نے کوئی بات بھی نہیں کی تھی بس خاموش کھڑا محترمہ کا دیدار کر رہا تھا۔ اور میرے خیال میں یہ اتنا بڑا جرم بھی نہیں ہے۔ کسی کا گھورنا اگر اتنا ہی برا لگتا ہے تو نقاب اوڑھنا شروع کر دو.... ثواب بھی ملے گا اور گندی نظروں سے چھٹکارا بھی۔"

"تم کچھ زیادہ ہی اس کی طرف داری کر رہی ہو۔" اسوہ اپنی سہیلی ہی پر برس پڑی۔

"نہیں، تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کسی کے گھورنے سے تمھارا کیا بگڑتا ہے۔"

"تو کوئی گھورے کیوں۔" اسوہ پیر پٹختی ہوئی کنٹین سے باہر نکل گئی۔ جبکہ رباب افسوس سے سر ہلاتی ہوئی کاونٹر کی طرف بڑھ گئی۔ پیسوں کی ادائی کے بعد اس کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا، مگر اچانک کسی خیال تحت وہ

عمار کی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی،اسوہ کے جانے کے بعد ابھی تک اس کی نظریں بیرونی دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں،جہاں سے گزر کر وہ باہر نکلی تھی۔

اس کے قریب جاکر رباب نے کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔وہ رباب کو اچھی طرح پہچانتا تھا،آخر کو وہ اسوہ کی سہیلی تھی۔

"کیا میں آپ کے دو منٹ لے سکتی ہوں مسٹر عمار"....!

"کیوں نہیں مس!...."اس کا لہجہ حیرانی کا عنصر لیے ہوئے تھا۔

اس کے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے رباب شائستہ لہجے میں بولی۔"مسٹر عمار!....سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہوں گی،کہ اگر میری کوئی بات بری لگے یا آپ اسے اپنی توہین وغیرہ سمجھیں تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔اوران باتوں کو دل پر نہ لینا کہ میرا مقصد ہر گز ہر گز آپ کی دل آزاری نہیں ہے۔"

"آپ مس اسوہ کی سہیلی ہیں اور اس ناتے میں آپ کو بہن سمجھتا ہوں اور بہنیں کبھی بھائیوں کا برا نہیں چاہتیں۔"

"شکریہ عمار بھائی!"وہ ممنونیت سے بولی۔"میں دراصل آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اسوہ کے دل میں آپ کے لیے رتی بھر بھی محبت نہیں ہے۔اور اس کی وجہ شکل وصورت یا کردار کی کوئی خامی نہیں ہے۔یونیورسٹی کے چند خوش شکل لڑکوں میں آپ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔عادات واطوار بھی ٹھیک ہیں۔لیکن آپ معاشی لحاظ سے اسوہ سے بہت نیچے ہو۔وہ اسلم شکور خان کی اکلوتی بیٹی ہے،جو خان گروپ آف کمپنیز کا مالک ہے۔جبکہ آپ ایک کلرک کے بیٹے ہیں۔تو یہ جوڑ کس طرح ہو پائے گا؟بالفرض اگر وہ آپ سے شادی پر راضی ہو بھی جاتی

ہے تو اس کے باپ کو کون راضی کرے گا؟ کیا اسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند گوارا ہو گا....؟ اسی طرح اگر اسوہ بغاوت کر کے آپ سے کورٹ میرج بھی کر لے تب بھی کیا آپ اسے وہ سہولیات، وہ عیش آرام مہیا کر سکتے ہیں جن کی وہ بچپن سے عادی ہے؟ جانتے ہو؟ اس کے صرف ہینڈ بیگ کی قیمت پچاس ہزار ہے۔ اس کے پاوں میں موجود سینڈلوں کی قیمت بیس پچیس ہزار سے زیادہ ہو گی۔ لباس سے لے کر میک اپ کے سامان تک وہ امپورٹڈ اور اتنا قیمتی سامان خریدتی ہے کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک بار کی شاپنگ سے سفید پوش طبقے کی دس پندرہ لڑکیوں کا جہیز آسانی سے تیار ہو سکتا ہے۔ وہ ہر ماہ شاپنگ کے لیے کنیڈا، برطانیہ ، فرانس، ابو ظہبی وغیرہ کا پھیرا لگاتی ہے۔ شاید تعلیم کی تکمیل بھی وہ آکسفورڈ، کیمرج وغیرہ جیسی کسی یونیورسٹی میں کرتی مگر اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈلی ہے اور والدین سے دور نہیں رہنا چاہتی۔"

عمار پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "بہن!.... آپ نے بہت اچھی باتیں کی ہیں، لیکن یقیناً آپ میرے احساسات سے ناواقف ہیں۔ کسی کو چاہنا اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ خواب دیکھنے والے کی نظر اپنی اوقات پر نہیں خدا کی رحمت پر ہوتی ہے اور اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ خواب ہوتا ہی وہی ہے جو امکان سے باہر ہو۔ باقی میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے نہیں مل سکتی۔ نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے کہ اس سے اظہار محبت کروں یا کوئی اور بے ہودگی کا ثبوت دوں۔ البتہ اسے دیکھنا میری مجبوری ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں اس پر گڑی رہتی ہیں یقین مانو میں بے بس ہوں۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ اپنے خوابوں کو سچا کر سکتا۔"

"بھائی!.... آپ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ایسی غلطی کر رہے ہیں۔ دیکھو ناممکن الحصول کی تمنا کرنا بے وقوفی ہی کہلائی جائے گی نا۔ طرفہ تماشا یہ کہ وہ آپ سے محبت بھی نہیں کرتی، بلکہ برا نہ مانو تو یہ کہوں کہ سخت نفرت

کرتی ہے۔اب بھی وہ مجھ سے اس لیے جھگڑ کر کے گئی ہے کہ میں نے اسے آپ کی توہین کرنے سے روکا کیوں۔“

”رباب بہن!....میں کیا کروں؟اس کی نفرت میرے لیے دکھ کا باعث سہی، مگر یہ نفرت میری محبت تو کم نہیں کر سکتی ناں۔“

”میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔“رباب جانتی تھی کہ اس بحث کا کوئی نتیجا نکلنے والا نہیں تھا۔

”آپ شاید خفا ہو گئی ہیں۔“

”نہیں، لیکن افسوس ضرور ہوا کہ آپ جان بوجھ کر اپنا وقار اور عزت خراب کرنے پر تُلے ہیں۔“

”شکریہ رباب بہن!.... آپ کا خلوص بھرا رویہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔“

اور رباب ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے واپس مڑ گئی۔عمار نے اسے مایوس کیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ وہ اسے قائل کر لے گی، مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ مہلک مرض ناقابل علاج ہوتا ہے۔

☆☆☆

”میں نے آج عمار بھائی سے بات کی تھی۔“چھٹی کے وقت پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے وہ اسوہ کو مخاطب ہوئی۔

”میں سمجھی نہیں، کس سلسلے میں؟“اس نے حیرانی سے پوچھا۔”اور وہ تمھارا بھائی کب سے ہو گیا؟“

"جب تم کنٹین سے بھاگ آئی تھیں تو میں نے سوچا چلو اسے برا بھلا سمجھا دوں اور تم دونوں کے درمیان موجود طبقاتی فرق کی طرف اس کی توجہ مبذول کرا دوں۔"

"تو"....

"تو کیا، بس تاویلیں کرنے لگا۔"

"حالانکہ تم نے اسے بھائی بھی بنا دیا پھر بھی وہ نہ مانا۔"

"نہیں، بلکہ اس نے مجھے بہن بنایا ہے اور اس کے تئیں تمھیں نہ دیکھنا اس کے بس سے باہر ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنی اور تمھاری حیثیت سے خوب واقف ہے۔ بہ قول اس کے نہ تو اس نے کبھی مس اسوہ کے ساتھ محبت کا اظہار کیا ہے اور نہ وہ ایسا کوئی ارادہ رکھتا ہے، البتہ کسی کو چاہنا چونکہ غیر ارادی فعل ہے اس لیے وہ خود کو بے بس و بے قصور سمجھتا ہے۔"

"محترمہ!.... اگر اس نے کبھی مجھ سے محبت جتلانے کی کوشش کی تو دیکھ لینا اس کی زبان نہ کٹوا دی تو اسلم شکور خان کی بیٹی نہ کہنا۔"

"اچھا جانے دو یار!.... تم نے تو ہر وقت مرچیں چبائی ہوتی ہیں۔ محبت ہی کرتا ہے ناں، یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ اسے دشمن سمجھ لیا جائے۔"

"روبا!.... وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یقین مانو میں نے یہ بات پاپا جانی کو نہیں بتلائی، ورنہ اب تک اس کی ہڈیوں کا سرما بن چکا ہوتا۔ حالانکہ میں پاپا سے ہر بات شیئر کرتی ہوں۔"

”ذرا میں بھی سنوں کہ تم انکل کو کیا بتاو□ گی، یہی کہ ایک لڑکا میری طرف دیکھتا ہے۔“

”کسی غیر عورت کو گھورنا چھوٹا جرم ہے کیا؟“

”اچھا.... بالفرض تمھیں وہ بہت اچھا لگتا، تو کیا تم اسے گھورتیں۔“

”اس میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ مجھے اچھا لگے گا۔“

”میں نے کہا فرض کرو“....

”پتا نہیں۔“ اسوہ نے منہ بنایا۔

رباب نے اچانک غیر متعلق سا سوال پوچھا۔”اسماء کو جانتی ہو؟“

”پروفیسر احتشام کی بیٹی۔“

”ہاں وہی۔“

”کیا ہوا اسے۔“ اسوہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ اسے کیا ہوا، مگر کبھی کلاس روم میں بیٹھے ہوئے اس کا جائزہ لینا۔“

”یار سیدھی طرح منہ سے پھوٹ دو، کیا تمھارا بل آجائے گا۔“

رباب کو ہنسی آ گئی۔ وہ دونوں اسوہ کی گاڑی کے قریب رک کر محو گفتگو تھیں۔ اس کا ڈرائیور اسے دور ہی سے آتے دیکھ کر کار کے عقبی دروازے کے ساتھ اٹن شن کھڑا ہو گیا تھا۔

"پچھلے چار پانچ دنوں سے وہ بھی کسی کو ایسے ہی گھورتی ہے جیسے کوئی تمھیں گھورتا ہے۔"

"کس کو؟"

"جو تمھیں گھورتا ہے اس کو۔"

"تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔"

"پتا ہوتا تو ضرور ذکر کرتی۔ یہ تو آج عاصمہ نے بتایا ہے۔ ہم دونوں پیریڈ ختم ہونے کے بعد پانی پینے الیکٹرک کولر کی طرف گئی تھیں۔ وہیں اس نے پھوٹ دیا۔"

"احمقوں کے سینگ تو نہیں ہوتے نا۔" اسوہ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

"بات حماقت کی نہیں، محبت کی ہے۔ اب اگر اسے عمار بھائی اچھا لگتا ہے تو کیا کرے، جبکہ یہ بات بھی اس سے چھپی ہوئی نہیں ہوگی، کہ عمار خود کسی دوسرے کی محبت میں مبتلا ہے۔"

اسوہ نے بے پرواہی سے کہا۔ "اچھا تو اس ضمن میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔"

کچھ بھی نہیں۔ بس یہ بتا دو، کہ عمار بھائی جو لازماً اب تک اسماء بی بی کے خیالات سے آگاہ ہو چکا ہوگا اور جسے بالکل بھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ محترمہ اسوہ بی بی کا شیدا ہے۔ تو کیا اس کے گھورنے پر اسے جھاڑ پلا دے یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور کارروائی کرے۔"

اسوہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمھارا عمار بھائی لڑکی تو نہیں ہے نا۔"

رباب تلخی سے بولی۔ ”مس اسوہ اسلم شکور خان!.... اپنے لینے اور دینے کے باٹ ایک ہی رکھو۔ ایک جانب ہم مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلنے کا نعرہ لگائیں اور دوسری جانب ہم لڑکیاں ہیں۔ ہم کسی لڑکے کو گھوریں تو خیر ہے اور اگر وہ ہمیں دیکھے تو کمینہ اور خبیث ہوا۔ واہ“....

”تو اس میں شک کیا ہے، لڑکیاں ہی تو ہیں نا ہم۔“

”تو لڑکیوں کے لیے جو پردے کا حکم ہے پہلے اسے پورا کرو تا کہ کسی مرد کو کمینگی کا موقع نہ ملے ورنہ اس کے ساتھ کمینے پن میں آپ برابر کی شریک ہوں گی۔“

”شٹ اپ یار!....“ کہہ کر اسوہ اپنی قیمتی کار کی جانب بڑھ گئی جبکہ رباب پارکنگ ایریا کے دوسرے کونے میں موجود اپنی سوزکی کار کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”محترم!.... تم میں ذرا سی بھی عقل بھی نہیں ہے، وہ اسلم شکور خان کی بیٹی ہے۔ اسلم شکور خان کی۔ جو تم جیسوں کو ملازم بھی نہیں رکھے گا کجا بیٹی پکڑا دے۔ وہ بھی ایسی کہ جسے دیکھ کر حوریں بھی شرما جائیں۔“ مدثر نے اسے شرمندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اور کیوں نہ کرتا کہ اس کا گہرا دوست جو تھا۔ جواباً وہ خاموش ہی رہا تھا۔ اسے خاموش پا کر مدثر نے بات جاری رکھی....

”غضب خدا کا، یونیورسٹی بھر میں کتنی لڑکیاں ہیں۔ ایسی جو خوب صورت بھی ہیں اور خاندانی لحاظ سے تمھاری ہم پلّہ بھی۔ ان تمام سے صرف نظر کر کے تم براہ راست میڈم اسوہ اسلم شکور تک پہنچ گئے۔ کچھ خدا کا خوف کرو یار“!

اس مرتبہ بھی عمار خاموش رہا تھا۔

"اب منہ سے کچھ پھوٹو بھی۔"

"کیا کہوں، میں جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہا۔"

"یہ جانے ان جانے کی ڈفلی بجانے کے بجائے تم ہوش کے ناخن لو اور خود کو سنبھالو۔"

"سنبھالا ہی ہوا ہے نا، اور کسی کو دیکھنا جرم نہیں ہے کہ مجھے سزا ہو جائے گی۔"

"جانتے ہو اس کی وجہ سے تمھاری تعلیم کا کتنا حرج ہو رہا ہے۔ ایسے ہی چلتا رہا تو بڑی آسانی سے فیل ہو جاوگے۔ فیس پوری کرنے کے لیے تمھارے والد کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، کبھی اس بات کا اندازہ کیا ہے۔"

اس نے منہ بنایا۔ "ایسا بس تم ہی سوچتے ہو۔"

"میں نے حقیقت بیان کی ہے محترم۔" مدثر جھنجھلا گیا تھا۔

"یار! کسی کو چاہنا، پسند کرنا، اسے دیکھنا، ان سب کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی پڑھائی ہی سے غافل ہو جاوں گا۔ تم بے فکر رہو، ان شاء اللہ کلاس میں کسی کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔"

"اللہ کرے۔" مدثر نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کے چہرے پر پھیرے۔ اور عمار ہنس پڑا۔

☆☆☆

"منہ کیوں پھلایا ہوا ہے؟" خالی پیریڈ میں اسوہ جیسے ہی کلاس روم سے نکلی۔ دروازے کے ساتھ منتظر کھڑی رباب، آگے بڑھ کر اسے مخاطب ہوئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اسوہ نے کہا، مگر اس کے الفاظ اور لہجے میں واضح تضاد جھلک رہا تھا۔

"آج تم کلاس روم میں بھی میرے ساتھ نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھیں۔" رباب کے ہونٹوں پر شکوہ مچلا۔

"دیکھو رباب!.... تم میری سب سے قریبی سہیلی ہو۔ ایک ایسی دوست جسے میں بہن سمجھتی ہوں۔ تم اگر ایک انجان شخص کی طرف داری کرتے ہوئے مجھے لعن وطعن کرو گی تو کیا مجھے دکھ نہیں ہو گا۔"

"میں نے کب کسی کی طرف داری کی ہے میری بھولی شہزادی، اگر تمھارا اشارہ کل کی گفتگو کی طرف ہے تو وہ عمار کی طرف داری ہر گز نہیں تھی۔"

"رباب! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں اس سے بہت نفرت کرتی ہوں۔" اس نے حقارت سے ہونٹ سکیڑے۔

"کیا اس وجہ سے کہ میں غریب ہوں؟" انھیں اچانک اپنی پشت کی طرف سے عمار کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں حیران رہ گئی تھیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ جانے کب سے ان کے پیچھے چلتا ہوا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

اسوہ نے ایک دم اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے زہر اگلا۔ "نہیں.... بلکہ تم ہو ہی نفرت کے قابل۔"

"وجہ؟" اس کے لہجے میں شامل کرب اسوہ کے لیے حیران کن نہیں تھا۔

وہ اطمینان سے بولی "محبت اور نفرت کے لیے وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔"

"یہ بات صرف محبت کے بارے سنی تھی۔"

"ہاں، کچھ بے وقوف ایسا ہی سمجھتے ہیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

رباب حیرانی سے اسوہ کو دیکھ رہی تھی جو عمار کے استفسار پر آگ بگولا ہونے کے بجائے اسے خاطر خواہ جواب دے رہی تھی۔

"ہونہہ! معلومات میں اضافے کے لیے شکریہ عرض کرتا ہوں۔" کہہ کر عمار آگے بڑھ گیا۔

"بات سنو؟" اسوہ نے اسے پکارا۔

"جی۔" اس کے لہجے میں خوش گوار حیرت تھی۔

"گو تمھیں سمجھانے کے لیے مجھے زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں رباب کی خاطر تمھیں پہلی اور آخری بار متنبّہ کر رہی ہوں۔ اگر اس یونیورسٹی سے نکلنا نہیں چاہتے تو اپنی حرکتوں پر قابو رکھو۔ اور یقیناً تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ دھمکی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ رباب کا بازو تھام کر کیفے ٹیریا کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ عمار وہیں کھڑا مسکراتی نظروں سے انھیں گھورتا رہا۔

چند قدم لے کر اسوہ ایک بار پھر رکی اور پیچھے مڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"اور ہاں، اگر کسی دن محسوس کرو کہ تم معاشی لحاظ سے میرے ہم پلہ ہو گئے ہو، تب اپنے والدین کو میرے گھر رشتا لینے بھیج دینا۔ یقیناً پاپا کو اپنے برابر کے لوگوں کو ہاں کرنے میں تامّل نہیں ہو گا۔"

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ "اگر ایسی بات ہے تو آپ بھی سن لیں، میں شادی کروں گا تو آپ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔"

اسوہ زہر خند لہجے میں مسکرائی۔ "اور جب میری شادی کسی دوسرے کے ساتھ ہو جائے گی پھر؟"

"پھر بھی نہیں کروں گا۔" عمار مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

"کچھ لوگوں کو بھونڈے انداز اور بڑے بڑے دعووں سے اپنی محبت ظاہر کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے، مگر تھوڑا وقت گزرنے کے بعد وہ اپنے گزشتہ دعووں کے خلاف کر کے شرمندہ ہونے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔" طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اسوہ، رباب کو ساتھ لے کر کیفے ٹیریا کی طرف بڑھ گئی۔

اسوہ کی اس بات نے عمار کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب کر دی تھی۔ یوں جیسے کہ جنگل میں ناچتے مور کو اپنے پاوں نظر آ گئے ہوں۔

☆☆☆

"شکریہ اسوہ!...." آگے بڑھتے ہی رباب نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اسوہ مسکرائی۔ "شکریہ کس بات پر۔"

"تم نے اتنا مان دیا۔ میری خاطر اتنے تحمل سے عمار کو جواب دیا اور اسے جتلا بھی دیا کہ یہ سب تم نے میری وجہ سے کیا ہے۔"

"ہاں، تمھاری ہی وجہ سے کیا ہے۔ یہ پہلی اور آخری کوشش تھی۔اس کے بعد بھی اگر وہ کمینہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو دیکھنا میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔"

"دفع کرو یار!....اسے اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔"

"میری جان!....اہمیت تو اسے تم نے دلوائی ہے۔ورنہ اسوہ اسلم شکور خان اور ایسے تھرڈ کلاس لڑکوں کو گھاس ڈالے،ناممکن۔"

"چھوڑو اس موضوع کو۔"رباب نے دوبارہ اس موضوع سے پہلو تہی کرنا چاہی۔

"میں بس یہ کہہ رہی ہوں کہ اس کے بعد مجھے گلہ نہ کرنا۔"

"تم سے بڑھ کر میرے لیے کوئی اہم نہیں سمجھیں۔"کرسی پر بیٹھتے ہوئے رباب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اسوہ ناز سے بولی۔"ہونا بھی کسی کو نہیں چاہیے۔"

"تم اب تک کل کی گفتگو کو لیے بیٹھی ہو۔"

"صحیح کہا روبا!....تمھارا ایک تھرڈ کلاس لڑکے کی طرف داری کرنا میں کہاں برداشت کر سکتی ہوں۔"

"میری جان!....تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی ہو۔مجھے کیا ضرورت تھی کسی کی طرف داری کی۔اگر حق بات کہنا کسی کی طرف داری ہے تو پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"یعنی،اب بھی وہ حق پر ہے۔"اسوہ کا موڈ بگڑنے لگا۔

"اچھا سوری نا یار!اب دفع کرو اس موضوع کو۔"یہ کہہ کر رباب بیرے کو چائے کا بتانے لگی۔

"آج تو بہت خوش نظر آرہا ہے میرا بیٹا!" سکینہ نے روٹیوں کا چھابا اور سالن کی پلیٹ عمار کے سامنے رکھتے ہوئے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں ہے امی جان!" عمار کے ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ معدوم نہیں ہوئی تھی۔

"اللہ پاک کرے میرا لال ہمیشہ یونہی ہنستا مسکراتا رہے۔" سکینہ اس کے ماتھے پر بوسا دے کر سامنے بیٹھ گئی تھی۔ جب تک وہ کھانا کھاتا رہتا وہ اس کے سامنے بیٹھے اسے تکتی رہتی تھی۔ کھانا کھا کر وہ پاو□ ں پسار کر لیٹ گیا۔ جبکہ ماں برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی کہ اسے بیٹے کے لیے چائے بنانا تھی۔

جب تک وہ چائے تیار کرتی عمار کا والد دفتر سے واپس گیا تھا۔ وہ عمار کو چائے دے کر شوہر کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ بشیر صاحب بھی تازہ ہو کر بیٹے کے کمرے میں آ گیا تھا۔

اس چھوٹے سے گھر میں دو کمرے، ان کمروں کے سامنے برآمدہ اور ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ باورچی خانہ برآمدے کے ایک کونے ہی میں تھا۔ بیرونی دروازے کے ساتھ ایک جانب بیت الخلا اور غسل خانہ، جبکہ دوسری جانب عمار کے والد نے ایک دکان ڈالی ہوئی تھی۔ وہ چھوٹی سی کریانا کی دکان، نماز عصر سے رات آٹھ نو بجے تک کھلی رہتی۔ البتہ اتوار کے دن وہ دکان صبح دم کھل جاتی۔ دکان کاروبار کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ان کے لیے بیٹھک کی ضرورت کو بھی پورا کرتی تھی۔ دکان اور باتھ روم کے درمیانی خلا کے اوپر بھی گھاس پھونس کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ ایسے کہ درمیانی خلا نے چھپر نما سایادار جگہ کا روپ دھار لیا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر وہ خلا مرغیوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ گھر کا صحن بہت مختصر سا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں وہاں بہ مشکل تین چار پائیاں پہلو

بہ پہلو بچھائی جاسکتی تھیں۔وہ بھی اس طرح کہ چارپائیوں پر سونے والوں کو نیچے اترنے کے لیے پاو□ ں یا سرھانے کی جانب استعمال کرنا پڑتی۔ مگر وہ چھوٹا سا چار مرلے کا گھر بھی ان کے لیے کسی جنت سے کم نہیں تھا۔سکینہ خاتون صابر و شاکر عورت تھی اور پھر اس کا شوہر بشیر احمد بھی نہایت ملنسار، ہنس مکھ اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ اس کا سلوک بالکل کسی دوست کا سا تھا۔ دونوں آپس میں ہر قسم کی گفتگو کر لیتے تھے۔

"آرام ہو رہا ہے میاں۔"بشیر احمد دوسری چارپائی پر پھیل کر بیٹھتا ہوا مستفسر ہوا۔

"جی ابو"!

"آج تو بہت تھک گیا ہوں یار!"سکینہ خاتون کو کھانا لاتے دیکھ کر وہ چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"تومان لو نا، ابو جان!....اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔"عمار کا لہجہ بے تکلّفانہ ہونے کے باوجود ادب کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

"واہ جی واہ، پرسوں جب تم نے یہی بات کہی تھی کہ آج بہت تھکا ہوا ہوں، تب؟"

عمار ہنسا۔"بوڑھے اور جوان کی تھکاوٹ میں بھی فرق ہوتا ہے نا ابو جان۔مجھے تھکاوٹ تھی کام کی زیادتی کی وجہ سے اور آپ تھکے ہیں بوڑھاپے کی وجہ سے؟"

"ہا....ہا....ہا، یہ بھی خوب کہی۔ سن رہی ہو سکینہ بیگم !لڑکا جوان ہو گیا ہے اس لیے اس کی باتوں میں شوخی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے۔"

”توبہ جی!“عمار نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔”اب والد کے ساتھ گپ شپ کرنا بھی قابل گرفت ٹھہرا۔اور خدارا امی جان اب میری شادی کا ذکر لے کر نہ بیٹھ جانا۔“

”بس نکل گئی شوخی کے غبارے سے ہوا۔“بشیر معنی خیز ہنسی سے بولا۔”ویسے شادی کوئی اتنی بھی بھیانک چیز نہیں ہے یار“!

”شادی سے کون کم بخت ڈرتا ہے ابو جان،میں تو بیوی سے ڈرتا ہوں۔“

”ساری عورتیں تمھاری ماں کی طرح ڈراو نی تھوڑی ہوتی ہیں۔“

”میری ماں تو بہت پیاری ہے۔“عمار اپنے ساتھ چارپائی پر بیٹھی ماں کو بازوو ں کے گھیرے میں لیتا ہوا بولا ۔”شکر کریں،آپ کی قسمت اچھی تھی جو امی جان جیسی شریک حیات ملی۔“

”لو نئی سن لو۔“بشیر احمد ہنسا۔”وہ کیا کہتے ہیں؟”یک نہ شد دو شد“پہلے تمھاری ماں یہ راگ الاپتی رہتی تھی کہ میں اتنی سگھڑ ہوں،اتنی سگھڑ ہوں؟اب بیٹے کی طرف داریاں شروع ہو گئیں۔“

سکینہ خاتون مسکراتے ہوئے ان کی بحث سن رہی تھی،وہ شوہر اور بیٹے کی نوک جھوک میں عموماَ خاموش فریق کا کردار ادا کرتی۔

”ویسے ابو جان!ایمان سے بتائیں۔کیا امی جان جیسی دوسری آپ ڈھونڈ لیں گے؟“

”اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ میرا جواب نفی میں ہو گا؟“بشیر احمد ایک لحظے کے لیے رکا اور پھر منہ بناتے ہوئے بولا۔”تو یقیناً تمھارا خیال درست ہے۔“

اس کی بات پر عمار کے ساتھ سکینہ بھی ہنس پڑی تھی۔

"ویسے میاں! تم ہمیشہ اپنی شادی کی بات کو اسی طرح آئیں بائیں کر کے ٹال دیتے ہو۔ کہیں کوئی چکر تو نہیں چلا رکھا۔"

"ابو جان!.... آپ بھی نا بس؟"

"کیا میں بھی نا بس۔"

"خواتین کی موجودی میں ایسی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔"

بشیر احمد نے زور دار قہقہہ لگایا اور سکینہ خاتون نے جھینپ کر عمار کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔"اچھا اب میں امی جان سے خاتون ہو گئی۔"

"امی جان! آپ جتنی کوشش کر لیں یہ کان نہیں اکھڑ سکتا، پھر خود کو تھکانے کا فائدہ۔"

"بڑا بے شرم ہو گیا ہے یہ لڑکا۔" سکینہ خاتون، بشیر احمد کے سامنے دھرے کھانے کے برتن سمیٹنے لگی۔

"لو جی اب خوش ہو جائیں، ماں بیٹے میں جھگڑا کرا دیا ہے نا۔" سکینہ خاتون برتن اٹھا کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی، جب کہ بشیر احمد بھی چارپائی سے اٹھتا ہوا بولا۔

"میاں! میرا خیال ہے ٹرخانے کی کوئی کلاس ہی اٹینڈ کرتے رہتے ہو؟" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ عمار نے شادی کے مسئلے پر کبھی بھی سیدھے منہ گفتگو نہیں کرنا تھی۔ یوں بھی ابھی تک وہ پڑھ رہا تھا۔ پڑھائی کے بعد ہی اس نے کہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا اور پھر اس کے بعد بشیر احمد اصرار

کرتا ہوا بھی بھلا لگتا۔ ابھی تک تو اس کا تعلیمی سلسلہ جاری تھا، اور یہی وجہ تھی کہ سکینہ خاتون نے اس موضوع پر کبھی بھی اس کی طرف داری نہیں کی تھی۔

ماں باپ کے رخصت ہوتے ہی اسوہ چھلانگ لا کر اس کے خیالوں میں آدھمکی تھی۔

اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ابو جان! آپ کو کیا پتا، میں آپ سے زیادہ بے چین ہوں۔ مگر جس کے لیے بے چین ہوں شاید وہ میری قسمت میں نہیں ہے۔''

اس کے کانوں میں اسوہ کا نفرت انگیز لہجہ گونجا۔ ''میں اس سے بہت نفرت کرتی ہوں۔ کیونکہ تم ہو ہی نفرت کے قابل.... نفرت کے لیے وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا.... اگر یونیورسٹی سے نہیں نکلنا چاہتے تو........'' وہ اس کی گفتگو کو یاد کرنے لگا، کچھ بھی تھا آج وہ اسے مخاطب ہوئی تھی اور عمار کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی۔

☆☆☆

اسوہ کے سمجھانے کے باوجود عمار نے اپنی روش ترک نہیں کی تھی۔ چاہنے کے باوجود وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں اسوہ موجود ہو وہاں نہ جائے ورنہ دوسری صورت میں اسوہ کو دیکھنا اس کی مجبوری بن جاتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ دونوں ایک ہی کلاس میں تھے۔ کلاس سے باہر تو وہ کوشش کر کے دائیں بائیں ہو جاتا مگر کلاس روم میں مصیبت میں پڑا رہتا۔ اس دن بھی ایک اہم پیریڈ کے دوران اچانک پروفیسر ہاشم اسے مخاطب ہوا....

''مسٹر عمار!....یقیناً آپ کی توجہ سبق کی طرف نہیں ہے۔''

"نن.... نہیں سر؟" اچانک پکارے جانے پر وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اسی وقت اسوہ نے بھی تیز نظروں سے اسے گھورا۔ پروفیسر ہاشم کے پکارنے سے پہلے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"اچھا؟" پروفیسر نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "چلیں پھر میرے سوال کا جواب دے دیں۔"

"سس.... سوری سر میں آپ کا سوال نہیں سن سکا ہوں؟"

"بس یہ بتادو کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" پروفیسر ہاشم نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"چچ.... چار۔" اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"درست، بالکل بجا فرمایا۔ جو سٹوڈنٹ پڑھائی کے بجائے اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرے اس کا فیل ہونا دو اور دو چار کی طرح واضح اور ثابت شدہ ہے۔ پلیز، تشریف رکھیں۔ اور آنکھ کان میری طرف متوجہ رکھیں۔" پروفیسر کی بات نے سٹوڈنٹس کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اس کی اسوہ میں دل چسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔

عمار نادم ہو کر بیٹھ گیا۔ اور پھر جتنی دیر پروفیسر ہاشم کا پیریڈ جاری رہا اس نے اسوہ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

پروفیسر ہاشم کے کلاس روم سے نکلنے کی دیر تھی کہ اسوہ تیر کی طرح اس کی جانب بڑھی۔ اور پھر جب تک دوسرے طلبہ سمجھ پاتے کلاس روم "چٹاخ" کی زوردار آواز سے گونج اٹھا۔

"تمھاری اتنی جرأت۔" اسوہ پھنکاری۔

عمار کچھ کہنے کے بجائے بس اس کے چہرے پر پھیلی نفرت کو گھورتا رہا۔اس عالم میں بھی وہ اسے اچھی ہی لگ رہی تھی۔

اسے خاموش پاکر اسوہ کا ہاتھ دوبارہ اٹھا مگر اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ عمار کے چہرے تک پہنچ پاتا۔اسماء نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"محترمہ!.... آپ ہوش میں ہیں؟" اسماء کے لہجے میں شامل غصہ تمام کے لیے حیران کن تھا۔

"تم کون ہوتی ہو میرا ہاتھ پکڑنے والی، چھوڑو میرا ہاتھ۔" اسوہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔اس اثنا میں باقی کلاس فیلوز بھی ان کے نزدیک جمع ہو گئے تھے۔

"اور تم کون ہوتی ہو عمار پر ہاتھ اٹھانے والی۔" اسمائ ءترکی بہ ترکی بولی تھی۔

رباب نے آگے بڑھ کر اسوہ کو تھام لیا۔

"پلیز اسوہ آرام سے.... کیا ہو گیا ہے تمھیں۔"

مگر وہ رباب کو جواب دیے بغیر اسماء کی طرف متوجہ رہی۔"اگر اتنی تکلیف ہوئی ہے، تو اسے باندھ کر رکھو۔یوں پرائی لڑکیوں کو گھورنا نہایت گندی اور غلیظ حرکت ہے۔اس کی وجہ سے پروفیسر ہاشم نے جانے میرے بارے کیا تاثّر لیا ہو گا۔"

"تم ہو نا نیک پروین؟میں جانتی ہوں تم جیسی امیر زادیوں کے لچھن۔" اسماءء بہت زیادہ تپی ہوئی تھی۔

"بتاو□ ز، تم نے مجھ میں کون سی غلط بات دیکھی ہے؟" اسوہ جارحانہ انداز میں اسماء کی طرف بڑھی۔

”نہیں اسوہ!“ رباب نے بے ساختہ اس کے بازو کو تھام لیا۔

”تم آو□ ؤ قریب۔“ اسمائء بھی بپھر گئی تھی۔

”پلیز اسماء بہن!“ عمار نے اسماء کا ہاتھ تھامتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ ”غلطی میری تھی۔ یہ جو کہتی ہے اسے کہنے دیں۔“

”کیا گنواروں کی طرح لڑ رہے ہو یار!“ زوہیب جو کہ طلبہ کی ایک یونین کا صدر تھا۔ اونچی آواز میں بولا۔ ”ماسٹر کرنے والے طلبہ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے تو رونا آرہا ہے۔ اور مس اسوہ!.... پلیز، عمار نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ یوں بپھر جائیں۔“

”میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں مسٹر!“ اسوہ زوہیب کی طرف متوجہ ہو کر سخت لہجے میں بولی اور پھر اسماء کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مس لیلیٰ! تم دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کلاس روم سے نکلتی چلی گئی۔ باقی طلبہ بھی آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگ گئے تھے۔ یوں بھی چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔

عمار سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ مدثر اس کے قریب آکر آہستہ سے بولا۔

”چلو چائے پیتے ہیں۔“

”نہیں تم جاو، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”جب کہا تھا کہ خود پر قابو رکھا کرو۔“ مدثر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

"آپ کو اس کا ہاتھ پکڑ لینا چاہیے تھا۔" اسماء جو اب تک وہیں کھڑی تھی اسے مخاطب ہوئی۔ "نواب زادی ہو گی تو اپنے گھر میں ہو گی۔"

"اسماء بہن!.... وہ حق بہ جانب تھی، کیونکہ میری وجہ سے اسے خفت اٹھانا پڑی۔"

بہن کے لفظ پر اسماء کے چہرے پر ناپسندیدگی کے اثرات نمودار ہوئے مگر عمار اس کی جانب دیکھ ہی نہیں رہا تھا کہ اسے معلوم پڑتا۔ یا شاید وہ جان بوجھ کے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اسماء نے منہ بنایا۔ "نہیں، بس آپ ہی کو دل پر اختیار نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ بھی باہر کی جانب چل دی۔

"اچھا! اب اٹھو نا، کہ یہیں بیٹھے رہو گے؟"

"مجھے تھوڑی دیر اکیلا چھوڑ سکتے ہو؟" عمار نے مدثر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" مدثر اس کی ذہنی حالت سے واقف تھا، اس لیے مزید بحث کیے بغیر اٹھ گیا۔

عمار نے آنکھیں بند کر لیں، اس کی نگاہوں میں اسوہ کا لال بھبوکا چہرہ لہرانے لگا، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اسوہ کی آنکھوں میں اس کے لیے اتنی نفرت ہو گی۔

کلاس روم سے نکل کر اسوہ پارکنگ کی جانب چل پڑی تھی۔ رباب اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ پارکنگ میں جا کر وہ جونھی رکی رباب نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

"اسوہ! بہت افسوس ہوا یار، یہ کوئی طریقہ ہے؟"

”شٹ اپ رباب!“ وہ سخت غصے میں تھی۔”ایک کمینے کی وجہ سے میری کتنی توہین ہوئی اور تم مجھے اخلاق سکھا رہی ہو۔“

”جاؤ بھاڑ میں۔جو مرضی آئے کرو۔“ یہ کہہ کر رباب پاؤں پٹختی ہوئی اپنی کار کی جانب بڑھ گئی۔ جبکہ اسوہ اپنے والد کا نمبر ڈایل کرنے لگی۔

”جی پاپا کی جان!“اس کے والد نے پہلی بیل ہی پر کال رسیو کر لی تھی۔

”پاپا!....ایک لڑکے نے میری بہت زیادہ توہین کی ہے۔“

”کیا.... کون ہے وہ بدبخت ؟“اسلم شکور خان کی آواز میں شامل غصہ اس بات کا مظہر تھا کہ اسے اپنی اکلوتی بیٹی کتنی عزیز ہے۔

”عمار نام ہے۔ایک کلرک کا بیٹا ہے۔“

”اس وقت کہاں ملے گا؟“

وہ جلدی سے بولی۔”ابھی تک یونیورسٹی ہی یں ہے۔“

”اوکے تم وہیں رہو۔اگر کہیں جاتا ہے تو مجھے مطلع کرنا۔“

”جی پاپا۔“کہہ کر وہ اپنی کار میں بیٹھ گئی۔

دو تین منٹ بعد اس کے والد کی کال آنے لگی۔

”جی پاپا!“اس نے اٹینڈنگ بٹن پریس کیا۔

"گڑیا! میں نے متعلقہ تھانے دار کو فون کر دیا ہے وہ ابھی آکر تمھیں ملے گا۔ اس بدبخت کی شناخت اسے کرا دینا اور پھر تماشا دیکھنا۔"

اس نے کہا۔ "میں منتظر ہوں پاپا"!

بہ مشکل آدھا گھنٹا گزرا ہو گا کہ اسے ایک انجان نمبر سے کال آنے لگی۔

"یس۔" اس نے کال رسیو کی۔

"میڈم!.... میں انسپکٹر راحیل بات کر رہا ہوں۔ ہم یونیورسٹی کے گیٹ پر ہیں۔ آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"میں پارکنگ میں ہوں۔ کریم کلر کی ٹویٹا میں بیٹھی ہوں۔"

"ٹھیک ہے میڈم ہم آ گئے۔" انسپکٹر نے مودّبانہ لہجے میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ چند لمحوں بعد پولیس کی گاڑی پارکنگ میں آ گئی تھی۔ وہ اپنی کار سے باہر نکلی۔

"اسلام علیکم میڈم!" انسپکٹر کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اسلم شکور خان کی حیثیت اور پہنچ سے اچھی طرح واقف ہے۔

"انسپکٹر صاحب!.... وہ اب تک کلاس روم سے باہر نہیں نکلا۔"

"کیا آپ کلاس روم تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں۔"

"کیوں نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔" اسوہ ان کے ساتھ ہولی۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر اسماء کا غصے میں تمتماتا چہرہ گھوم رہا تھا۔ عمار کو کو چھینٹی لگوا کر وہ اسماء کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے اسماء کا عمار کی طرف داری کرنا بہت زیادہ برا لگا تھا۔

انسپکٹر کے ساتھ چار سپاہی موجود تھے وہ اسوہ کی معیت میں کلاس روم کی طرف بڑھ گئے۔ چاروں سپاہیوں نے یوں رائفلیں تانی ہوئی تھیں گویا کسی دہشت گرد کا مقابلا کرنے جا رہے ہوں۔

وہ کلاس روم میں داخل ہوئے۔ ان کی پاو□ ں کی آہٹ پا کر عمار نے آنکھیں کھول دیں۔ اسوہ کے ساتھ پولیس والوں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔

"یہی ہے۔" انسپکٹر مستفسر ہوا اور اسوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پکڑلو اسے۔" انسپکٹر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے چیل کی طرح جھپٹ کر عمار کو دونوں بازوؤں سے جکڑ لیا۔

"کک.... یہ کیا انسپکٹر صاحب؟" عمار ششدر رہ گیا تھا۔

"یہ تو تمھیں تھانے چل کر پتا چلے گا بچو کہ شریف لڑکیوں کو کیسے چھیڑا جاتا ہے اور یونیورسٹی میں بد معاشی کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟"

وہ ہکلایا "آ.... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"کیوں یہ میڈم صاحب جھوٹ کہہ رہی ہیں۔" انسپکٹر نے ہاتھ میں پکڑی اسٹک اس کے پیٹ میں چبھوئی۔

عمار نے استفہامیہ نظروں سے اسوہ کو دیکھا وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔

"میں نے منع کیا تھا نا۔" وہ نخوت بھرے لہجے میں بولی۔ "مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے مان جائیں تو پھر انھیں بھوت کون کہے۔"

عمار اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک گر سکتی تھی۔

"لے جاؤ اسے۔" انسپکٹر درشت لہجے میں بولا اور سپاہی اسے لے کر دروازے کی جانب چل پڑے۔

وہ کلاس روم سے باہر نکلے عمار کو یہ اطمینان تھا کہ اس کے کلاس فیلوز یونیورسٹی سے جا چکے تھے۔ اگر پولیس ان سب کے سامنے اسے پکڑتی تو یقینا اس کی زیادہ سبکی ہوتی۔ وہ اسوہ کا تھپڑ کھا کر اتنا دل گرفتہ ہوا تھا کہ کلاس روم سے اٹھ ہی نہیں سکا تھا۔ اسے کیا پتا تھا اسوہ اس کے لیے دل میں اتنی نفرت رکھتی ہے۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔

پارکنگ میں جا کر سپاہیوں نے اسے دھکا دے کر جیپ میں بٹھا دیا۔ کلاس روم سے پارکنگ تک بھی وہ اسے کسی تھرڈ کلاس مجرم کی طرح کھینچتے ہوئے لائے تھے۔ یوں بھی غریب شرفا کی ہتک پاکستانی پولیس مثالی انداز میں کرتی ہے۔ مرے ہوو□ ئں کو مارنا اور گرے ہوو□ ئں کو زندہ در گور کرنا پولیس کی فطرت ثانیہ ہے۔

"انسپکٹر صاحب!" اسوہ نے پولیس والوں کو جانے پر تیار دیکھ کر آواز دی۔

"جی میڈم!" وہ مستعدی سے جیپ سے نیچے اترا۔

"اسے لے کر میرے پیچھے پیچھے آو□ ئ۔"

"جی بہتر۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔

وہ تفاخر سے اپنی کار کی جانب بڑھی۔ ڈرائیور نے ادب سے دروازہ کھولا اور وہ عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے اپنی جگہ پر بیٹھ کر کار آگے بڑھا دی۔ پولیس کی جیپ ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ اسلم شکور خان کی وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے پہنچے۔ چوکیدار نے اسوہ کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ پولیس کی گاڑی بھی اس کی کار کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔

دو ایکڑ کے رقبے پر پھیلی وہ وسیع و عریض کوٹھی کسی محل سے کم نہیں تھی۔ داخلی گیٹ سے اندرونی عمارت تک سرخ بجری کی ایک چوڑی روش تھی جس کے جوانب میں درانٹا کی خوب صورت باڑ لگی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں اسٹر یلین گھاس کے چوڑے مخملی قطعات، ذوقِ بصارت کو دعوتِ نظارا دے رہے تھے۔ کوٹھی کی دیواروں کے ساتھ بوتل پام، کھجور پام اور کنگھی پام کے درخت ایک ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ مخملی قطعات میں وقفے وقفے پر سرو کے درخت، مور پنکھ اور ایرو کیریا کے بوٹے لگے ہوئے تھے۔ مور پنکھ کی تراش خراش بڑی مہارت سے کی گئی تھی۔ ہر درخت کے تنے کے ساتھ پھولوں کی گول کیاری بنی ہوئی تھی جو موسمی پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ گھاس کے قطعات کے تین اطراف میں بھی پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اندرونی عمارت ہلکے گلابی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔

اسوہ کے اشارے پر ڈرائیور نے کار روکی اور اور پھر جلدی سے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ کرّو فر سے نیچے اتری۔ انسپکٹر بھی جیپ روک کر نیچے اترا۔

اسوہ ڈرائیور کو کار گیراج میں لے جانے کا اشارہ کر کے انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اسے نیچے اتارو۔“

”چل بے!“ سپاہیوں نے اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے اتارا۔

عمار خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ اس کے چہرے پر ڈر، خوف یا گھبراہٹ کا کوئی اثر نظر نہیں آرہا تھا۔

”اب بلاؤ □ ;اپنی اسماء بی بی کو کہ تمھیں چھڑا کر لے جائے۔“ وہ اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولی

۔

عمار نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

"اس دن میں نے تمھیں متنبہ کیا تھا کہ جب تک میرے ہم پلہ نہیں ہو جاتے اس عشق وغیرہ سے باز آ جاو□ ۔ نظر آرہی ہے میری کوٹھی؟ہو رہا ہے کچھ اندازہ کہ اسوہ اسلم شکور خان کس بلا کا نام ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے ایک کلاس میں پڑھنے کی وجہ سے ہم دونوں برابر ہو گئے ہیں۔ احمق انسان میرے لباس اور جوتوں کی قیمت سے تمھاری کلاس کے لوگوں کا سالانہ بجٹ تیار ہو سکتا ہے اور تم مجھے اپنی گھٹیا محبت سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ منع نہیں کیا تھا کہ اپنی حیثیت پہچانو۔" اس کا گریبان چھوڑتے ہوئے اسوہ نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ "میرے نزدیک، تمھاری حیثیت سڑک پر پھرنے والے کتے کے آوارہ پلّے سے زیادہ نہیں ہے ۔گھٹیا نسل کے پیچ انسان! تمھیں میرے نرمی سے سمجھانے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا کیوں؟"

عمار خاموشی سے اسے گھورتا رہا، اس کی آنکھوں میں کسی جذبے کی جھلک نظر نہیں آرہی تھی۔

"نیچے دیکھو۔" غصے سے بپھرتے ہوئے اسوہ نے اسے ایک اور تھپڑ رسید کیا۔

عمار نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

"آیندہ اگر مجھے فلمی محبت دکھانے کی کوشش کی تو آنکھیں نکال کر چیل کوّوں کو ڈال دوں گی۔ بڑا آیا مجنوں کی اولاد۔ تھانے جا کر تمھارے سر سے محبت کا بھوت اچھی طرح اتر جاتا مگر مجھے تمھاری ماں پر ترس آرہا ہے۔ اور یاد رکھنا ہمیشہ یہ ترس نہیں آئے گا۔ بڑا آیا شادی کرنے والا۔" یہ کہہ کر وہ انسپکٹر کی جانب مڑی۔

"انسپکٹر صاحب! اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال باہر کرو۔ اور ہاں خود کھانا کھا کر جانا۔"

"جی میڈم!" کہہ کر انسپکٹر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ عمار کو دھکے دیتے ہوئے گیٹ کی طرف لے چلے۔

یقیناوہ اس کی زیادہ سے زیادہ توہین اسی لیے کر رہی تھی کہ وہ اس کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔

گیٹ تک وہ سر جھکائے چلتا رہا۔اس کے احساسات عجیب قسم کے ہو رہے تھے جن کی توجیہ سے وہ قاصر تھا ۔اتنی توہین اور ہتک کے بعد انسان کچھ بہتر سوچنے کے قابل نہیں رہتا مگر اس پر بہت سے اسرار منکشف ہو رہے تھے۔دنیا میں عزت سے جینے کے لیے دولت کی ضرورت ہر چیز سے بڑھ کر تھی۔بلکہ پیار محبت بھی دولت کے مرہونِ منت ہی نظر آرہا تھا۔اس سے پہلے رباب، مدثر اور پھر آج اسوہ کی گفتگو کا لب لباب ان دونوں کے درمیان پائی جانے والی معاشی خلیج ہی تھی۔وہ اسوہ کی ضروریات کا کفیل نہیں ہو سکتا تھا، کہ اس کے پاس دولت نہیں تھی۔اس کی شکل وصورت، کردار قابلیت ساری کی ساری دولت کے سامنے ہیچ ہو گئی تھی ۔تھانے دار اسے غیر قانونی طور پر یونیورسٹی سے اٹھا کر تھانے کے بجائے اسلم شکور خان کی کوٹھی میں لے آیا تھا ،کیونکہ اسوہ دولت مند تھی اور وہ غریب تھا۔

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔اسے باہر نکالنے کے لیے چوکیدار نے ذیلی کھڑکی کھولی باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔

اسوہ کمر پر ہاتھ رکھے وہیں کھڑی تھی۔عمار کی آخری نظر میں جانے کیا بات تھی کہ وہ نظر چرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔اس کے ساتھ اسے محسوس ہوا کہ کچھ غلط ہونے جارہا ہے۔دل میں ایک جذبے نے سر ابھارا کہ اسے روک لینا چاہیے۔توہین کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔مگر پھر وہ بروقت فیصلہ نہ کر پائی اور وہ باہر نکل گیا۔

اسے باہر نکال کر پولیس والے فخریہ انداز میں واپس لوٹے۔

"انسپکٹر صاحب تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی وجہ سے ایک شہدے کو میں نے اچھی طرح نصیحت کر دی ہے۔"

"میڈم! ہم تو اسلم صاحب کے ادنا سے خادم ہیں۔ یہ لفنگا تو آپ کی رحم دلی کی وجہ سے بچ گیا ورنہ آپ دیکھتیں کہ یہ کس طرح زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے گڑگڑاتا ہے۔"

"اچھا یوں ہے کہ آپ کو اصل انعام تو پاپا ہی دیں گے۔ میری طرف سے یہ رکھ لو کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھالینا۔" اسوہ نے پرس میں موجود ساری رقم ان کی جانب بڑھادی۔

"اس کی ضرورت تو نہیں تھی میڈم صاحب!.... مگر آپ کی عنایت کو ٹھکرانا بھی بے ادبی ہو گی۔" انسپکٹر اس کے ہاتھوں سے رقم کو جھپٹتا ہوا بولا۔ اسوہ کی نظر میں ادنا سی رقم بھی اتنی خطیر تھی کہ انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

"او کے، اب آپ کو اجازت ہے۔" سپاہیوں کی حالت دیکھ کر وہ متکبرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے مڑ گئی۔

انسپکٹر نے باقاعدہ ایڑیاں بجا کر اسے سیلوٹ کیا اور جیپ میں بیٹھ کر واپسی کی راہ لی۔ ابھی تک اسلم شکور خان کی بخشش بقایا تھی۔ جب بیٹی نے صرف کھانے کے لیے اتنی خطیر رقم انھیں عنایت کی تھی تو باپ کا انعام جانے کتنا ہوتا؟ انسپکٹر دل ہی دل میں اپنی مستعدی کو سراہنے لگا کہ، اسلم شکور خان کی طرف سے کال موصول ہوتے ہی اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔

اگر اس مستعدی سے ہماری پولیس اصل مجرم کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوتی تو یقیناً پاکستان میں جرم کا نام نشان نہ ہوتا۔

گھر داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنا حلیہ ٹھیک کر لیا تھا۔ ظاہری طور پر اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا مگر اس کے دل کے اتنے ٹکڑے ہوئے تھے کہ کرچیاں سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

محبت ہو چکی پوری

چلو اب زخم گنتے ہیں

اس کی ماں باورچی خانے میں تھی، جلدی سے کمرے میں گھس کر اس نے قمیص اتاری اور تولیا کندھے پر ڈال کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ قمیص کے سامنے کے سارے بٹن ٹوٹ گئے تھے اور وہ ماں کے سوالات کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹا!.... آج دیر کر دی؟ کھانا گرم کر دوں؟" اسے غسل خانے کا رخ کرتے دیکھ کر ماں نے باورچی خانے سے آواز دی۔

"کھانا کھا کے آیا ہوں ماں!.... آپ بس اچھی سی چائے پلا دیں۔ میں ذرا نہا لوں۔" اسے ذرا سی بھی بھوک نہیں تھی۔

وہ نہا کر باہر نکلا تو ماں اسے چائے کے برتنوں کے ساتھ اپنے کمرے میں ملی اور اس کی بدقسمتی کہ اس کی اتاری ہوئی قمیص ماں کے ہاتھ میں تھی۔

"بیٹا! یہ بٹن کیسے ٹوٹے کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟" اس کے لہجے میں ہزاروں اندیشے پنہاں تھے۔

"نہیں ماں!" اس نے جلدی سے بات بنائی۔ "یہ مدثر کی مہربانی سے ٹوٹے ہیں۔"

"بھلا وہ کیسے؟"

"آج ہم دونوں نے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں بل کی ادائی کے لیے کاو□ ٔ نٹر کی طرف بڑھا اور اس نے مجھے روکنا چاہا کہ کھانے کی دعوت اس نے دی تھی اور بل بھی وہی دے گا۔ پس کھینچا تانی میں اس کا ہاتھ میرے گریباں پر پڑ گیا اور بٹن گئے۔"

"تم دونوں کا بھی بچپنا نہیں گیا۔" وہ شفقت سے مسکرائی۔

"ماں جی!.... ابو جان نظر نہیں آرہے۔"

"معلوم ہے نا، وہ اس وقت آرام کرتے ہیں۔ تمھارا پوچھ رہے تھے، میں نے بتا دیا کہ کہیں آوارہ گردی کرنے نکل گیا ہو گا۔"

"بیٹے کے کرتوتوں پر کبھی پردہ نہ ڈالنا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ اس کی ماں ہنس پڑی تھی۔

چائے پی کر وہ بستر پر لیٹ گیا جبکہ اس کی ماں برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کی سوچوں میں اسوہ آدھمکی تھی۔ اس کی مترنم آواز میں آج دکھ دینے والی حقارت اور نفرت ابل رہی تھی وہ اس کی گفتگو پر غور کرنے لگا۔

"سڑک پر آوارہ گھومنے والا کتے کا پلّا۔ ہونہہ!.... بغیر دولت کے میری یہ حیثیت ہے۔ کوئی بات نہیں مس اسوہ اسلم شکور خان....

جتنی بھی مجھ پہ قرض ہیں سب سود کے سمیت

واپس کروں گا میں تمھیں تیری حقارتیں

"میں تمھیں دولت مند ہو کر دکھاوں گا۔ اتنا کہ تمھارے ساتھ دست درازی کرنے پر بھی پولیس مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ چاہے تم اس وقت جس کی بھی بیوی ہوئیں؟ میں تمھیں معاف نہیں کروں گا۔ یاد رکھنا اسوہ!.... تم نے بہت برا کیا، تم نے میرا ہی نہیں میری محبت کا بھی اپمان کیا ہے۔ دھن کی کثرت نے تم سے لطیف جذبات کا احساس ہی چھین لیا۔ ایک غریب کی محبت اتنی ارزاں ہو گئی کہ اسے کتے سے تشبیہ دے ڈالی؟" وہ سوچتا رہا ،خود سے عہد کرتا رہا اور دولت مند ہونے کے منصوبے بناتا رہا۔

☆☆☆

"خفا ہو؟" اسوہ نے رباب کے سامنے نشست سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

رباب خاموش رہی تھی۔

"اب ایسی بھی کیا بے مروتی یار!" اسوہ دوبارہ اس کو مخاطب ہوئی۔

"کل تم نے اچھا نہیں کیا۔" رباب سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئی۔"اس کی غلطی اتنی نہیں تھی کہ جتنی تم نے اس کی توہین کی؟"

وہ ڈھٹائی سے بولی۔ ”ایسا کیا کر دیا میں نے بھئی؟“

”پوری کلاس کے سامنے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دینا کہاں کی شرافت ہے؟“

”ایسے لوگ شرافت کی زبان سمجھتے کب ہیں؟“ اسوہ نے منہ بنایا۔

”بہ ہر حال، اس بارے میں تم سے اتفاق نہیں کروں گی۔“

”کرنا پڑے گا جی!.... آج دیکھنا اگر تمھارے عمار بھائی نے میری طرف دیکھ لیا تو جو جرمانہ کہو گی ادا کروں گی ۔ معلوم ہے آج کلاس روم میں اس نے آنکھ اٹھا کر بھی میری جانب نہیں دیکھا۔“

”غیرت کا تقاضا تو یہی ہے کہ اسے تمھاری طرف بالکل نہیں دیکھنا چاہیے، لیکن وہ جس مرض میں مبتلا ہے مشکل ہے کہ اپنی اس حرکت سے باز آ سکے۔ کلاس روم میں تو شاید وہ خود پر قابو پا لے گا مگر کیفے ٹیریا میں اس کی نظروں کی آوارگی کو روکنا شاید ممکن نہ ہو۔“

”تو پھر لگ گئی شرط؟“ اسوہ نے چیلنج کرتے ہوئے پوچھا۔

”لگ گئی۔“ رباب نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔

”جیتنے والا کوئی بھی ایک بات منوا سکتا ہے۔“ اسوہ نے شرط پیش کی۔

”منظور ہے، مگر یاد رکھنا ہارنے کی صورت میں، میں تمھیں مکرنے نہیں دوں گی۔“

”یہ تو پتا چلے گا نا، ہارتا کون ہے۔“ اسوہ کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ اور پھر ان کی اسی گفتگو کے دوران عمار، مدثر کے ہمراہ کینٹین کے ہال میں داخل ہوا۔

"لیں جی!.... تیار ہو جاؤ، عاشق نامراد پہنچ گیا۔" اسوہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

اندر داخل ہوتے وقت دروازے کے قریب کھڑے ہو کر دونوں دوستوں نے کنٹین کے ہال میں ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ ہال میں دو ٹیبل ہی خالی پڑے تھے۔ ایک اسوہ اور رباب کی ٹیبل کے بالکل متصل تھا۔ جب کہ دوسرا، ان کی ٹیبل سے دو ٹیبل چھوڑ کر پڑا تھا۔ ہر ٹیبل کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے دو کرسیاں ایسی تھیں کہ ان پر بیٹھ کر براہ راست اسوہ کا دیدار کیا جا سکتا تھا اور رباب کو یقین تھا کہ عمار نے انھی دو کرسیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔

اسوہ کی سوچیں اس سے برعکس تھیں۔ اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر عمار کی آخری نگاہ لہرانے لگتی۔ جانے کیوں اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ عمار کی آخری نگاہ تھی۔

دونوں دوست جیسے ہی ٹیبل کے نزدیک پہنچے، وہ کن انکھیوں سے ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اچانک اسوہ کے دل میں شدت سے ہار جانے کی تمنا بیدار ہوئی۔ وہ خود حیران ہو گئی تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ وہ توجیہ سے قاصر تھی۔ مگر اس کے چاہنے کے برعکس عمار ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ رباب کی حیرانی کی انتہا نہ رہی تھی۔ اسوہ کو یوں لگا جیسے کوئی چیز چھناکے سے اس کے اندر ٹوٹ گئی ہو۔

"اسوہ! تم جیت گئیں یار!" رباب مایوسی سے بولی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عمار اتنی آسانی سے اپنے وظیفے سے باز آ جائے گا۔

"میں نے کہا تھا نا۔" اسوہ پھیکے لہجے میں بولی۔ جیتنے کے باوجود مایوسی کی ہلکی سی لہر نے اس کے دل کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔

رباب نے کہا۔ ”اچھا جناب! اب اپنی خواہش بتاؤ تا کہ ماہدولت اسے پورا کر سکے۔“

”ایسا ہے کہ....“ اسوہ یہ کہہ کر چند لمحے سوچ میں ڈوبی رہی اور پھر بولی۔ ”آج بل کی ادائی تم کرو گی۔“

”بس؟“ رباب کے لہجے میں خوشگوار حیرت تھی۔

اسوہ نے کہا ”تمھیں ہرا دیا، یہ خوشی ہی کافی ہے۔“ یہ الگ بات کہ اس کے لہجے سے بالکل بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خوش ہے۔

رباب ہنسی۔ ”اگر میں جیتی ہوتی تو ایسی شرط منواتی کہ تمھاری طبیعت صاف ہو جاتی۔“

”اچھا، میں بھی سنوں۔“

”سچ بتاؤ ں، تو میں نے تمھیں یہ کہنا تھا کہ عمار کے حال پر رحم کرو، اگر زیادہ نہیں تو اسے خود کو دیکھنے سے تو منع نہ کرو۔ کیا تم یہ شرط مان جاتیں؟“

”کیا پتا، ویسے شرط تو شرط ہوتی ہے۔“ اسوہ مبہم لہجے میں بولی۔

”اچھا چھوڑو یار! اس کی اپنی قسمت۔ کہتے ہیں کہ ثابت قدمی کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے اور عمار ثابت قدم نہیں رہ پایا۔“

اسوہ نے اس کی بات پر کوئی ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے مشورہ دیا۔ ”چلنا چاہیے؟“

”میں تھوڑی دیر بیٹھوں گی۔“

اور رباب کے جواب پر اسوہ سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔نہ جانے کیوں عمار کے اس طرح بیٹھنے پر اسے توہین کے شدید احساس نے گھیر لیا تھا۔

ہال سے نکلنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر ایسا رستا اختیار کیا کہ عمار کی نگاہ فوراًاس پر پڑ سکے۔دروازے کے قریب جا کر اس نے اچانک مڑ کر دیکھا۔اسے امید تھی کہ عمار اسے گھور رہا ہو گا، مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے اسے اسماء نظر آئی۔وہ سنگی بینچ پر بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔اپنا غصہ ہلکا کرنے کے لیے وہ اسماء کی جانب بڑھ گئی۔اس کے قدموں کی چاپ پر اسماء نے کتاب سے نظریں اوپر اٹھائیں۔اور اس کے چہرے پر نفرت بھرے تاثرات پھیل گئے تھے۔وہ ان تاثرات کو خاطر لائے بغیر شوخ لہجے گویا ہوئی۔

"ہیلو اسماء عمار صاحب!....کیسی ہو؟"

اس کی بات پر بجائے غصے میں پھٹ پڑنے کے اسماء کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تمھارے منہ میں گھی شکر جی!کاش ایسا ہو جائے۔"

جواب سن کر وہ سر تا پا سلگ اٹھی۔اسے غصہ دلانے کے لیے وہ غیر مہذّبانہ لہجے میں بولی۔

"اپنے یار کا حال بھی پوچھ لینا تھا، کہ کل اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔"

”مس اسوہ!.... یہ جو تم مجھے بار بار عمار کے حوالے سے مخاطب کر رہی ہو نا، بہ خدا بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اللہ پاک تمھاری زبان مبارک کرے۔“

”کل تم نے میرا ہاتھ پکڑا تھا، اس کی جزا میں مسٹر عمار کو جو مار پڑی اس نے جناب کے اندر پائے جانے والے عشق و محبت کے سارے جراثیم کا خاتمہ کر دیا ہے۔“

”تم نے بہت برا کیا.... لیکن اس کا اتنا اچھا نتیجہ نکلا کہ اس کے مقابل تمھاری ساری برائی ہیچ ہے۔ ایک بار پھر شکریہ مس اسوہ!.... میں سوچ سوچ کر تھک گئی تھی کہ کس طرح عمار کے دل سے تمھاری محبت ختم کروں۔ مگر نہ تو کوئی تجویز سوجھ رہی تھی اور نہ اسے میری محبت کی قدر آ رہی تھی۔ اگر تمھاری بات درست ہے تو، امید ہے اب وہ میری طرف لوٹ آئے گا۔ میں تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں اتار سکتی۔ یوں بھی تم دونوں کا ملاپ ناممکن تھا۔ وہ ایک سفید پوش خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور تم ٹھہریں نواب زادی۔“

اسماء کے لہجے میں طنز سے زیادہ حقائق کے اظہار کی جھلک تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کی باتیں اسوہ کو بہت بری لگی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ اسماء کو خوش خبری سنانے آئی تھی کہ....

”محترمہ! اب عمار تمھارا ہوا۔“

اور دیکھا جاتا تو عمار کو پھینٹی لگوانے کا مقصد بھی یہی تھا، کہ وہ اسوہ کی جان چھوڑ دے۔ اور اسوہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد لامحالہ وہ اسماء کی جانب متوجہ ہو جاتا۔ کہ اسماء کا شمار بھی خوب صورت اور پرکشش لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اور پھر وہ اسے چاہتی بھی تھی۔

اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”تو میرے نواب زادی ہونے میں شک ہی کیا ہے؟“

”شک کس کم بخت کو ہے۔ بس درخواست ہے کہ اب بھی اگر عمار نہ سدھرا، تو تم نے ایک بار پھر اسے ہلکی سی چھینٹی لگوا دینی ہے۔ تمھارا تعاون ہمیشہ یاد رہے گا۔“

وہ پاو□ ں پٹختی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اسماء بھی لبوں پر مسکراہٹ سجائے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”اللہ پاک تمھاری زبان مبارک کرے، تمھارے منہ میں گھی شکر“ ....

وہ اپنی خواب گاہ میں تھی۔ بڑے حجم کے گول بیڈ پر لیٹے ہوئے اس کے دماغ میں اسماء کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ اسے غصہ دلانے گئی تھی مگر اسماء بجائے غضب ناک ہونے کے اس کی ممنون و احسان مند ہو رہی تھی

۔

”یوں بھی تم دونوں کا ملاپ ناممکن تھا.... وہ ایک سفید پوش خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور تم ٹھہریں نواب زادی.... تمھارا تعاون ہمیشہ یاد رہے گا“ ....

”بے شرم.... تعاون یاد رہے گا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ”تھرڈ کلاس خاندان کی پینچ لڑکی۔ تمھیں عمار کیوں گھاس ڈالے گا۔“

”مگر میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں، عمار اسے گھاس ڈالے یا نہ ڈالے میری بلا سے۔ جائیں بھاڑ میں دونوں۔“ وہ کروٹ بدل سونے کی کوشش کرنے لگی۔

کلاس روم میں عمار نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ خود کئی بار بہانے بہانے سے اور کبھی کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے چکی تھی۔ مگر عمار نے ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔

"چلو شکر ہے جان چھوٹی۔ خواہ مخواہ کی بدنامی کس کو اچھی لگتی ہے۔" اس نے مطمئن انداز میں سوچا مگر یہ سوچ طفل تسلی ثابت ہوئی۔ پہلے وہ اس کے گھورنے پر سیخ پا ہتی اور اب جب وہ اس حرکت سے باز آ گیا تھا تو اسے عجیب قسم کی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ سوچنے لگی۔ "یہ شاید اپنی اہمیت کے کم ہونے کا احساس ہے یا کسی کی نظروں سے گرنے کی توہین کا احساس۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ہر وقت اس کی ادنا سی نظر کا متمنی رہنے والے کا یوں بے رخی برتنا مجھے ہضم نہ ہو رہا۔"

وہ یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی کہ یہ عمار کی محبت یا چاہت کے حصول کی تڑپ ہے۔

اگلے دن ایک اور حیرانی اس کی منتظر تھی۔ پہلے عمار کلاس میں ایسی جگہ بیٹھا کرتا تھا جہاں وہ اسوہ کو آسانی سے گھور سکے۔ مگر اب اس نے اپنی جگہ پہلی رو میں بیٹھنے والے ایک لڑکے سے بدل لی تھی۔ اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا کہ اسوہ کو دیکھنے کے لیے اسے باقاعدہ مڑنا پڑتا۔

"ہونہہ!.... جیسے میں اس کے لیے مری جا رہی ہوں نا۔" اسوہ نے طنزیہ انداز میں ساتھ بیٹھی رباب کو کہا۔ دوسرے پیریڈ کی ابتدا میں عمار نے جگہ بدلی تھی۔

"کیا مطلب، تمھارا دماغ جگہ پر ہے نا؟" رباب نے دبے لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ پروفیسر فرقان کلاس روم میں داخل ہو گئے تھے۔

"کک.... کیا ہوا؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"اسے یہ بات کرنے والی تم خود ہو، بلکہ اس کے لیے تم نے پولیس سے اس کی چھترول بھی کروائی اور اب کیا فرما رہی ہو؟"

"نن.... نہیں یار! تم غلط سمجھیں۔ میرا مطلب تھا کہ اس کا انداز ایسا ہے جیسے میں اس کے لیے مری جا رہی ہوں۔"

"اچھا اب خاموشی سے لیکچر سنو۔" رباب پروفیسر فرقان کو توجہ سے سننے لگی۔

خالی پیریڈ کے دوران کیفے ٹیریا میں چائے پیتے ہوئے رباب اسے جھڑک رہی تھی۔

"یار!.... اس غریب کی جان بخش دو۔ اب تو اس نے تمھیں گھورنا بھی بند کر دیا ہے، پھر طعنہ زنی کا مقصد۔"

"طعنہ زنی کب کی ہے؟ میں نے تو یونھی بات کی تھی۔" اسوہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"اسوہ ایک بات پوچھوں؟"

"جی پوچھو۔"

"جب پولیس والے ایک بے گناہ کی پٹائی کر رہے تھے تو تمھیں ترس نہیں آیا تھا۔"

"بے گناہ کیوں، اس نے ایک لڑکی کی زندگی اجیرن کر دی تھی اور بے گناہ ہو گیا۔ یہ سوچو کہ اگر میری جگہ کوئی غریب لڑکی ہوتی تو یہ اسے کتنا تنگ کرتا۔"

”محترمہ!.... یہ امکانی گھوڑے دوڑانے کے بجائے یہ فرماؤ کہ جب بھری کلاس میں تم نے اس کے منہ پر تھپڑ تک جڑ دیا تھا، پھر پولیس کو بلوا کر اس کے ساتھ اتنا برا سلوک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سزا تو بہ ہر حال وہ کاٹ چکا تھا۔“

”یہ سزا تو میں نے اسے اسماء کی بدتمیزی کی وجہ سے دی تھی۔ یاد ہے اسماء نے میری کلائی پکڑ کر مجھے چیلنج دیا تھا کہ اب میں اسے ہاتھ لگا کر دیکھوں، پس میں نے اسے وہ سب کر دکھایا۔“

”محترمہ!.... جانتی ہو پوری کلاس کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے اور تمام، تمھارے گھٹیا فعل اور بیچ حرکت سے برگشتا ہیں۔“

”گھٹیا کیوں، ایک چھچھوری لڑکی کی جرأت کہ وہ اسوہ اسلم شکور خان کے منہ لگے۔ میں نے اسے اپنی طاقت دکھائی تھی اور بس۔“

”میں تمھاری دوست ہوں، لیکن یقین کرو تمھاری یہ حرکت بہ ذاتِ خود مجھے اتنی بری لگی کہ بیان سے باہر ہے۔ عمار کے اندر مجھے سوائے خوبیوں کے کچھ نظر نہیں آتا اور اگر غربت خامی ہے، تب بھی صرف ایک خامی کی بنا پر اس کی اتنی ہتک اور توہین، یہ کہاں کا انصاف ہے یار“!

”واہ بڑی خوبیاں نظر آ رہی ہیں، کہیں کامران بھائی کو ہری جھنڈی دکھانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔“

”شٹ آپ۔“ رباب نے اسے جھڑکا۔

اسوہ ہنسی۔ ”سچ کہہ رہی ہوں۔ اتنی خوبیوں کا مالک دوبارہ نہیں ملے گا اور پھر تمھاری دولت اس کے اندر موجود واحد خامی کو بھی ختم کر دے گی۔“

”مجھے تو وہ بہن سمجھتا ہے اور پھر شیدا ابھی تم پر ہے۔ تم خود کیوں نہیں اسے خوش آمدید کہتیں۔“

اسوہ نے منہ بنایا۔”میں مرنا پسند کروں گی۔“

”میرا خیال ہے بہت ہو گیا، اب اس موضوع کی جان چھوڑ دینا چاہیے۔“ رباب نے اکتا کر کہا، مجبوراً اسوہ کو بھی اثبات میں سر ہلانا پڑا۔

☆☆☆

”یار! تم نے تو خود کو بالکل بدل لیا ہے۔“ مدثر کے لہجے میں تعریف کا عنصر نمایاں تھا۔

عمار نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔”حالات بدل دیتے ہیں ورنہ کوئی کب بدلنا چاہتا ہے؟“

مدثر ہنسا۔”شاید ڈر گئے ہو۔“

"ایسا کہہ سکتے ہو۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پولیس سے۔"

"نہیں۔" عمار نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی نفرت سے۔ جب میں نے یہ جان لیا کہ میرے بارے اس کے دل میں موجود نفرت کو میری اس حرکت سے بڑھاوا مل رہا ہے تو مجھے اپنی روش بدلنا پڑی۔"

"یعنی اب تک اس کی محبت دل سے رخصت نہیں ہوئی۔"

عمار کے لب مسکراہٹ کے انداز میں کھنچے مگر یہ ایک ناکام کوشش ہی تھی۔ مسکراہٹ خوشی کا نام ہے جب ہنستے ہوئے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں لرزتی نظر آئیں تو اسے کوئی مسکراہٹ کا نام نہیں دے سکتا۔ وہ آہستہ سے گنگنایا....

دل میں ہوتا تو کسی طور نکل بھی جاتا

اب تو وہ شخص بہت دور تلک ہے مجھ میں

"کیا مطلب؟"

”مطلب یہ کہ یہ اختیاری فعل تو نہیں ہے نا، البتہ کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش میں بس اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ اب اپنے افعال پر قابو حاصل ہو گیا ہے۔ پہلے بے بس ہو کر اسے دیکھنے لگتا تھا۔ اب نہیں دیکھتا اور نہ دیکھوں گا۔ البتہ اس کی نفرت و حقارت کا جواب ایک دن ضرور دوں گا۔ کب؟ یہ میرے ربّ ہی کو معلوم ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو۔“

”تمھاری موّخر الذکر بات بالکل درست ہے۔ یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اپنی حیثیت دیکھو، تم اس سے کیسے بدلہ لو گے۔ اور ہاں اگر تمھارے ذہن میں کوئی غلط خیال پرورش پا رہا ہے تو خدارا کچھ کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ ضرور کر لینا۔ یہ نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں۔“

”کوئی غلط خیال نہیں ہے یار!.... میں بس دولت مند بننا چاہتا ہوں، اتنا کہ اپنے جائز حقوق کے حصول میں دشواری نہ ہو۔“

مدثر نے کہا۔ ”وہ تو تم یوں بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

”غلط فہمی ہے جناب کی۔ اگر غریبوں کو اپنا حق مل جائے تو سارے جھگڑے، فساد ہی ختم ہو جائیں۔ ایک امیر زادی صرف اس لیے مجھے پولیس کے ہاتھوں زدوکوب کراتی ہے کہ میں نے اسے دیکھا کیوں؟ سونے پر سہاگا یہ کہ میرے ساتھ یہ بدسلوکی تھانے کے بجائے اس کی کوٹھی میں کی جاتی ہے۔ اب میں لاکھ پیٹوں، شور مچاو□ ں؟ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تھانے والوں نے تو ایف آئی آر ہی نہیں درج کرنی عمل تو بعد کی بات ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا کیس بنا لیں کہ مجھے جان چھڑانا مشکل ہو جائے۔“

”تو اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟“

”بتا تو دیا ہے کہ دولت کا حصول۔“

”خوب، تو یہ ہو گا کیوں کر۔“ مدثر ہنسا۔ ”ایم بی اے کرنے کے بعد تم کسی فرم میں جاب حاصل کر کے بہت زیادہ دولت حاصل کر لو گے اتنی کہ ایک موٹر سائیکل خرید لو گے۔ نئے جوتے اور قیمتی لباس بھی۔ ہے نا....؟“

وہ اس کے طنز کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔ ”میں اپنا کاروبار کروں گا۔“

”مثلاً کیا؟“

”معلوم نہیں، ابھی تک اس بارے سوچا نہیں ہے۔“

”میں بتا دیتا ہوں۔“ مدثر نے حقائق کا پٹارا کھولا۔ ”تم سگریٹ پان کا کھوکا ڈال لینا۔ ساتھ میں چائے بھی بنانا شروع کر دی تو سونے پر سہاگا ہو گا۔ سبزی فروٹ کی ریڑھی بھی عمدہ کاروبار ہے۔ کسی گرلز کالج کے باہر فروٹ چاٹ اور نمکین چاولوں کا آئیڈیا بھی برا نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر اگر مکئی کے بھٹے بھون کر بیچو تو ہزاروں میں کھیلو گے۔“

عمار ایک بار پھر اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتا ہوا بولا۔ ”اسلم شکور خان اور اس جیسے درجنوں کو تمھارے جیسے مخلص دوستوں نے یوں ہی مطعون کیا ہو گا۔“

”ہا....ہا....ہا“ مدثر نے قہقہہ لگایا۔ ”اسلم شکور خان خاندانی رئیس ہے محترم۔ اور یاد رکھنا ایسے امراء شروع شروع میں ہزار قسم کے غلط دھندوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ جب خوب دھن کما لیتے ہیں تو پھر اس کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے عام کاروبار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو اس ضمن میں جناب کس کالے دھندے میں ہاتھ ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”کہتے ہیں نیت صاف منزل آسان۔“

”یہ گھساپٹا محاورہ کتابوں ہی میں بھلا لگتا ہے۔“

”میرا خیال ہے خالی پیریڈ ختم ہونے والا ہے۔“عمار بحث کو ختم کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔مدثر نے اس کی تقلید کی تھی۔وہ اس وقت یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔اسوہ کو رباب کے ساتھ کیفے ٹیریا کی طرف جاتے دیکھ کر وہ مدثر کے ساتھ لان میں آ گیا تھا۔آج کل وہ حتی الوسع کوشش کر رہا تھا کہ اسوہ کا سامنانہ کرنا پڑے۔

”ہونہہ!....گھٹیا لڑکیوں کی گھٹیا محبت۔“ اسماء کو عمار کے ساتھ جڑے بیٹھے دیکھ کر وہ رباب کو مخاطب ہوئی۔مگر اس کی آواز بہ ہر حال اتنی بلند ضرور تھی کہ اسماء کے کانوں تک پہنچ گئی۔اسماء نے آج کل عمار کے ساتھ ہی بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔

”عمار!پتا ہے مکھی ہمیشہ صاف اشیاء کو چھوڑ کر گندہی پر بیٹھتی ہے اور اسی گندی مکھی کی طرح کچھ لوگوں کی ذہنیت بھی اتنی گندی ہوتی ہے کہ بس گندی سوچ ہی اس میں پل سکتی ہے۔“ اسماء کی آواز بھی کافی بلند تھی۔

”چور کی داڑھی میں تنکا۔“اسوہ طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔کلاس میں موجود طلبہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”چور کون؟“اسماء تیز لہجے میں کہتی ہوئی کھڑی ہوئی اور بے باکانہ انداز میں بولی۔”سارے سن لیں۔میں عمار کو پسند کرتی ہوں اور ان شاءاللہ جلد ہی ہم شادی کرنے والے ہیں۔بس یا کچھ اور سننا ہے۔“آخر میں وہ اسوہ کو مخاطب ہوئی تھی۔

”واہ....خوب....عمدہ....بلے بھئی بلے....“کلاس میں مختلف طلبہ کی ملی جلی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔

”اسماء پلیز بیٹھ جاؤ۔“ عمار نے اسے بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچا اور وہ اسوہ کو گھورتی ہوئی بیٹھ گئی۔

اسوہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، البتہ اسماء کی بات نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اسی وقت پروفیسر ہاشم کلاس روم میں داخل ہوا اور تمام چہ مگوئیاں خاموشی میں ڈھل گئیں۔ سارے پروفیسر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ پروفیسر ہاشم کا لیکچر شروع ہوا مگر اسوہ باوجود کوشش کے لیکچر دھیان سے نہ سن سکی۔ اس کے دماغ میں مسلسل اسماء کا طنزیہ لہجہ گونج رہا تھا۔ ”میں عمار کو پسند کرتی ہوں، جلد ہی ہم شادی کر لیں گے.... شادی کر لیں گے.... شادی کر لیں گے“........

پیریڈ کے خاتمے پر رباب اسے مخاطب ہوئی۔

”اسوہ!.... تم ٹھیک تو ہو؟“

”آں.... ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”بس سر میں درد ہے۔ میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ اگلے پروفیسر کے آنے سے پہلے وہ کلاس روم سے باہر آ گئی تھی۔

☆☆☆

”ہوش میں تو ہو صاحب زادے؟“ بشیر احمد کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”جی ابو جان!.... آپ جانتے ہیں کہ میں نشہ نہیں کرتا۔“ عمار نے اطمینان سے جواب دیا۔

”مگر آج مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔“

”ابو جان! میں مذاق کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”ہاں، موڈ میں تو نہیں ہو مگر مذاق کر تو رہے ہو نا۔“

”ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔“

”جناب!.... آپ اپنی تعلیم مکمل کریں اور کوئی اچھی سی جاب تلاش کریں۔“

”ابو جان!.... آپ نے اپنی جاب سے کیا کما لیا؟“

”تمھیں کسی چیز کی کمی آنے دی؟“بشیر احمد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ابو جان! میرے نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدلے گی کہ، میری بہت ساری خواہشات وسائل کی کمی کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔ امی جان اور آپ نے مجھے اتنی محبت دی کہ شاید ہی کسی کے والدین نے دی ہو۔ مگر یہ بات آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ہم غریب ہیں۔ اور غربت جاب کرنے سے کم نہیں ہو سکتی؟“

”تمھارے کہنے کا مطلب ہے، میں تمھاری بہت ساری خواہشات پوری کرنے میں ناکام رہا ہوں۔“بشیر احمد کے لہجے میں دکھ جھلک رہا تھا۔

”ہاں، مگر مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے، کیونکہ یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا۔“

”احسان ہے تمھارا؟“بشیر احمد طنزیہ لہجے میں بولا۔

عمار اس کے طنز کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔”اچھا پتا ہے، میرے چند کلاس فیلوز ایسے ہیں جو اپنی کار میں یونیورسٹی آتے ہیں۔ ان کے ذاتی اکاونٹ میں لاکھوں روپے جمع ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ہر ماہ آو□ ٹنگ کے لیے بیرون ملک جاتے ہیں اور“........

”ٹھیک ہے۔ان کے والدین اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ انھیں یہ سہولیات بہم پہنچائیں۔میں اپنی محدود آمدن میں یہ سب کیسے کرتا۔“

”میرے کہنے کا بھی یہی مقصد تھا اور میں نہیں چاہتا کہ اپنی اولاد کو بھی مجھے یہی کہنا پڑے۔“

”محترم!....اس گھر کی قیمت چند لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے اور یہ رقم کسی بھی کاروبار کے لیے ناکافی ہے۔“

باپ کے لہجے میں مفاہمت کی بو محسوس کرتے ہی وہ مسکرایا۔”ابو جان!....میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں مگر میں محدود پیمانے پر کاروبار شروع کروں گا اور پھر آہستہ آہستہ اسے ترقی دوں گا۔“

”تم سوائے اس گھر سے ہاتھ دھونے کے اور کچھ نہیں کرو گے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کے بعد یہ گھر مجھے ہی ملے گا۔“

”تو....؟“

”تو....میری چیز ہے میں آج بیچوں یا کل۔“

”پھر کوئی خیمہ وغیرہ تو لے آو نا،رہیں گے کہاں؟“

عمار اطمینان سے بولا۔”آپ کو سرکاری کوارٹر الاٹ ہو سکتا ہے۔“

بشیر احمد نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔”ایک شرط پر۔“

”جی؟“

"اصل بات بتاو□ ں۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عمار آہستہ سے بولا۔"اس کا نام اسوہ ہے۔اسلم شکور خان کی اکلوتی اولاد ہے ...."اس نے مختصر لفظوں میں والد کو تمام قصہ دہرا دیا تھا۔پولیس کی بات بھی بے جھجک دہرا دی تھی۔

"تم شاید مجھے دوست نہیں سمجھتے اس لیے مجھ سے یہ ساری بات چھپائے رکھی۔"

"نہیں آپ میرے باپ بھی تو ہیں اور میں آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔"

"دکھ تو اب بھی پہنچا ہے۔"

"یقینا پہنچا ہو گا، مگر اب تو میں نے اپنے مسائل سے نبٹنے کا منصوبہ سوچ لیا ہے۔"

بشیر احمد نے منہ بنایا۔"جو کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔"

عمار نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔"ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے والوں کو وہی ملتا ہے جو کوشش کرنے والوں سے بچ جائے۔"

"مطلب؟ ہمارا بے گھر ہونا طے ہو گیا۔"

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے نا ابو جی۔"

"بس باتیں کرنا ہی سیکھی ہیں۔خیر!....کل میں کوارٹر کے لیے درخواست دے دوں گا اور الاٹ منٹ میں ہفتہ ایک لگ جائے گا۔اس کے بعد تم گھر کا سودا کر لینا۔" یہ کہہ کر بشیر احمد اٹھنے لگا۔

"یقینا آپ خفا ہو کر جا رہے ہیں۔"

بشیر احمد مسکرایا۔ ”ہر چیز تمھاری اپنی ہے۔ آج روک بھی دیا، تو کل بیچ دو گے۔“

”شکریہ ابو جان! ان شاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

”واہ! بڑی بات ہے جی۔“ بشیر احمد مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اسوہ ساری رات سو نہیں سکی تھی۔ رہ رہ کر اس کے دماغ میں اسماء کا پر اعتماد لہجہ گونجنے لگتا۔ ”جلد ہی ہم شادی کر رہے ہیں۔“

”تو مجھے کیا، بھاڑ میں جائیں۔“ اس نے تلخی سے سوچا۔ ”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے۔ یقیناً یہ اسماء کی ذات سے نفرت ہے، مگر عمار سے بھی تو میں نفرت کرتی ہوں اور دو قابلِ نفرت اشخاص اگر ایک ہو رہے ہوں تو مجھے کیا ؟“

مگر وہ ساری رات سوچ کر بھی اپنی پریشانی کی وجہ دریافت نہ کر سکی۔ عمار کو وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اسماء سے اسے نفرت تھی۔ اس کے باوجود ان دونوں کی محبت نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ سوچتے سوچتے اسے عمار کے ساتھ اپنا رویہ یاد آ گیا۔ کتنی توہین کی تھی اس نے عمار کی لیکن ایک لفظ بھی تو گلے شکوے کا اس کے منہ سے نہیں نکلا تھا۔ بلکہ اس نے تو اس واقعے کا ذکر بھی کسی کے سامنے نہیں کیا تھا۔ اس کی اپنی سہیلی رباب اور دو تین دوسری لڑکیوں نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی تھی مگر جس کے ساتھ اس نے یہ سلوک کیا تھا وہ ایک حرفِ شکایت بھی زبان پر نہیں لایا تھا۔

”وہ غلطی پر تھا اس لیے خاموش رہا۔“ اس کے دماغ میں ایک بوگس دلیل گونجی۔

اس کے ساتھ اس کی یاداشت میں رباب کی کہی گئی باتیں تازہ ہو گئیں۔ ''کسی کو دیکھنا جرم تو نہیں ہے نا۔ دنیا کی کوئی عدالت اسے جرم نہیں سمجھتی۔ دینِ اسلام اس عمل کی مذمت کرتا ہے تو اس کے ساتھ وہ عورت کو بھی تو چہرہ ڈھانپنے کا حکم دیتا ہے۔''

وہ ساری رات الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہی۔ صبح کی آذان کے ساتھ اسے نیند آ گئی تھی۔ دن چڑھے وہ جاگی تو کافی لیٹ ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی پہنچی تو دو پیریڈ گزر گئے تھے۔

''خیر تو ہے جناب؟'' اسے دیکھتے ہی رباب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اسی وقت پروفیسر ہاشم کلاس روم میں داخل ہوا۔ اسوہ اسے نہیں دیکھ سکی تھی کہ اس کی دروازے کی جانب پیٹھ تھی۔

''بس یار! کیا بتاو□ ں رات کو مووی دیکھتی رہی اس لیے سویرے آنکھ نہیں کھل سکی۔''

''اچھا بیٹھو۔ پروفیسر ہاشم ہمیں ہی گھور رہا ہے۔'' رباب نے کہا اور وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔

''مس اسوہ! شاید آپ کا پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہا سر!....'' اسوہ کے کچھ کہنے سے پہلے ارشد نے لقمہ دیا۔ ''محترمہ ابھی ہی پہنچی ہیں۔''

''ویسے یہ ان کا نہیں، ہر طالبِ علم کا مسئلہ ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی ہم اساتذہ کو بھی درپیش ہوتا ہے کہ پڑھنے پڑھانے کو جی نہیں چاہتا۔''

”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں سر؟“ اسوہ نے جلدی سے تردید کرنا چاہی، مگر پروفیسر صاحب نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو روسٹرم پر رکھتے ہوئے کہا۔

”چلو آج ہم نہیں پڑھتے اور یہ پیریڈ اسوہ کے نام کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سر، تھینک یو سر، واہ، بہت اعلا، مزہ آ گیا سر!“ مختلف قسم کی آوازں سے کلاس روم گونج اٹھا تھا۔

پروفیسر ہاشم نے کرسی رائیٹنگ بورڈ کے سامنے رکھی اور کہا۔ ”مس اسوہ! یہاں کلاس کے سامنے تشریف لائیں ۔“

”سر! پلیز سبق پڑھتے ہیں۔ میری وجہ سے تمام کی پڑھائی کا حرج ہو گا۔“ وہ محجوب سی ہو کر کہنے لگی۔ ”بعد میں سارے مجھے برا بھلا کہیں گے۔“

پروفیسر ہاشم نے اطمینان بھرے انداز میں پھلجھڑی چھوڑی۔ ”مس اسوہ! اگر برا بھلا کہنے سے کسی کو کچھ ہوتا تو آج ایک بھی سیاست دان زندہ نہ ہوتا۔“ تمام طلبہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

”پلیز تشریف لائیں۔“ پروفیسر نے ایک مرتبہ پھر اسوہ کو سامنے آنے کی دعوت دی۔

وہ نپے تلے قدم رکھتی ہوئی کلاس روم کے سامنے آ گئی۔ تمام کلاس کی نظریں اس پر جم گئیں تھیں۔ اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ یوں بھی ایک دم اتنی نظروں کا سامنا کرنا آدمی کو بوکھلا دیتا ہے۔ خاص کر اس آدمی کو جس کا پہلے ایسی حالت سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ وہ شاید گھبرا کر واپس ہی لوٹ جاتی کہ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ ”اب تو سارے دیکھ رہے ہیں۔ یوں بھی کسی کا کلاس کے سامنے کھڑا ہونا اس بات

کو واجب کرتا ہے کہ تمام اسے ہی دیکھیں اور یقینی طور پر عمار کو بھی دیکھنے کا بہانہ مل گیا ہو گا۔ وہ پروفیسر ہاشم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔“ پروفیسر ہاشم مسکرایا۔ ”شروع کرو بھئی، کلاس کو کوئی چیز سناو۔“

کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ایک شعر عرض ہے۔“

”نہیں جی! ہم نے شعر نہیں، گانا سننا ہے۔“ ارشد نے جلدی سے کہا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا۔ وہ بھی اسوہ کو پسند کرتا تھا، مگر اسوہ کا رویہ ہر لڑکے کے ساتھ ایسا تھا کہ یہ پسندیدگی بس دل ہی میں چھپی رہتی۔

اس کی تائید میں کلاس میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ”گانا.... گانا.... گانا۔“ بلند ہونے والی زیادہ تر آوازیں لڑکوں کی تھیں۔

”مگر“....

”اگر مگر کوئی نہیں سننا۔“ ارشد کی آواز کے ساتھ چند دوسرے لڑکوں کی آواز بھی شامل تھی۔

”چلیں کوئی بات نہیں اسوہ!.... تمھاری وجہ سے ان کی ایک پیریڈ کی پڑھائی بھی تو مس ہو رہی ہے۔“ پروفیسر ہاشم نے ہنستے ہوئے اسے ترغیب دی۔

”اوکے سر!“ اتنی دیر کلاس کے سامنے کھڑے رہنے کے بعد اس کی جھجک اتر گئی تھی۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس کی مدھر آواز بلند ہوئی....

ہزار باتیں کہے زمانہ، میری وفا پہ یقین رکھنا

ہر اک ادا میں ہے بے گناہی، میری ادا پہ یقین رکھنا

میری محبت کی زندگی کو نظر نہ لگ جائے اس جہاں کی

یہی صدا ہے دھڑکتے دل کی میری صدا پہ یقین رکھنا۔

کلاس میں بالکل خاموشی چھاگئی تھی۔ صورت کی طرح اس کی آواز بھی بہت پیاری تھی۔ گاتے گاتے اس نے نظر بھر کر عمار کی طرف دیکھا مگر وہ کاپی کھولے الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ وہ اسی کو گھورنے لگی مگر عمار اس سے بے نیاز بے جان کاغذ کو گھورتا رہا۔

"اتنی نفرت.... کہاں تو ایک لمحہ میرے چہرے سے نظر نہیں ہٹتی تھی اور کہاں ایک نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں ۔" اسے گانے کے بول بھولنے لگے۔ وہ اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر رباب کو دیکھنے لگی جو چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کی جانب متوجہ تھی۔ اور پھر جیسے ہی اس نے گانا بند کیا، کلاس روم تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

"بہت خوب، بھئی عمدہ۔" پروفیسر ہاشم نے متاثر کن لہجے میں کہا۔ "اتنا اچھا تو خود لتا منگیشکر نے بھی نہیں گایا تھا۔"

"تھینک یو سر۔" وہ خوش ہو گئی تھی۔

"ایک اور.... ایک اور۔" کلاس کی اکثریت کی آواز کورس کی صورت میں بلند ہوئی۔

"نہیں بھئی۔" اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کی کیا گارنٹی ہے کہ ایک اور گانے کے بعد آپ ایک اور کی ضد نہیں کریں گے؟ جبکہ ہر ایک نے سامنے آکر اپنی باری بھگتانا ہے۔"

مگر اس کے انکار کے باوجود کافی طلبہ مصر رہے کہ وہ گانا سنائے۔

"اچھا ایسا ہے کہ مس اسوہ کہ آپ بس ایک گانا اور سنا دیں، پھر کسی اور سٹوڈنٹ کو اپنی جگہ بلا کر آپ واپس بیٹھ سکتی ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے سر!" وہ ہر دل عزیز پروفیسر ہاشم کی بات نہیں ٹال سکی تھی۔

ایک بار پھر اس کی مدھر اور خوش کن آواز سے کلاس روم گونجنے لگا۔
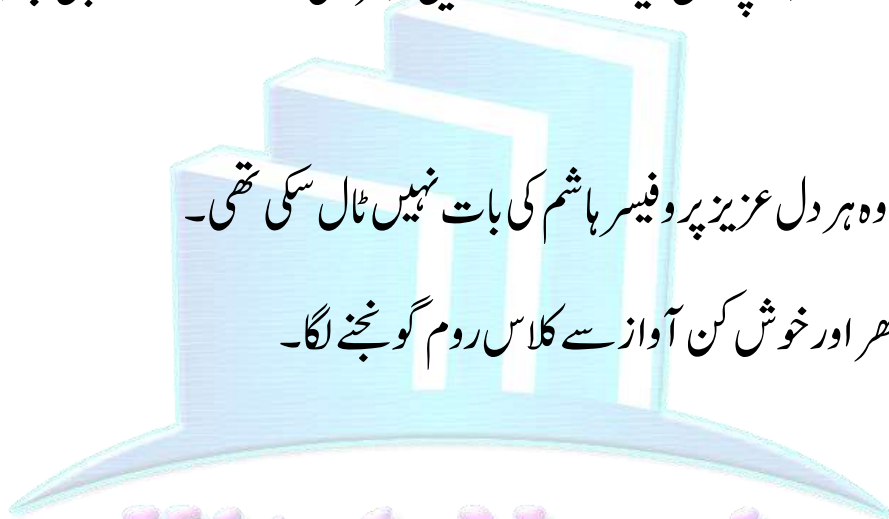
دل کھویا کھویا گم سم.... دل کھویا کھویا

یادوں میں کسی کی گم.... دل کھویا کھویا۔

عشق پر زور کوئی زور کوئی نہ۔۔۔۔۔

گانا گاتے ہوئے بار بار اس کی نظریں بھٹک کر عمار کو دیکھنے لگتیں، مگر وہ بیگانہ بنا بیٹھا رہا۔ گانے کے بول جیسے ہی ختم ہوئے کلاس روم ایک مرتبہ پھر تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

تالیوں کی آواز تھمتے ہی پروفیسر ہاشم نے کہا۔"اب آپ پوری کلاس میں سے کسی کو بھی بلا سکتی ہیں۔"

ایک بار تو اس کے جی میں آیا کہ عمار کو بلالے مگر پھر اسے جھجک محسوس ہوئی۔اس نے بہ ذات خود اسے دھتکارا تھا۔اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ بھری کلاس میں اسے پکارتی۔

"مس رباب!"ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اپنی سہیلی کا نام پکارا۔

وہ اسے غصیلی نظروں سے گھورتی کلاس کے سامنے آگئی،جبکہ اسوہ واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

"تو مس رباب ہمیں کون سا گانا سنا رہی ہیں؟"پروفیسر ہاشم نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

وہ اطمینان سے بولی۔"سر!مجھے گانا،گانا تو نہیں آتا،اگر آپ کہتے ہیں تو گانا پڑھ سکتی ہوں۔"

"بھلا گانا کیسے پڑھا جاتا ہے؟"پرفیسر ہاشم مستفسر ہوا۔

"جیسے سبق پڑھا جاتا ہے سر"!

"اہوہ...."چند لڑکوں کی افسوس ناک آوزیں گونجیں۔

"تو پھر؟"

"تو یہ کہہ میں دو تین لطیفے سنا دیتی ہوں۔"اس نے تجویز پیش کی۔

"اوکے،شروع کرو۔"پروفیسر ہاشم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایک شخص دکان دار کے پاس........" وہ لطیفے سنانے لگی۔اس کے لطائف اگرچہ اتنے اچھے نہیں تھے، مگر اس کی صورت ایسی تھی کافی لڑکوں کوزبردستی قہقہے لگانے پڑے۔

اپنی باری بھگتا کر اس نے ارشد کا نام لے دیا جو بار بار گانے کا نام لے رہا تھا۔

وہ برے برے منہ بناتا کلاس کے سامنے آ گیا۔

"گانا سنائیں جی گانا۔" اسوہ اور رباب کے ساتھ اور کئی لڑکیوں نے بھی باآواز بلند پکارا تھا۔

"اوکے اوکے۔" ارشد نے ہاتھ اٹھا کر بڑے انداز سے کہا۔تمام طلبہ ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور آنکھیں بند کر کے گانے لگا۔
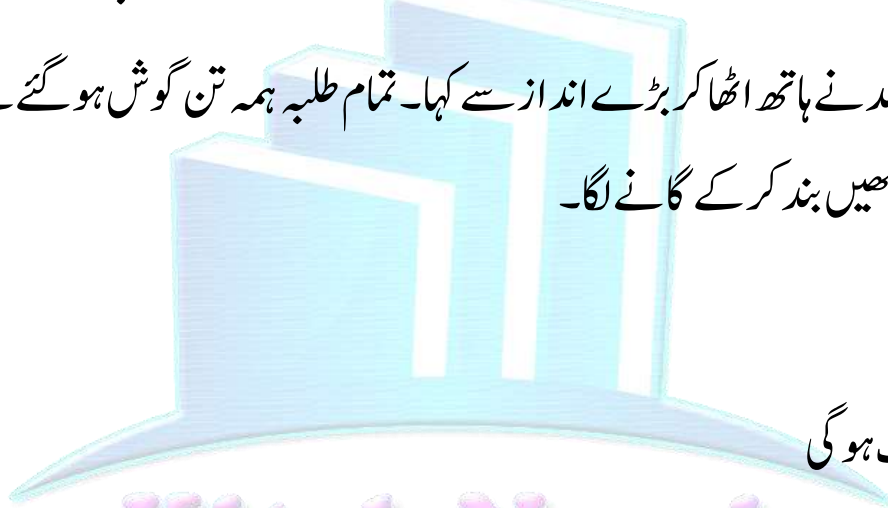
میرے محبوب قیامت ہو گی

آج رسوا تیری گلیوں میں محبت ہو گی

اس نے دو بول ہی گنگنائے تھے کہ اس کی بھدی آواز سے تنگ آ کر تمام یک زبان ہو کر بولے۔

"تھینک یو جی.... تھینک یو۔آپ براہ مہربانی کسی اور کو موقع دیں۔"

وہ پریشان ہوئے بغیر بولا۔"آپ خود ہی ضد کر رہے تھے۔خیر۔" وہ پرفیسر ہاشم کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے انداز پر مسکرا رہا تھا۔"سر! کیا میں کسی ایسے بندے کو بلا سکتا ہوں جو ایک باری بھگتا چکا ہو؟"

"نہیں جی!" پروفیسر نے انکار میں سر ہلایا۔ "اس طرح تو تمام کو موقع نہیں ملے گا۔"

"اوکے سر!.... تو تالیوں کی گونج میں تشریف لاتی ہیں، سنبل۔"

سنبل نے ایک ملی نغمہ گا کے سنایا، اس کی آواز بھی کافی بہتر تھی۔ اس نے مدثر کو نامزد کیا، جس نے مختلف جانوروں کی آوازیں نکال کے پوری کلاس کو محظوظ کیا۔ اور پھر اسماء کا نام لے کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

اسماء نے کلاس روم کے سامنے آتے ہی بغیر کسی کے کہنے کے گانا شروع کر دیا تھا، اس کی آواز اگر اسوہ سے اچھی نہیں تھی تو اس سے کم بھی نہیں تھی۔

کتنا پیار تمھیں کرتے ہیں آج ہمیں معلوم ہوا؟

جیتے نہیں تم پر مرتے ہیں آج ہمیں معلوم ہوا؟

اور پھر جیسے ہی اس نے گانا ختم کیا تمام ایک اور ایک اور کی رٹ لگانے لگے۔ بغیر کسی بحث کے اس نے غزل گانی شروع کر دی تھی۔

چاہت میں کیا دنیاداری عشق میں کیسی مجبوری

لوگوں کا کیا سمجھانے دو، ان کی اپنی مجبوری

غزل کے خاتمے پر ایک اور، ایک اور کا شور مچ گیا تھا۔وہ خوش دلی سے ایک اور گانا سنانے لگی۔ گاتے ہوئے اس کی نظریں زیادہ تر عمار کی جانب متوجہ رہی تھیں۔وہ بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔اسوہ کے گانے پر اس نے بالکل داد نہیں دی تھی مگر اسماء کو وہ خوب داد دے رہا تھا۔اور پھر اسماء کا گانا ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا کہ پروفیسر فرقان کلاس روم میں داخل ہوا، یقیناوہ اپنا پیریڈ لینے آیا تھا۔

"آئیں سر!...." پروفیسر ہاشم نے کرسی سے اٹھ کر اسے تعظیم دی۔

"پلیز سر!تشریف رکھیں۔" پروفیسر فرقان جلدی سے بولا۔"میرا خیال ہے آج پڑھائی کا موڈ نہیں ہے۔"

"سر جی!.... آپ بیٹھیں اور سنیں کہ اسماء کتنا اچھا گاتی ہے؟" پروفیسر ہاشم نے ایک سٹوڈنٹ کو اشارا کیا اور اس نے ایک خالی کرسی لاکر ان کے قریب رکھ دی۔

پروفیسر فرقان بھی بیٹھ گیا۔اسماء کھنکار کر نیا گانا گانے لگی تھی۔

اور پھر اس نے پانچواں گانا ختم کیا تھا کہ اسوہ کھڑے ہو کر منہ بناتے ہوئے بولی۔

"سر!ہمیں مزید کتنی دیر اسماء احتشام کی گائیکی سے محظوظ ہونا پڑے گا؟"

پروفیسر ہاشم نے مسکرا کر کہا۔"تو آپ آجائیں۔"

"نہیں سر!میں اپنی باری بھگتا چکی ہوں، اب کسی اور کو موقع ملنا چاہیے۔"

"اوکے...." پروفیسر ہاشم اثبات میں سر ہلا کر اسماء کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "بہت عمدہ اسماء! آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ آپ سے مزید گیت سنے جائیں، مگر خیر معترضین کا اعتراض بھی برحق ہے، آپ کسی اور کو اپنی جگہ بلالیں۔"

"محترم عمار!" اسماء محبت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

اسوہ منہ بنا کر نیچے دیکھنے لگی۔ نامعلوم کیوں اسے ان دونوں کی چاہت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔

عمار کلاس روم کے سامنے آکر بولا۔

"میں اپنی نظم سنانا چاہوں گا۔"

"نہیں گانا سناو ؟" دو تین لڑکیوں کی آوازیں ابھریں۔

وہ مسکرایا۔ "ضرور سناتا مگر یقین مانو، ارشد بھائی کی آواز میں آپ لوگوں نے پھر بھی دو بول برداشت کر لیے تھے۔ میری آواز میں ایک بول بھی برداشت نہیں کر پاو گے۔"

"ٹھیک ہے، ویسے بھی لڑکا اپنی نظم سنا رہا ہے۔" پروفیسر فرقان جو ادب سے گہرا لگاو رکھتے تھے۔ اس کی طرف داری کرنے لگے۔

عمار نے ایک طائرانہ نظر طلبہ پر ڈالی اور پھر ترنم اور لے سے اپنی نظم پڑھنے لگا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے بے سرے پن اور آواز کے بھدا ہونے کے بارے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔

طے ہوا اب نہ کبھی اس کی طرف دیکھیں گے

اور پہلے کی طرح اس کو نہ ہم سوچیں گے

اب نہ بھولے سے بھی بارش میں ہم نہائیں گے

خود بھی تنگ ہوں گے نہ احباب کو ستائیں گے

خود سے اس طور عداوت نہیں ہوتی ہم سے

تھک گئے اور محبت نہیں ہوتی ہم سے

"واہ....واہ.... کیا بات ہے؟" پروفیسر فرقان نے با آواز بلند داد دی۔

"اوے ظالم!.... یہ کیا کر دیا؟" ایک دو لڑکوں کی آہ بلند ہوئی۔

اب نہ جاگیں کے کبھی دیر تلک چاند کے ساتھ

خود کو پھنسنے نہیں دیں گے یوں تری یاد کے ہاتھ

اب نہ تڑپیں گے کبھی اس کے لیے روئیں گے

اب فقط سوئیں گے، بس سوئیں گے، بس سوئیں گے

جاں لٹانے کی سخاوت نہیں ہوتی ہم سے

تھک گئے اور محبت نہیں ہوتی ہم سے

”کیا بات ہے؟.... جاں لٹانے کی سخاوت نہیں ہوتی ہم سے؟“ ایک لڑکا زور سے بولا۔ اسی وقت ایک اور نے لقمہ دیا۔

”سونا اپنے مقدر میں کہاں یار!....؟ امتحان سر پر ہیں، اور جناب کو سونے کی پڑی ہے۔“

”خاموش یار! سننے دو۔“ غصے بھری آواز میں ڈانٹا گیا۔ جبکہ عمار تمام سے بے نیاز نظم سناتا رہا....

اب نہ زلفوں کو تری، کالی گھٹا بولیں گے

اب نہ آنکھوں کو تری جھیل سے تشبیہہ دیں گے

مثلِ کویل ہے تری صوت نہیں لکھیں گے

رخ روشن کو مہِ جوت نہیں لکھیں گے

ضبط ٹوٹا ہے رعایت نہیں ہوتی ہم سے

تھک گئے اور محبت نہیں ہوتی ہم سے

”اوہ بھائی!.... کس کی زلفوں کی بات ہو رہی ہے؟ہمیں تو سنہری زلفیں نظر آ رہی ہیں۔“ کہنے والے نے یقیناً اسماء کی سنہری زلفوں کی بات کی تھی۔

”عقل کے اندھے ہو تم۔“ اسے جواب دینے والا با آواز بلند بولا۔ ”کالی زلفوں کا غم غلط کرنے کے لیے سنہری زلفوں کو چنا گیا ہے۔“

تیرا آنچل کبھی لہرائے فضا گاتی ہے

اب نہ مانیں گے کہ سانسوں سے مہک آتی ہے

تری مسکان بہاروں کا سندیسا لائے

یہ غلط تھا، یہ غلط ہے یہی بولا جائے

ذکر تیرا یہ تلاوت نہیں ہوتی ہم سے

تھک گئے اور محبت نہیں ہوتی ہم سے

عمار نے نظم ختم کی اور کلاس روم تالیوں کی زور دار آواز سے گونج اٹھا۔

"لو جی اسوہ بی بی!" رباب نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تمھاری تمنا تو پوری ہو گئی نا، اب عمار بھائی نہ تو تمھاری زلفوں کو کالی گھٹا بولے گا اور نہ آواز کی تعریف کرے گا، بلکہ تمھاری جانب دیکھے گا ہی نہیں۔"

"جائے بھاڑ میں۔" اسوہ منہ بناتے ہوئی بولی۔ "میں کون سا اس کی دید یا محبت کے لیے مری جا رہی ہوں۔"

"بالکل الٹی کھوپڑی کی ہو۔" رباب نے آہستہ مگر پر طیش لہجے میں کہا۔ "ہر بات کو اپنے اوپر لے جاتی ہو۔ سب کو پتا ہے کہ تم نے ہی اسے اس حد تک لایا ہے پھر یوں کہنے کی کوئی تک بنتی ہے؟"

اور پھر اسوہ کے کچھ کہنے سے پہلے پروفیسر فرقان کی پاٹ دار آواز گونجی۔

"بہت خوب مسٹر عمار!.... لیکن برا نہ مانو تو اتنا پوچھنا چاہوں گا کہ یہ محبت شروع کب کی ہے جو تھک بھی چکے ہو؟"

"تھکا نہیں ہے سر تھکایا گیا ہے۔" ارشد کی طنزیہ آواز بلند ہوئی۔ "پولیس کی مار بڑے بڑوں کو اپنی اوقات یاد دلا دیتی ہے یہ غریب تو کسی شمار میں نہیں ہے۔"

"کیا.... پولیس.... میں سمجھا نہیں؟" پروفیسر فرقان سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔ جبکہ پروفیسر ہاشم بھی حیرانی سے ارشد کو گھورنے لگا تھا۔

"سر!.... ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔" ارشد کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہنے جا رہا ہے اس لیے اس نے جلدی سے بات سنبھال لی۔

اوُکے !.... آپ تمام کا بہت شکریہ۔ خصوصاََ جن طلبہ نے باقاعدہ اس محفل میں اپنا حصہ ڈالا۔ انجوائے کریں کل ان شاء اللہ ہم تازہ دم ہو کر اپنی پڑھائی کا آغاز کریں گے۔" یہ کہہ کر پروفیسر ہاشم نے پروفیسر فرقان کو چلنے کا اشارہ کیا اور دونوں پروفیسر کلاس روم سے نکلتے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی اسوہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھی اور ارشد کو مخاطب کرتے ہوئے پھٹ پڑی۔

"مسٹر !.... میرا خیال ہے تمھیں عزت راس نہیں ہے؟ میں تمھارے منہ میں ایسی لگام ڈالوں گی کہ بولنا بھول جاو گے۔"

ارشد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو اسوہ بی بی !.... میں عمار نہیں ہوں کہ خاموش رہوں گا۔ تم رئیس زادی ہو گی تو اپنے گھر میں۔"

"تم آئندہ ایسی بکواس کر کے دکھاو۔" اسوہ نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر اسی وقت رباب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"میں نے آپ کے بارے کوئی غلط بات نہیں کی۔" اس کے تیور دیکھ کر ارشد گھبرا گیا تھا۔ اس لیے اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

"تو یہ کیا تھا، پولیس کا ذکر کرنے کی تمھیں جرات کیسے ہوئی۔ وہ میرا اور عمار کا معاملہ تھا۔ تم کون ہو بیچ میں بات کرنے والے۔"

"اسوہ! پلیز چھوڑ بھی دو نا۔" رباب نے اسے دروازے کی طرف کھینچا۔ اور وہ شعلہ بار نظروں سے ارشد کو گھورتی ہوئی کلاس روم سے باہر نکل آئی۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ عمار جانے کب کا وہاں سے نکل گیا تھا۔

کلاس روم سے نکلتے ہی رباب اسے چھیڑنے لگی۔ "آج تو بڑی طرف داری ہو رہی تھی عمار بھائی کی۔"

"نہیں یار!" وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ "بس اس شہدے پر غصہ آ گیا تھا۔ کوئی اس بے غیرت کو پوچھے کہ تم کون ہو، جسے ظلم سہنا پڑا وہ خاموش ہے اور یہ چچا خواہ مخواہ یونھی درمیان میں ٹپک رہا ہے۔ جس وقت میں کلاس روم کے سامنے کھڑی تھی اس وقت بھی اس نے کافی بکواس کی تھی، ایک اور گانا، ایک اور گانا کی رٹ سب سے زیادہ یہی لگا رہا تھا۔ جیسے کہ میں اس کے باپ کے دربار کی مغنّیہ ہوں۔"

"وہ تو خیر میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ تم گاتی رہو اور میں سنتی رہوں۔ جانے عمار بھائی پر اس جادو بھری آواز کا کیا اثر ہوا ہو گا۔"

"نہیں اب وہ سچ مچ سنبھل گیا ہے۔ یقیناً اسے اپنے اور میرے درمیان موجود طبقاتی فرق سے آگاہی ہو گئی ہے۔"

رباب ہنسی۔ "یہ تو اسے پہلے بھی معلوم تھا؟ ویسے آج یہ تو مان لیا کہ تم نے عمار بھائی پر ظلم کیا تھا۔"

"ہاں۔" اس کا جواب خلاف توقع تھا۔ "شاید میں جلد ہی اسے سوری کر لوں، مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میرا ردِ عمل بہت زیادہ شدید تھا۔"

"سچ۔" رباب نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"ہاں رباب!۔" اسوہ نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں جانتی تھی تم بہت اچھی ہو۔پتا نہیں تم عمار کے لیے اتنی ظالم کیوں ہو گئیں تھیں؟"

"مجھے خود بھی پتا نہیں۔" وہ جان چھڑاتے ہوئے بولی۔"اوکے کل ملیں گے۔" وہ باتیں کرتی کرتی پارکنگ میں پہنچ گئی تھیں۔اسوہ اس سے ہاتھ ملا کر اپنی کار کی جانب بڑھ گئی۔اسے دور سے آتے دیکھ کر ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا تھا۔

☆☆☆

"ویسے یہ دعوت کس خوشی میں۔" مدثر نے ٹیبل پر سجے لوازمات کو گھورتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے آج عمار کی سال گرہ ہے۔" اسماء نے خیال ظاہر کیا۔وہ تینوں اس وقت کیفے ٹیریا میں موجود تھے۔عمار انھیں زبردستی وہاں لے کر آیا تھا۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" عمار نے انکار میں سر ہلایا۔

"تو پھر۔" مدثر کا سوال ہنوز باقی تھا۔

"بس میرا دل کر رہا تھا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ چند خوشگوار لمحے بتالوں۔کیا پتا زندگی کب مہلت چھین لے۔"

"ایسی بدشگونی کی بات تو نہ کیا کرو۔" اسماء نے گھبرائے ہوئے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”ویسے ایک بات ہے، آپ دونوں مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔“عمار کے لہجے میں جدائی کی ان دیکھی مہک شامل تھی۔

”ابھی تک تو ہماری پڑھائی کا ڈیڑھ سال بقایا ہے۔ اور ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں تو پھر یوں جدائی کا ذکر کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟“ اسماء اسے جھڑکنے سے باز نہیں آئی تھی۔

”تمھیں ہو کیا گیا ہے یار؟“ مدثر کو بھی اس کا انداز حیران کن لگا تھا۔

”کچھ نہیں یار! آپ لوگوں نے تو بات کا بتنگڑ ہی بنالیا ہے۔ پلیز، پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔“ اس مرتبہ وہ دونوں اس کی بات کا جواب دیے بغیر لوازمات سے بھری ٹیبل کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی میں عمار کا آخری دن تھا۔ اپنے ساتھیوں سے بچھڑتے وقت اس نے انھیں اصل بات سے اس لیے بے خبر رکھا تھا کہ، نئی زندگی کی شروعات سے پہلے وہ سوائے ماں باپ کے، ماضی سے تعلق رکھنے والے ہر رشتے کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ جب تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتا وہ کسی سے تعلق اور واسطہ نہیں رکھے گا۔ وہ بس پیسا کمانے کی مشین بننا چاہتا تھا۔

اپنا گھر وہ دو تین دن پہلے فروخت کر چکا تھا۔ اس وقت اس کے اکاؤنٹ میں پچیس لاکھ کے قریب رقم موجود تھی۔ وہ اسی دن پرانے گھر کو چھوڑ کر نئے فلیٹ میں شفٹ ہوئے تھے اور عمار اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر آ گیا تھا۔

مدثر کی دوستی کبھی بھی اس کے لیے مسائل کا باعث نہ بنتی مگر وہ اسماء کی پر خلوص محبت سے ڈرتا تھا۔ اس کا سامنا کرنا اسے ہمیشہ مشکل لگتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے مدثر سے واسطہ رکھا تو اس کی وجہ سے وہ بھی اسے ڈھونڈ لے گی اور پھر خواہ مخواہ اس سے بے رخی برتنا اور اسے خود سے دور جھٹکنا بہر حال اس جیسے آدمی کے لیے کافی مشکل تھا، کہ وہ فطری طور پر بہت زیادہ نرم خو اور دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنے والا آدمی تھا۔ لیکن وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اسوہ کے علاوہ کسی کو جیون ساتھی بنانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"تو صاحبزادے!.... کب سے کاروبار شروع کر رہے ہو؟" بشیر احمد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آئیں ابو جان۔" وہ والد کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ بشیر احمد والد سے زیادہ اس کا دوست تھا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے یار!" اس نے سوال دہرایا۔

"ابو جان! آج یونیورسٹی کو خیر باد کہہ آیا ہوں۔ کل سے باقاعدہ منصوبہ بناو ں گا کہ کون سا کاروبار بہتر رہے گا۔"

"جو کرنا ہے جلدی کرو جناب! کیونکہ میری ریٹائرمنٹ میں صرف پانچ سال رہ گئے ہیں اور اس کے بعد میں نہیں چاہتا کہ ہمیں کرائے کا گھر ڈھونڈنا پڑے۔"

"ابو جان! آپ ساری زندگی اپنے گھر میں رہے ہیں۔ زندگی کے آخری چند سال اگر کرائے کے مکان میں رہ بھی لیے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹے گی۔"

"ہونہہ!" بشیر احمد نے منہ بنایا۔ "مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک تھا، خیر میں تو تیار ہوں، تم بس اپنی امی جان کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔"

"ابو جان! یہ آپ کا اور آپ کی مسز کا ذاتی معاملہ ہے۔ براہ مہربانی مجھے اس لڑائی میں نہ گھسیٹیں۔"

"کیا باتیں ہو رہی ہیں جی باپ بیٹے میں۔" سکینہ شوہر کے لیے کھانے کے برتنوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔

"اپنے ہونہار سپوت ہی سے سن لو۔" بشیر احمد نے منہ بنایا۔

"دیکھ لیں ابو جان! میں نے سب کچھ سچ سچ بتا دینا ہے۔ مجھ سے جھوٹ نہیں بولا جاتا۔"

بشیر احمد اطمینان سے بولا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں، کم از کم اس طرح بیگم صاحب کو اتنا پتا ضرور چل جائے گا کہ اس کا بیٹا کتنا تمیز دار ہے۔"

"یہ بھی خوب کہی ابو جان! لڑکیوں کی تصویریں آپ اپنے پرس میں لے کے گھومیں اور بد تمیز میں ٹھہرا۔"

"دیکھا.... دیکھا بیگم! اس کی چالاکی دیکھو، اپنی بات سے بالکل پھر گیا ہے۔ اس نے موضوع ہی بدل لیا ہے۔"

"آپ دونوں کے مابین قاضی شریح بھی فیصلہ نہیں کرا سکے گا۔ میں غریب کس شمار و قطار میں ہوں۔" سکینہ شوہر کے سامنے کھانے کے برتن رکھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"برخوردار! یہ جھوٹ بلکہ بہتان تراشی کی لت کب سے پڑ گئی ہے؟"

"جھوٹ کون سا ابو جان؟ آپ جانتے تو ہیں آپ کا سپوت جان دے سکتا ہے۔ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"اچھا بڑی بات ہے جی!" بشیر احمد نے اچھا کی آخری الف کو کافی لمبا کھینچا تھا۔ "ویسے کیا میں آپ کی معلومات سے بہرہ مند ہو سکتا ہوں کہ میرے پرس میں کس لڑکی کی تصویر ہے؟"

”ہاں....ہاں کیوں نہیں۔“عمار اطمینان سے بولا۔”ذرا پرس کھول کر دیکھیں اور بتائیں کہ سرخ جوڑے میں ملبوس سر پر سلیقے سے دوپٹا لپیٹنے والی لڑکی کون ہے؟“

”دھت تیرے کی،بے شرم!....وہ تمھاری امی ہے۔“

”مجھے کب انکار ہے،یہ تو دو جمع دو چار کی طرح واضح ہے کہ آپ کی زوجہ میری ماں ہی ہو گی۔“

”بے شرم!وہ تمھاری حقیقی ماں ہے۔“

”تو کیا؟“عمار زور سے بولا۔”ہے تو لڑکی نا؟“

”ابے یہ مذاق کسی دن تمھارے باپ کی جان لے لے گا؟“وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔”تمھیں نہیں پتا اکیلے میں تمھاری ماں کتنی خون خوار ہو جاتی ہے۔اس کی ظاہری شفقت اور خدمت پر نہ جانا۔“

”تو آپ میری پیاری امی جان کو ایسا سمجھتے ہیں؟“عمار نے ماں کو آتے دیکھ کر پینترا بدلا۔

”ہم کاروبار کے بارے مشورہ کر رہے تھے۔“بشیر احمد نے ایک دم موضوعِ گفتگو تبدیل کیا۔

عمار ہنسا۔”بڑا جلد،یاد آ گیا ابو جان۔“

"اچھا مسخرہ پن چھوڑو اور چائے پیو۔" بشیر نے دبی آواز میں کہا۔

والد کو پسپا ہوتا دیکھ کر عمار نے ہنستے ہوئے چائے کا کپ اٹھالیا۔

اسے ہنستا دیکھ کر بشیر احمد دانت پیستے ہوئے بولا۔"کوئی بات نہیں بیٹا!....کبھی تو تمھاری شادی بھی ہو جائے گی، آخر کب تک بکرے کی ماں خیر منائے گی؟"

اس مرتبہ عمار نے قہقہہ لگایا۔بشیر احمد کے چہرے پر بھی ہنسی پھیل گئی تھی۔

"اب نہ زلفوں کو تری کالی گھٹا بولیں گے، اب نہ آنکھوں کو تیری جھیل سے تشبیہ دیں گے؟

"نہیں بچو اب تو کہنا پڑے گا۔اتنی جلد تمھاری جان نہیں چھوٹنے والی؟" اسوہ بے ساختہ مسکرا پڑی۔اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ صبح عمار سے سوری کرلے گی۔ آج ایک دم اس پر انکشاف ہوا تھا کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔

کب، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ بس ہو گئی تھی۔ شاید پہلے دن ہی سے وہ اسے پسند تھا، مگر اس نے کبھی اس کے بارے سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر عمار کی قوت برداشت جانچتی رہی۔ آیا وہ اس کی محبت میں کتنا ثابت قدم ہے۔ وہ اس کی محبت کے بارے جان کر یہ سوچ بیٹھی تھی کہ وہ کبھی بھی اس سے دست بردار نہیں ہو گا، مگر آخر میں اس کا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ عمار نے اس کی محبت سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا اور یہ اعلان سن کر اسے محسوس ہوا تھا کہ عمار کو اس نہج تک لانے والی وہ خود تھی۔ کسی کی توہین کی کوئی حد ہوتی ہے۔ کسی کو اتنا زیادہ بے عزت کرانا اور اس کی غربت کا اس انداز میں مذاق اڑانے کو محبت کی آزمائش نہیں کہتے۔ ایسا تو شاید دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اب اسے عمار کو منانا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بار معذرت کرنے پر عمار نے اسے معاف کر دینا تھا۔ وہ عمار کو سوچتے سوچتے نیند کی میٹھی وادیوں میں کھو گئی۔

”کیا میرے سوری کہنے پر مجھے معاف کر دو گے ؟“ اس وقت عمار یونیورسٹی کے مخملی لان میں بیٹھا کسی کتاب کی ورق گردانی میں مشغول تھا جب اس کے سامنے پہنچ کر اسوہ نے بغیر کسی تمہید کے استفسار کیا۔

”نہیں۔“ اس نے عمار کا سر نفی میں ہلتا ہوا دیکھا۔ اور پھر اس کے لب وا ہوئے۔ ”میں تمھیں سوری کرنے ہی نہیں دوں گا۔“

”سچ ؟“ وہ خوشی سے سرشار ہو گئی تھی۔

”اس میں شبہ ہی کیا ہے ؟“

”اور جو یہ کہا تھا اب میری آواز کو کویل جیسا نہیں کہو گے وہ کیا تھا؟“ اس نے بے اختیار شکوہ کیا۔

”میرے کہنے سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ تمھاری آواز کویل جیسی ہے، آنکھیں جھیل سے بھی گہری ہیں، چہرہ ماہ بدر سے بھی روشن ہے، زلفیں کالی گھٹا کو شرماتی ہیں، تم ہنستی ہو تو بہاریں امڈ پڑتی ہیں۔ میرا ایسا نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے یہ تو آفاقی حقیقتیں ہیں انھیں بھلا کون جھٹلا سکتا ہے؟“

وہ بے ساختہ بولی۔”مجھے تو فرق پڑتا ہے نا۔“

”اچھا یہ بات ہے تو پھر میں اپنے سارے الفاظ واپس لیتا ہوں آج میں بر سرِ عام اعتراف کروں گا کہ........
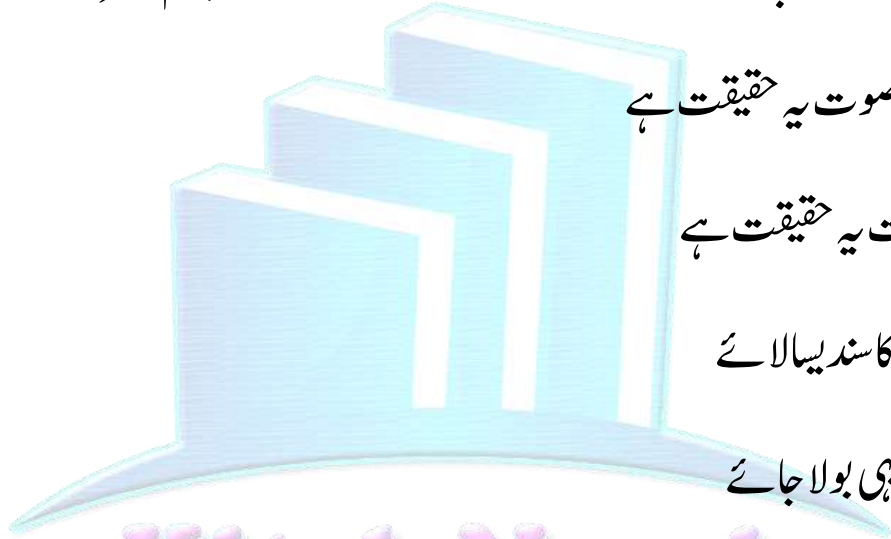
مثل کویل ہے تیری صوت یہ حقیقت ہے

رخ روشن ہے مہِ جوت یہ حقیقت ہے

تیری مسکان بہاروں کا سندیسا لائے

یہی سچ تھا یہی سچ ہے یہی بولا جائے

وہ اٹھلا کر بولی۔”نہیں یہ مجھے گا کر سناو ٔ؟“

”مگر میں نے کبھی گانا نہیں گایا اور.... پھر میری آواز بھی کچھ“........

”مجھے کچھ پتا نہیں، بس آپ گانا سنائیں۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا بولا۔”اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے کوئی ساز وغیرہ کا بندوبست تو ہو جائے۔“

وہ پوچھنے لگی۔”پر ساز کہاں سے آئے گا۔“

"آئے گا کہاں؟.... آیا ہوا ہے۔" اور اس کی بات ختم ہوتے ہی مدھر موسیقی کی آواز گونجنے لگی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ عمار گانا شروع کرتا اس کی آنکھ کھل گئی۔ موبائل فون پر سیٹ کیے ہوئے آلارم کلاک کی خوب صوت گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اسوہ نیم غنودگی کی حالت میں کافی دیر اس سہانے سپنے کو سوچتی رہی۔

"کیا عمار مجھے اتنا پیارا ہے۔" اسے حیرانی ہوئی۔ "اتنی نفرت کے بعد اچانک بے انتہا محبت کا جاگ اٹھنا عجیب ہی تو تھا۔

وہ فریش ہونے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

وہ اس دن یونیورسٹی میں پہنچنے والی سب سے پہلی طالبہ تھی۔ کلاس روم کے بجائے اس نے سبزہ زار میں گڑی سنگی بینچ پر بیٹھ کر عمار کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ سپنے میں بھی اس نے یہی سبزہ زار دیکھا تھا۔

وہ مسلسل عمار کو مخاطب کرنے، اس سے معذرت چاہنے اور اپنی محبت کے اظہار کے بارے سوچتی رہی۔ طلبہ کی آمد شروع ہوئی اور اس کی منتظر نگاہیں داخلی دروازے کی جانب نگراں ہو گئیں۔

رباب اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر سخت حیران ہوئی تھی۔ "ارے، خیر تو ہے؟ آج اتنی جلدی؟"

"ہاں، بہت ضروری کام تھا۔" اسوہ دھیمی آواز میں بولی۔

"میں بھی سنوں؟" وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

"بس کسی سے معذرت کرنے کا ارادہ تھا۔"

"کیا!.... سچ مچ۔" رباب نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"ہاں رباب!....میں نے بہت ظلم کیا ہے اس پر۔"

رباب مسکرائی۔"اے!ذرا خیال سے،معذرت کرتے کرتے کہیں حد سے ہی نہ گزر جانا۔"

اسوہ نے حیا آلود لہجے میں کہا۔"بس میں تھوڑی ہوتا ہے۔"

"تو کیا سچ مچ۔"رباب ششدر رہ گئی تھی۔

"ہاں۔"اسوہ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔"پر مجھے نہیں معلوم یہ کب ہوا؟بس ہو گیا۔"

"اللہ خیر کرے۔"رباب نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔"اسوہ!یہ ٹھیک نہیں ہے۔یہ مبالغہ ہو گا۔بس معذرت کرنا کافی رہے گا۔اور پھر تم دونوں کے درمیان موجود طبقاتی فرق کے بارے تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

"چھوڑو رباب!وہ پرانے دلائل یاد کرا کے مجھے شرمندہ نہ کرو۔کون سا طبقاتی فرق؟اگر وہ امیر ہوتا اور میں غریب،تو کیا پھر بھی اس طبقاتی فرق کو دیکھا جاتا۔نہیں نا،یقینی بات ہے وہ اپنی غریب شریک حیات کو دنیا کی ہر خوشی فراہم کرتا۔تو کیا میں ایسا نہیں کر سکتی۔کیا میں اپنے شریک حیات کو زندگی کی وہ آسائشیں مہیا نہیں کر سکتی۔"

"اسوہ!تم ایک دم اتنی بدل جاو □ ٔ گی یقین نہیں آتا اور جہاں تک تعلق ہے عمار کی غربت کا،اس بارے انکل کو اعتراض ہو گا و گرنہ میرے نقطہ نظر سے تو امیر لڑکی کے لیے غریب لڑکا ہی آئیڈیل شوہر ہو سکتا ہے۔ایسا شوہر بیوی کا احسان مند اور شکر گزار رہتا ہے۔اور ہمیشہ شوہر بن کر ہی زندگی گزارتا ہے حاکم بننے کی کوشش نہیں کرتا۔"

اسوہ اعتماد سے بولی۔ "پاپا کو میری خوشی سب سے زیادہ عزیز ہے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" دعائیہ لہجے میں کہتے ہوئے رباب کھڑی ہو گئی۔ "ٹھیک ہے جی! آپ عمار بھائی سے اکیلے ہی میں بات کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

وہ شرارت سے مسکرائی۔ "میرے منہ کی بات چھین لی۔"

"ہاں محترمہ! وہ کیا کہتے ہیں....

راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا؟

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

"بے شرم۔" اسوہ حیا آلود لہجے میں بولی۔ اور رباب ہنستی ہوئی کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔ [ویسے میر تقی میر کے اس شعر کا پہلا مصرع یوں زبان زدِ عام ہے کہ "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟" .... مگر یہ غلط ہے]

اسوہ ایک مرتبہ پھر عمار کی راہ تکنے لگی، مگر اس نے نہ آنا تھا نہ آیا۔ یہاں تک کہ پیریڈ شروع ہونے کا وقت ہو گیا۔ وہ بوجھل قدموں سے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

"شاید میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر وہ کلاس روم میں پہنچ گیا ہو۔" امید کی کرن اس کے دل میں زندہ تھی۔ وہ آج ہی عمار کو اپنے دل کا حال کہہ دینا چاہتی تھی۔ مگر کلاس روم میں عمار کی خالی پڑی کرسی نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس کی معذرت، اس کا اقرارِ محبت اور عمار کو کہنے والی تمام باتوں کو مزید چوبیس گھنٹے کی تاخیر برداشت کرنی پڑ رہی تھی۔

رباب اس کے چہرے پر چھائے اثرات دیکھ کر پوچھنے لگی۔"اسوہ!اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"نن.... نہیں پریشانی کیسی۔بس یونھی،وہ دراصل آج میں مکمل طور پر تیار ہو کر آئی تھی تو"....

"یار!کہاں بھاگا جارہاہے وہ۔تمھارے لیے تو گھڑے کی مچھلی ہے،جب چاہنا ہاتھ بڑھا کر پکڑ لینا۔"

"ہونہہ!میرا خیال ہے اب وہ بدل گیاہے۔"

"اگر میں کہوں تمھارا خیال بالکل غلط ہے پھر۔"

"زیادہ خوش فہمی بہتر نہیں ہوتیں۔"اسوہ کی آواز میں مایوسی تھی۔

"کیاہو گیا ہے تمھیں؟"رباب کے لہجے میں حیرانی تھی۔"لگتاہی نہیں کہ تم وہی اسوہ ہو۔"

"اچھا چھوڑو یار!پروفیسر فرقان آگیاہے۔"اسوہ تمہید باندھتے پروفیسر فرقان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

عمار کی دو تین دن مسلسل غیر حاضری نے اسوہ کو مجبور کیا کہ وہ مدثر سے اس کے بارے معلومات لے۔خالی پیریڈ میں وہ یونیورسٹی لان میں گڑی سنگی بینچ پر بیٹھا تھا جب اسوہ کے قریب پہنچی۔

"اسلام علیکم!مدثر بھائی۔"

"وعلیکم اسلام!"مدثر اسے حیرانی سے دیکھنے لگا،کہ اس جیسی نک چڑھی سے اتنی خوش اخلاقی صرف خواب ہی میں صادر ہو سکتی تھی۔

”مدثر بھائی! ایک بات پوچھنا تھی؟“ اسوہ کو اس کا حیرانی بھرا لہجہ عجیب نہیں لگا تھا۔

”جی پلیز؟“ مدثر کی حیرانی رفع ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

”وہ.... میں .... یہ پوچھنا چاہ رہی تھی، کہ.... کہ.... وہ.... وہ یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہا؟“ اسوہ سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔

”کون، آپ کہیں عمار کا تو نہیں پوچھ رہیں؟“ اس کی حیرانی دوچند ہو گئی تھی۔

”جج.... جی.... جی بھائی!“ اسوہ کو خجالت محسوس ہو رہی تھی۔

”کیوں؟“ مدثر نے حیرانی سے سر ہلایا اور پھر دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ویسے مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں نہیں آ رہا۔ میں نے کل اسے دو تین بار کال کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا موبائل فون نمبر بند ملا۔“

”اس کے گھر جا کر معلوم کر لیتے، کہیں بیمار ہی نہ پڑا ہو؟“ اسوہ کے لہجے میں بے تابی تھی۔

”مس اسوہ! اگر خفا نہ ہوں تو کیا میں آپ کی پریشانی کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

وہ گڑبڑاتے ہوئی بولی۔ ”وہ میں.... ویسے ہی۔ کلاس فیلو ہے ہمارا اور تین دن سے یونیورسٹی نہیں آ رہا تو میں نے سوچا.... آپ سے معلوم کر لوں.... اور تو کوئی ایسی بات نہیں؟“

”اچھا ابھی معلوم کر لیتا ہوں۔“ مدثر موبایل فون نکال کر عمار کا نمبر ڈایل کرنے لگا۔

"آپ کے ملائے ہوئے نمبر سے اس وقت جواب موصول نہیں ہو رہا۔" کی ٹون سن کر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

"کیا ہوا؟" اسوہ نے بے صبری سے پوچھا۔

"نمبر بند ہے۔" اس نے کہا۔ "ویسے آپ نے صحیح کہا ہمیں معلوم کرنا چاہیے تھا، کہ وہ یونیورسٹی کیوں نہیں آرہا۔ خیر آج یونیورسٹی سے سیدھا اس کے گھر جاؤں گا۔"

اسوہ نے پوچھا۔ "یقیناً آپ ٹیکسی میں جائیں گے۔"

"نہیں، یونیورسٹی بس میں جاؤں گا۔ بس سٹاپ سے اس کے گھر کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔"

"اگر میں آپ کو وہاں تک ڈراپ کر دوں۔ میرا مطلب ہے میری اپنی کار ہے اور اس بہانے میں بھی اس کی عیادت کر لوں گی۔"

مدثر بہ مشکل خود کو اچھلنے سے باز رکھ سکا تھا۔ اسوہ اسلم شکور خان بہ نفس نفیس عمار کے گھر جانے پر آمادہ تھی۔ اور وہ بھی اس کی عیادت کو۔

"شاید وہ ساری زندگی اپنی بیماری کو دعائیں دیتا رہے۔" مدثر کی یہ سوچ زبان تک رسائی نہیں پا سکی تھی۔ بولتے وقت اس کے لہجے میں حیرانی کا عنصر نہ ہونے کے برابر تھا۔

"اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے اسوہ بہن"!

"شکریہ مدثر بھائی۔" وہ خوش ہو گئی تھی۔

چھٹی کے وقت وہ پارکنگ میں مدثر کی منتظر تھی۔ڈرائیور کو اس نے گھر جانے کا کہہ دیا تھا۔

مدثر کی گومگو کی کیفیت کو اس نے۔"مدثر بھائی!.... آئیں۔" کہہ کر ختم کر دیا تھا۔اس کے ساتھ ہی اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

مدثر جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔اتنی قیمتی کار میں اسے پہلی بار بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔وہ ہلکا سا نروس تھا۔مگر پھر اسوہ کے دوستانہ لہجے نے اس کی جھجک دور کر دی۔اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی اسوہ ہے، جسے وہ پیٹھ پیچھے، نک چڑھی، مغرور، بدمزاج، بددماغ اور جانے کیا کیا کہتے رہتے تھے۔

"ایک بات پوچھوں مدثر بھائی؟" اسوہ کے لہجے میں وہ ایک خوش کن تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔

وہ مسکرایا۔"جی ضرور۔"

"عمار مجھ سے سخت خفا ہو گا، ہے نا؟"

مدثر سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا جواب دے۔شاید وہ اس کی کیفیت کو جان گئی تھی کہ تاکید کرنے لگی۔

"مدثر بھائی! میں صرف سچ سننا چاہوں گی۔میں جانتی ہوں کہ میں آپ لوگوں کے لیے ایک ناپسندیدہ لڑکی ہوں ۔مگر یقین مانو بھائی! میں اب بدلنا چاہتی ہوں۔میں نے عمار کے ساتھ جو ظلم کیا اس کے لیے شرمندہ ہوں اور اسی وجہ سے اس کے پاس معافی مانگنے جا رہی ہوں۔"

"اسوہ بہن! سچ تو یہ ہے کہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ وہی اسوہ ہیں۔ اور جہاں تک تعلق ہے عمار کی ناراضی کا تو....؟" وہ اسوہ کے متعلق عمار کے ساتھ ہونے والی آخری گفتگو کو یاد کرنے لگا۔ اسوہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے بولنے کی منتظر تھی۔

"شاید ہی کوئی کسی کو اتنا چاہتا ہو؟ اور عمار آپ سے خفا ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ اداکاری کر سکتا ہے خفا ہونے کی۔ وہ بس اپنی قسمت سے، اپنی غربت سے خفا ہے۔ اور بہت زیادہ دولت کمانے کا خواہش مند ہے۔ اتنی دولت کہ اسوہ اسلم شکور خان کی برابری کر سکے اور جہاں تک تعلق ہے آپ کو نہ دیکھنے کا تو میرے سامنے اس کی وضاحت اس نے یوں کی کہ وہ آپ کی نفرت برداشت نہیں کر سکتا اور اسے محسوس ہو گیا تھا کہ اس کے یوں گھورنے سے آپ کے دل میں اس کی نفرت بڑھ رہی ہے۔"

"مدثر بھائی! میں شرمندہ ہوں۔" اسوہ سچ مچ نادم تھی۔ "میں نے عمار کو بہت زیادہ دکھ دیے۔ پلیز آج میری سفارش کر دیجیے گا۔"

مدثر ہنسا۔ "کیا کہہ رہی ہو اسوہ بہن! مجھے تو یہ ڈر ہے کہ آپ کو اپنے گھر دیکھ کر وہ خوشی ہی سے مر نہ جائے؟"

"کہیں آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، یاد نہیں اس دن کلاس روم میں اس نے جو نظم سنائی تھی۔ تھک گئے اور محبت نہیں ہوتی ہم سے؟"

مدثر فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "جب منزل کا اتا پتا معلوم نہ ہو پھر تھکنا تو ہوتا ہے نا؟ اور اگر منزل خود چل کر آدمی کے پاس پہنچ جائے پھر کیسی تھکاوٹ؟"

"شاید اس نے منزل بدل لی ہو۔" اسوہ کے لہجے میں جھلکنے والے اندیشے نہایت واضح تھے۔

"نہیں اسوہ بہن! اسماء کبھی بھی اسوہ کی جگہ نہیں لے سکتی۔ محبت اختیاری عمل نہیں ہے، انسان کا دل بے اختیار ہوتا ہے۔"

"دماغ تو اختیار میں ہوتا ہے نا۔"

"دل نے سنی کب ہے دماغ کی۔"

اور پھر اسی طرح کی گپ شپ کرتے مدثر کی رہنمائی میں اس نے عمار کے گھر کے سامنے کار روک دی۔ اس چھوٹے سے مکان پر نظر پڑتے ہی اسوہ کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

مدثر نے نیچے اتر کر دروازے پر دستک دی۔

"جی بھائی؟" دروازہ کھولنے والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اسوہ کے اندازے میں اسے عمار کا والد ہونا چاہیے تھا۔ خود مدثر کی بھی اب تک عمار کے والد سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ وہ بس چند بار اس کی ماں ہی سے ملا تھا۔

"انکل! میں مدثر ہوں، عمار کا دوست۔"

"بیٹے یہ عمار کا گھر تو نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر شخص کی بات نے اسے حیران کر دیا تھا۔

اس نے دائیں کے دروازوں پر طائرانہ نگاہ دوڑا کر کہا۔ "انکل! میرا خیال ہے مجھ سے گھر کی شناخت میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ یوں بھی میں پہلی بار یہاں نہیں آیا۔"

وہ مسکرایا۔ "صحیح کہا بیٹے!.... ہمیں یہاں شفٹ ہوئے دو تین دن ہی ہوئے ہیں۔"

"کیا؟ اس کا مطلب، آپ نے یہ گھر خرید لیا ہے؟"

"عارضی طور پر بیٹے!....میں کرایہ دار ہوں۔"

"مالک مکان کون ہے؟"

"اسد خان، پراپرٹی ڈیلر ہیں۔ پرانے جاننے والے ہیں میرے۔"

"یقیناً اس نے انکل بشیر احمد سے یہ گھر خریدا ہو گا۔" مدثر نے خود کلامی کی۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ خیر آئیں، چائے پانی ہو جائے۔"

"شکریہ انکل! پھر کبھی سہی، بس آپ مجھے اس خان صاحب کا فون نمبر عنایت کر دیں۔"

اس نے جیب سے موبائل فون نکال کر اسد خان کا نمبر ڈھونڈا اور پھر مدثر کو نوٹ کرا دیا۔ مدثر اس سے ہاتھ ملا کر واپس مڑ گیا۔

"کیا ہوا؟" گو اسوہ ان کی باتیں سن چکی تھی مگر پھر بھی مدثر کے منہ سے کوئی اچھی بات سننے کی خواہاں تھی۔

"انھوں نے یہ گھر بیچ دیا ہے، اس نے اپنا موبائل فون نمبر بھی بدل لیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ماضی سے رابطہ نہیں رکھنا چاہ رہا۔"

"مم....میں سمجھی نہیں مدثر بھائی۔" اسوہ کا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا۔

"ہاں اب میری سمجھ میں آ گیا ہے۔" عمار نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔ "جس دن اس نے کلاس روم میں نظم سنائی تھی۔ اسی دن اس نے میری اور اسماء کی دعوت کی تھی اور اس دن اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے کہ وہ ہم سے بچھڑنے والا ہے۔ اور اس دن کے بعد وہ یونیورسٹی نہیں آیا۔"

"آ.... آپ کا مطلب وہ ماضی سے ناتا توڑنا چاہتا ہے۔" اسوہ ہکلائی۔

"نہیں۔" مدثر نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ماضی سے ناتا توڑ چکا ہے۔ کراچی جیسے شہر میں ایک ایسے آدمی کو تلاش کرنا جو آپ سے واسطہ نہ رکھنا چاہتا ہو بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاشنے کے مترادف ہے۔"

اسوہ نے پریشانی سے اسٹیرنگ پر سر ٹکا دیا۔ "اب کیا ہو گا؟" اس نے گویا خود کلامی کی تھی۔

"اللہ پاک خیر کرے گا اسوہ بہن۔" اچانک مدثر کو لگا وہ اس کی حوصلہ شکنی کر رہا ہے۔ اور یہ کوئی اچھا فعل نہیں تھا۔ "مجھے یقین ہے وہ آپ سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکے گا۔ بلکہ وہ آپ کو دیکھے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔"

"مدثر بھائی! شاید اسماء کو اس کا پتا ٹھکانہ معلوم ہو۔"

"نہیں، جب اس نے مجھ سے یہ سب کچھ خفیہ رکھا ہے تو اسماء کو کیسے بتا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی روپوشی کی اصل وجہ ہی اسماء ہے۔ اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی، جبکہ وہ اسے ایک اچھے دوست سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ اس لیے یقیناً اسماء سے جان چھڑانے کا اس سے اچھا طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔"

اس مرتبہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اسوہ نے گاڑی پیچھے موڑ لی۔ جبکہ مدثر ایک موہوم سی امید پر اسد خان کا نمبر ملانے لگا۔ اسد خان کے پاس بھی عمار یا اس کے والد صاحب کا رابطہ نمبر موجود نہیں تھا۔

☆☆☆

"ابو جان! پانسو روپے ادھار مل جائیں گے۔"

بشیر احمد ہنسا۔ "یہ بھی خوب رہی میاں!.... ابھی سے ہاتھ پھیلانے شرع کر دیے؟"

"ابو جان! دیتے ہیں کہ، میں امی جان سے مانگ لوں۔"

"یہ لو یار!" بشیر احمد منہ بناتے ہوئے اس کی طرف ہزار کا نوٹ بڑھایا۔ "اس نے بھی میری جیب ہی پر ڈاکا ڈالنا ہے۔"

"واپس کر دوں گا ابو جان! ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہاں!۔ امید پر دنیا قائم ہے۔" کہہ کر بشیر احمد بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا کہ اسے دفتر جانا تھا۔ جبکہ عمار پھیکے انداز میں ہنس پڑا تھا۔ اسے اپنے والد پر فخر تھا کہ جس نے اسے بچپن ہی سے دوست بن کر پالا تھا۔ اتنی زیادہ بے تکلفی کے باوجود عمار نے کبھی بیٹے کی حد پار نہیں کی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ گھر سے نکل آیا۔ سارا دن وہ مختلف جگہوں پر گھومتا رہا۔ شام کو تھکا ہارا واپس آ گیا۔ اگلے دن وہ پھر صبح گھر سے نکلا اور رات گئے ہی واپس لوٹا اور یہ اس کی روز مرہ کی روٹین بن گئی۔ سبزی منڈی، مارکیٹ، بس اڈے، مختلف کارخانوں، بڑے اور مشہور جنرل سٹوروں، بڑے ہوٹلوں غرض ہر قسم کے کاروبار کو اس نے سیکھنے کی غرض سے دیکھا۔ مختلف لوگوں سے بات چیت کر کے کچھ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ دو تین ماہ کی تپسیا کے بعد ایک دن وہ اپنے والد کے ساتھ اپنی معلومات کے بل بوتے پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

"چلو مان لیا محترم! تم نے ہر کاروبار کے متعلق کافی کچھ جان لیا ہے مگر اس جان کاری کا فائدہ کیا ہے؟ نہ تو تم چار مرلے کے مکان کو بیچنے والی رقم سے فائیو سٹار ہوٹل کھول سکتے ہو اور نہ اسی نوے لاکھ کی گاڑی خرید کر کراچی، پشاور روٹ پر چلا سکتے ہو۔"

"ابو جان! میں نے تازہ سبزی کا ذکر بھی کیا ہے۔"

بشیر احمد ہنسا۔ "مطلب سبزی کی ریڑھی لگانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔ مضافاتی دیہاتوں سے تازہ سبزی خرید کر منڈی میں لا کر بیچی جائے تو کافی منافع کمایا جا سکتا ہے۔"

"چلو پھر بسم اللہ پڑھو۔" بشیر احمد نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

☆☆☆

وہ رات اسوہ نے جاگ کر گزاری تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ، عمار یوں ایک دم غائب ہو جائے گا۔ یہ تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ عمار کے غائب ہونے کی سب سے بڑی وجہ وہ خود تھی۔ آخر کب تک وہ اس کی نفرت برداشت کرتا۔ اس کا عمار کو پولیس کے ہاتھوں زدو کوب کروانے کا فیصلہ نہایت غلط ثابت ہوا تھا۔ گو بعد میں وہ بہت پچھتائی تھی مگر پچھتاوں سے گیا وقت ہاتھ نہیں آیا کرتا۔

صبح کسی موہوم امید کے سہارے وہ خود کو یونیورسٹی جانے سے باز نہیں رکھ سکی تھی مگر پیریڈ شروع ہونے کے بعد بھی عمار کی کرسی خالی رہی تھی۔

"تیسرا دن ہے عمار نظر نہیں آرہا؟" اس دن کلاس روم میں داخل ہوتے ہی پروفیسر ہاشم نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

"معلوم نہیں سر!" مدثر نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

"اس کا موبائل فون نمبر نہیں ہے، پوچھ لیتے۔"

”موبائل فون نمبر بند جا رہا ہے سر!“ اس مرتبہ بھی جواب دینے والا مدثر ہی تھا۔

پروفیسر ہاشم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کلاس روم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کہ کسی کے جانے سے دنیا کا کام رکا نہیں کرتا۔

”تو آج ہم کیا پڑھ رہے ہیں........؟“

اسوہ غائب دماغی سے اس کا لیکچر سنتی رہی۔ خالی پیریڈ کے دوران کیفے ٹیریا کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر اسماء پر پڑی جو حسب عادت سبزہ زار میں گڑی سنگی بینچ پر بیٹھی تھی۔ وہ عموماََ اسی جگہ بیٹھنا پسند کرتی۔

اسوہ، رباب کو معذرت کرتے ہوئے اسماء کی طرف بڑھ گئی۔ رباب جانتی تھی کہ وہ عمار کے لیے پاگل ہوئی جا رہی تھی اس لیے وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کیفے کی جانب چل دی تھی۔

”اسلام علیکم!.... میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”آپ.... بیٹھو۔“ اسماء کی آواز میں شامل حیرانی غیر متوقع نہیں تھی۔

اسوہ ”شکریہ۔“ کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔

اسماء خاموشی سے کتاب کو گھورتی رہی۔

”اسماء! میں معذرت کرنے آئی ہوں۔“ ایک لمحہ خاموش بیٹھنے کے بعد وہ آہستہ سے بولی۔

”شاید، مجھے سننے میں کوئی غلطی پیش آ رہی ہے؟“ اسماء کتاب بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"نہیں۔" اسوہ نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "اسمائ!.... میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے اس دن بہت برا کیا تھا۔ مجھے اپنے رویے پر بہت افسوس ہے۔ کیا آپ مجھے معاف کر سکتی ہیں؟"

اسماء نے قریب ہو کر اسے اپنے بازووں میں بھر لیا۔ "میں اپنی بہن سے بالکل بھی خفا نہیں ہوں۔"

"اسماء! آپ بہت اچھی ہیں۔" اسوہ کے لہجے میں خلوص تھا۔

"آپ بھی۔"

"اچھا ایک بات پوچھوں؟"

"بہنوں کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"شکریہ اسمائ!.... وہ میں نے عمار کے بارے معلوم کرنا تھا۔"

"یقینا اس کے بارے میں آپ سے زیادہ نہیں جانتی۔ بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ اس نے ماضی سے رابطہ توڑ لیا ہے۔"

"شاید آپ سوچ رہی ہوں کہ مجھے اس سے کیا کام ہے۔"

"نہیں۔" اسماء نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ اس کو معذرت کرنا چاہتی ہیں۔"

"میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔" اسوہ آبدیدہ ہو گئی۔

"پریشان نہ ہوں۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔" اسماء نے اسے تسلی دی۔

"صحیح کہا، مگر لگتا ایسا ہے کہ میری معذرت کرنے کی خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔"

"یہ دنیا گول ہے اسوہ! دور بھاگنے والے گھوم پھر کر اسی جگہ آ پہنچتے ہیں کہ جہاں سے بھاگے ہوتے ہیں۔"

"اگر یہ بات مان بھی لوں تو جانے کب وہ وقت آئے اور کیا خبر اس سے پہلے میرا وقت آ جائے۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے میری جان۔" اسماء نے پھر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، چند لمحوں میں قابلِ نفرت اسوہ اسے اتنی پیاری لگنے لگے گی اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

وہ چھٹی کے وقت تک وہیں بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ آخری پیریڈ اٹینڈ کر کے رباب وہاں آن پہنچی۔

"نئی دوستی کی دھن میں پرانی دوستی ہی کو بھلا دیا گیا ہے۔" اس نے آتے ساتھ کہا۔

"آو ؑ رباب!" اسماء نے کھڑے ہو کر اسے خوش آمدید کہا جبکہ اسوہ خفیف انداز میں ہنسنے لگی تھی۔

"نہیں بھئی! میں تو چلی، تھک گئی ہوں۔" رباب نے بیٹھنے سے گریز کیا تھا۔ "بس آپ لوگوں کو صلح کی مبارک باد دینی تھی۔"

"خیر مبارک۔" اسماء جلدی سے بولی جبکہ اسوہ نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

"اوکے جی! کل بات ہو گی۔" رباب ہاتھ لہرا کر جانے لگی۔

"چلو ہم بھی چلیں۔" اسوہ، اسماء سے مخاطب ہوئی۔ اور اسماء نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پارکنگ میں جا کر اسماء نے الوداعی مصافحے کے لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔" اسوہ نے آفر کی۔

"شکریہ، میں چلی جاو□ ں گی۔" اسماء نے تکلف برتا۔

"مجھے خوشی ہو گی۔" اسوہ مصر ہوئی۔

"اسوہ بہن! ہم یونیورسٹی بس کی عادی ہیں"....

"بہن کہہ کر بھی تکلف برت رہی ہو۔" اسوہ نے قطع کلامی کی اور اسماء خفیف انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہم راہ ہولی۔ ڈرائیور نے ادب سے دروازہ کھولا اور اسوہ کے اشارے پر اسماء اندر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے جلدی دوسری طرف کا دروازہ اسوہ کے لیے کھول دیا اور پھر اس کے اندر بیٹھتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

پارکنگ سے گاڑی نکلتے وقت اسوہ اس کے گھر کا پتا معلوم کرنے لگی۔ اور اسماء کا جواب سن کر وہ حیرانی سے بولی ۔"ارے، آپ کا گھر تو میرے رستے ہی میں پڑتا ہے۔"

"چلو یہ اچھا ہوا، آپ کو زحمت نہیں کرنا پڑی۔"

"بس طے ہو گیا۔ آج کے بعد میں خود آپ کو لایا لے جایا کروں گی۔"

"لیکن........؟" اسماء نے انکار کرنے کی کوشش کی، مگر اسوہ اس کی بات قطع کرتے ہوئے حتمی لہجے میں بولی۔

"کہہ دیا ناکہ طے ہو گیا تو بس ہو گیا۔ اور آج کے بعد میں خود ڈرائیو کر کے آیا کروں گی۔ اب جبکہ آپ مل گئی ہیں تو یقیناً ڈرائیور کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

اور اسماء اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے خاموش ہو گئی تھی۔

ایک دن اسماءاور اسوہ یونیورسٹی کے سبزہ زار میں بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں کہ ارشد اپنے ایک دوست کے ہم راہ وہاں سے گزرا۔اس دن اسماءاور اسوہ دونوں نے اتفاق سے سرخ لباس پہنا ہوا تھا،ارشد اپنے دوست کو مخاطب ہوا۔

”ممنون یار!کہیں سبز گھاس کو آگ ہی نہ لگ جائے۔اتنی تپش تو لوہے کو پگھلا دیتی ہے۔“

”ہاہاہا....“ممنون کا قہقہہ بلند ہوا۔

اسوہ ان کی جانب کڑی نظروں سے گھور کر رہ گئی تھی۔

اسماء جلدی سے بولی۔”چھوڑو اسوہ!یہ تو ہے ہی چھچھورا۔“

”میں ایسوں کو سیدھا کرنا جانتی ہوں۔“اسوہ نے دانت پیسے۔

”دفع کرو نا یار!“اسماءنے اپنے دونوں ہاتھ اس کے گالوں پر رکھتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی جانب موڑ دیا۔

اس سے اگلے دن وہ دونوں کیفے ٹیریا کی طرف جا رہی تھیں۔ رباب بھی ان کے ہم راہ تھی۔ ارشد ان کے عقب میں چلتا ہوا اپنے دوست کو کہنے لگا۔

"یار! کسی کسی لڑکی پر ہر رنگ جچتا ہے، چاہے وہ سرخ رنگ کا لباس زیبِ تن کرے یا آسمانی رنگ کا۔"

یہ صریحاً اسوہ کی جانب اشارہ تھا کہ ایک دن پہلے وہ سرخ لباس میں ملبوس تھی اور اس دن آسمانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

اسماء اور رباب، اسوہ کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں، کسی بھی قسم کی بدمزگی کو ختم کرنے کے لیے دونوں نے ایک دم اسوہ کے بازوؤں سے تھام لیا اور اسوہ فقط خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔

ارشد کی طرف سے اس طرح کے اشارے کنائے روز کا معمول بنتے جا رہے تھے۔ اسوہ کی خاموشی سے وہ اور شہہ پا گیا تھا۔ اور اسوہ کو دونوں سہیلیاں قابو کیے ہوئے تھیں۔ خاص کر وہ اسماء کی تو کوئی بات ٹالتی ہی نہیں

تھی۔ کیوں کہ عمار کے متعلق گفتگو کے دوران ایک دن اسماء اس کے حق میں یہ کہتے ہوئے دست بردار ہو گئی تھی کہ....

"اسوہ! بہن میں اسے چاہتی ہوں، مگر اس کے دل پر میری پیاری سہیلی اسوہ کا قبضہ ہے۔ اور کسی کی قبضہ کی ہوئی چیز کے حصول کی تمنا نری بے وقوفی ہے۔" اس دن کے بعد اسوہ کے دل میں اس کی محبت بہت بڑھ گئی تھی۔

مگر ایک دن تو حد ہی گئی۔ پروفیسر ہاشم اپنا لیکچر ختم کر کے کلاس روم سے باہر نکلا، دوسرے پروفیسر کی آمد سے پہلے ارشد نے با آواز بلند اپنے ساتھ بیٹھے دوست کو کہا۔

"ممنون! جی چاہتا ہے کسی کالے کپڑے والی لڑکی کو اٹھا کر دنیا کے اس نکڑے چلا جاو□ ں جہاں بندہ ہو نہ بندے کی ذات۔"

اسوہ کالے لباس میں ملبوس تھی، اس کے علاوہ کسی لڑکی نے کالا لباس پہنا ہوا نہیں تھا۔ وہ غصے میں بپھرتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔

"یو باسٹرڈ!.... تمھاری یہ جرا□ ت۔"

اسماء نے لپک کر اسے تھامنے کی کوشش کی مگر وہ ارشد کی کرسی تک پہنچ گئی تھی۔

اسوہ نے ارشد کو تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ گھمایا مگر اس کا ہاتھ ارشد نے ہوا ہی میں جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ وہ پر نخوت لہجے میں بولا۔

"مس اسوہ! ہر کوئی عمار کی طرح بھیڑ نہیں ہوتا۔"

”چھوڑو میرا ہاتھ کمینے!“ اسوہ نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کرانی چاہی، مگر ایک نازک لڑکی جوان مرد کا مقابلا تو نہیں کر سکتی تھی۔

اسی وقت اسماء بھی ان کے قریب پہنچ گئی تھی۔اس نے ارشد کے ہاتھ کو اسوہ کی کلائی سے علیحدہ کرتے ہوئے واپس جھٹکا۔اور تیش بھرے لہجے میں بولی۔

”شرم تو نہیں آتی ہو گی ایک لڑکی سے ہاتھاپائی کرتے۔“

وہ بھی گرجتے ہوئے بولا۔”تو کیا چپ چاپ چہرے پر تھپڑ کھالوں۔میں عمار کی طرح بے غیرت نہیں ہوں۔“

اسوہ اسے جواب دیتے ہوئے چلائی۔”تم جیسا گھٹیا انسان عمار کی طرح ہو بھی نہیں سکتا۔“

”گھٹیا ہو گی تم، تمھارا پورا خاندان۔“ارشد بھری کلاس میں خاموش رہ کر دوسرے کے مذاق کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

”تمھیں جرات کیسے ہوئی مجھ پر آوازہ کسنے کی۔“

”یار! یہ کیا بے ہودگی ہے، کچھ ہوش کے ناخن لو۔“دو تین لڑکے زبردستی ان کے درمیان میں آ گئے تھے ۔اسماء اور رباب بھی اسوہ کو اپنی نشست کی طرف کھینچ کر لے گئی تھیں۔

”مسٹر ارشد!ساری غلطی تمھاری ہے۔“ مدثر ارشد کو مخاطب ہوا۔”تم اس سے پہلے بھی مس اسوہ پر آوازیں کستے رہے ہو۔“

"اپنے کام سے کام رکھو محترم عاشق صاحب! میں جانتا ہوں تم کن چکروں میں ہو۔" شاید ان کی تند و تیز گفتگو مزید بھی جاری رہتی مگر پروفیسر فرقان کی آمد نے انھیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسوہ نے بہ مشکل آدھا لیکچر سنا اور پھر پروفیسر فرقان کو سر درد کا بہانہ کرتی ہوئی کلاس روم سے باہر نکل آئی۔ پارکنگ میں آتے ہی وہ موبایل فون نکال کر اپنے والد کو کال کرنے لگی۔ اور پھر والد کی "جی پاپا کی جان!" سنتے ہی وہ گلو گیر لہجے میں ساری تفصیل سنانے لگی۔

"یہ وہی بد بخت ہے نا جس نے ایک بار پہلے بھی بد تمیزی کی تھی۔"

نہیں پاپا! یہ وہ نہیں ہے۔ اس کا باپ غالباً پراپرٹی کا کام کرتا ہے اور بیٹا پوری کراچی کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو میں ابھی انسپکٹر راحیل کو کال کرتا ہوں۔ وہ اسے بھی دیکھ لے گا اور اس کے باپ دادا کو بھی۔"

"جی پاپا!" کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس انسپکٹر سے وہ پہلے بھی مل چکی تھی۔ جب اس نے عمار کو گرفتار کرایا تھا۔ وہ انسپکٹر کا انتظار کرنے کے لیے اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ یونھی وقت گزاری کے لیے وہ موبائل فون پر میوزک لگا کر سننے لگی۔ اچانک اس کی نظر سامنے اٹھی اور اسے ایک لڑکا جاتا دکھائی دیا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اسے یوں لگا کہ وہ عمار ہے۔ وہ اس کے پیچھے جانے کے لیے جلدی سے کار سے باہر نکلی۔

وہ اس کے پیچھے جانے کے لیے جلدی سے کار سے باہر نکلی۔، مگر اسی وقت اس کا موبائل بجنے لگا۔ نا معلوم نمبر سے کال آرہی تھی۔ ایک دفعہ وہ کال کو نظر انداز کرنے لگی تھی لیکن پھر اس نے سوچا شاید انسپکٹر ہو۔ اٹینڈ کرنے پر اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

اس کی ”یس؟“ کے جواب میں انسپکٹر کی مودّبانہ آواز آئی۔

”میڈم جی!.... انسپکٹر راحیل عرض کر رہا ہوں۔“

”انسپکٹر صاحب!.... میں پارکنگ میں آپ کی منتظر ہوں۔“ اسے کہہ کر وہ جلدی سے پارکنگ سے باہر نکلی مگر مطلوبہ آدمی غائب تھا۔

”شاید میرا وہم ہو۔“ اس نے مایوسی سے سوچا۔ ”آخر وہ یہاں کیوں آئے گا۔“

دل کے کسی نہاں کونے سے ایک مدہم سی آواز نکلی۔ ”شاید تمھیں دیکھنے آیا ہو۔“ یہ سوچتے ہی وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑی تھی۔

دوبارہ کار کے پاس پہنچ کر وہ انسپکٹر کا انتظار کرنے لگی۔ انسپکٹر کے پہنچنے تک اسوہ کی کلاس کی چھٹی ہو گئی تھی ۔ اسوہ نے ارشد کی نشان دہی کی جو اس وقت اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے میڈم!.... آپ بے فکر ہو جائیں۔ بس یہ بتا دیں کہ اسے تھانے لے کے جانا ہے یا آپ کے دولت خانے پر۔“

”تھانے لے جا کر اس کی اچھی خاطر داری کرو اور اس وقت تک نہیں چھوڑنا جب تک میں یا پاپا میں آپ کو بتا نہیں دیتے۔“

انسپکٹر نے ایک مرتبہ پھر۔ ”یس میڈم!“ کہا اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ یقیناً وہ ارشد کو یونیورسٹی سے باہر گرفتار کرنا چاہ رہا تھا۔

ارشد نے بھی پولیس انسپکٹر کو اسوہ کے ساتھ بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ عجلت میں یونیورسٹی سے نکلا، مگر یہ اس کی بھول تھی کہ وہ پولیس کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یونیورسٹی سے فرلانگ بھر دور ہی انسپکٹر نے اسے دھر لیا تھا۔

"جی انسپکٹر صاحب!" اس نے باوقار انداز میں کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔"

"خیر تو ہے۔" اس کا پر اعتماد انداز برقرار رہا۔

"یہ بات وہاں جا کر ہو گی۔" کہہ کر انسپکٹر اس کے ساتھ ہی کار میں بیٹھ گیا۔ "پولیس کی جیپ کے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔"

"انسپکٹر صاحب!.... یہاں بھی مک مکا ہو سکتا ہے۔" اس نے کار آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تمھیں شاید عزت سے جانے میں کوئی قباحت ہو رہی ہے۔" انسپکٹر کا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ وہ مزید وہاں رکا رہ سکتا۔ اس نے اپنی کار پولیس کی جیپ کے پیچھے لگا دی۔

"انسپکٹر صاحب!.... یاد رکھنا میں ملک طاہر جواد کا بیٹا ہوں اور"........

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے انسپکٹر راحیل کا ہاتھ اس کی گردن پر پڑا۔

"دوبارہ آواز نکالی تو کار کے پیچھے باندھ کر دوڑاتا ہوا تھانے تک لے جاو□ ں گا۔"

ارشد ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ اور تھانہ آنے تک خاموش رہا۔

تھانے کے احاطے میں جیپ روکتے ہی سپاہی ارشد کی کار کے پاس آ گئے تھے۔ارشد کی نظر اسوہ کی کار پر جا رکی جو ان سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔انسپکٹر نے بھی اسوہ کی کار پہچان لی تھی۔اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ ارشد کو بے دردی سے دھکیلتے ہوئے تھانے میں داخل ہوئے۔

"اسے حوالات میں بند کر کے اس کی خاطر مدارت کرو۔" سپاہیوں کو کہتے ہوئے وہ اپنے دفتر کی جانب بڑھ گیا جہاں اسوہ منتظر بیٹھی تھی۔

"میڈم!آپ نے کیوں زحمت کی۔"وہ اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"انسپکٹر صاحب!اسے کسی صورت میں بھی رہا نہیں ہونا چاہیے اور نہ اس کی خاطر مدارت میں کوئی کمی ہونی چاہیے۔باقی آپ کی اس کارکردگی پر پاپا کے علاوہ میری طرف سے بھی خصوصی انعام ملے گا۔"

"میڈم ! آپ کی خوش نودی ہی میرے لیے انعام ہے۔اور آپ فکر ہی نہ کریں اس کا تو وہ حال کریں گے کہ آئندہ نسلوں کو بھی نصیحت کرے گا کہ کسی لڑکی کو نہ چھیڑنا۔"

"اچھا چلو میرے ساتھ میں اسے ایک نظر دیکھ کر واپس جاؤں گی۔"

"جی میڈم!" کہہ کر وہ اسوہ کے ساتھ ہو لیا۔جب وہ حوالات کے دروازے پر پہنچے سپاہیوں نے ٹھڈے ، تھپڑ مار مار کر ارشد کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

"ارے رررے۔یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔" اسوہ نے مصنوعی افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔"آپ لوگ جانتے نہیں ارشد صاحب کتنے بڑے آدمی ہیں۔"

"مس اسوہ! یاد رکھنا میں زیادہ دیر یہاں نہیں رہوں گا۔ اور باہر نکل کر میں دیکھ لوں گا تمھارے ساتھ بھی ۔" ارشد نفرت بھرے لہجے میں چلایا تھا۔

"سن لیا انسپکٹر صاحب!" اسوہ انسپکٹر کو مخاطب ہوئی۔ "یہ آپ کے سامنے ایک شریف لڑکی کو دھمکیاں دے رہا ہے۔ اسی بات سے آپ اندازہ لگا لیں کہ اس نے یونیورسٹی میں میرے ساتھ کتنی بدتمیزی کی ہوگی۔"

"میڈم!.... بس آج کی رات انتظار کر لیں، کل اگر اس کے منہ سے ذرا بھی بکواس سن لو تو میں اپنی مونچھیں گدھے کے پیشاب سے مونڈ دوں گا۔"

"انسپکٹر!.... یاد رکھنا میں لاوارث نہیں ہوں۔" وہ انسپکٹر کو بھی دھمکی دینے سے باز نہیں آیا تھا۔

"اوے تم لوگ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟" اس مرتبہ انسپکٹر سپاہیوں پر برس پڑا۔ وہ اسوہ کے بات کرنے کی وجہ سے آرام سے کھڑے ہو گئے تھے۔ انسپکٹر کی جھاڑ سنتے ہی چیلوں کی طرح ارشد پر جھپٹے، مگر اسوہ جلدی سے بولی۔

"ایک منٹ، ایک منٹ۔" اور وہ سارے چابی بھرے کھلونے کی طرح ایک دم ساکت ہو گئے۔

"انسپکٹر صاحب! اس کی عزت افزائی رات کو کرنا۔ بلکہ پوری رات کرنا۔ فی الوقت اس کا موبائل فون اس کے حوالے کرو، تاکہ اس کے دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ یہ جس کو مرضی ہے کال کرے اسے کھلی چھوٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے میڈم!" انسپکٹر سعادت مندی سے بولا۔

"اور آپ کو جس آفیسر کا فون بھی موصول ہو، اس سے بحث نہیں کرنا بس پاپا جان کو اس آفیسر کے بارے مطلع کر دینا۔"

"جی میڈم!" اس مرتبہ بھی انسپکٹر نے ماتحتوں کے انداز میں سر ہلایا۔

"اوکے، میں چلوں گی۔" اسے کہہ کر اسوہ، ارشد کو مخاطب ہوئی۔ "مسٹر ارشد! تمھارے پاس چند گھنٹے ہیں ،اگر خود کو رہا کرا سکتے ہو تو خوش آمدید۔ صبح یونیورسٹی میں ملاقات ہو گی۔ دوسری صورت میں کل یہیں تمھاری بے بسی کا تماشا دیکھنے آؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ تھانے سے نکل آئی۔

☆☆☆

پہلے مہینے عمار کو کافی خسارہ ہوا تھا۔ کام کرنے والے آدمیوں کی اجرت اسے اپنے پلے سے دینا پڑ گئی تھی۔ مگر وہ ہمت ہارے بغیر کام میں جتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کا دھندہ خسارے سے نکل کر برابری کی سطح پر پہنچا اور پھر منافع کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔ چھے ماہ کے اختتام پر اس نے حساب کیا تو وہ دو لاکھ کے قریب منافع کما چکا تھا۔ اس دوران اسے مزید تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔ اور سبزی منڈی میں اس کے کئی دوست بھی بن گئے تھے، جو برس ہا برس سے اسی کام سے منسلک تھے۔ ان سے بات چیت اور ان کے تجربے کو دیکھ کر اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اس منافع کو زیادہ سے زیادہ چند لاکھ تک مزید بڑھا سکتا تھا۔ گویا سخت محنت کے بعد وہ ماہانہ ایک لاکھ یا اس سے کچھ کم زیادہ منافع کما سکتا تھا۔ اور یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ اسے دولت مند بننا تھا۔ اتنا کہ اسلم شکور خان کی

امارت بھی اس کے سامنے ہیچ ہو۔ اتنا کہ اسوہ اس سے نظریں نہ ملا سکے۔ اور یہ دولت مندی موجودہ کاروبار میں ممکن نہیں تھی۔ وہ چپکے سے اس کام سے علاحدہ ہو گیا۔

اگلے دن وہ اپنے باپ کے سامنے وضاحت کر رہا تھا۔

"ابو جان چھے ماہ میں کم و بیش دو لاکھ کمانے کا مطلب ہے ماہانہ تیس سے پینتیس ہزار کمانا۔ اور میں اگر جان توڑ کر محنت کر لوں اس کے بعد بھی یہ منافع زیادہ سے زیادہ لاکھ روپے ماہانہ تک لے جا سکتا ہوں، جبکہ میری منزل اس سے کہیں آگے ہے۔"

"تو....؟" بشیر احمد سادگی سے مستفسر ہوا۔

وہ اطمینان سے بولا "تو یہ کہ میں نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ اب کوئی دوسرا کاروبار کروں گا۔"

"بڑی مہربانی کہ تم نے مجھے اتنا بتانا تو گوارا کر لیا۔" بشیر احمد نے منہ بنایا۔

"ابو جان!.... آپ تو بس خواہ مخواہ ہی خفا ہو جاتے ہیں؟ میں کوئی بے کار نہیں بیٹھ رہا بلکہ ایک اور کاروبار ڈھونڈ لیا ہے میں نے۔"

"مجھے سن کر اچھا لگے گا۔"

"ابو جان میرے پاس ستائیس لاکھ کے قریب رقم موجود ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں بیس آٹو رکشے خرید کر کرائے پر دے دوں۔ ایک رکشے کا ماہانہ کرایہ آٹھ ہزار کے بہ قدر ملتا ہے، گویا بیس رکشوں کا ایک لاکھ ساٹھ ہزار مل جائے گا اور اس رقم سے ایک اور رکشا خرید کر میں بچ جانے والی رقم اکاؤنٹ میں جمع کرتا جاؤں

گا۔ مجھے امید ہے جلد ہی یہ منافع اس نہج پر پہنچ جائے گا کہ کوئی بڑی گاڑی خرید سکوں اور پھر آہستہ آہستہ ٹرانسپورٹ کمپنی قائم کر لوں گا۔"

"نہیں۔" بشیر احمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں کئی ایک قباحتیں ہیں؟"

مثلاََ ....؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ضروری نہیں تمھارے سارے رکشے کرایا پر لگ جائیں۔ دوسرا بھتامافیا تمھاری جان کو آ جائے گی آئے روزان کے مطالبات پورے کرتے رہو گے۔ اس کے ساتھ جس کسی کو رکشا دو گے اس سے رکشے کا ماہانہ کرایا وصول کرنا بھی اتنا آسان نہ ہو گا۔ اس کام کے لیے تمھیں تنخواہ پر آدمی رکھنے پڑیں گے۔ پھر ، رکشا ڈرائیور غریب لوگ ہوتے ہیں، ان کے ہزار قسم کے مسائل بھی آپ کو ساتھ لے کر چلنے ہوں گے اور سب سے بڑھ کر ہر ماہ ان میں سے کوئی نہ کوئی رکشا خراب ضرور ہو گا جس کی مرمت وغیرہ مالک ہی کو کرانا پڑتی ہے۔ اس لیے یہ کام رہنے دو، کیونکہ اس میں بھی بس اتنا ہی منافع ہو گا کہ آپ اچھا کھا پی سکیں۔ جائیداد وغیرہ بنانا اس میں بھی محال ہے۔"

"بچے کا دل ہی توڑ دیا آپ نے۔" عمار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

بشیر احمد ترکی بہ ترکی بولا۔ "یہ وہی بچہ ہے نا، جس نے ماں باپ کو بے گھر کر دیا ہے۔"

"اچھا اگر رکشے نہ خریدوں تو پھر کون سا کاروبار شرع کروں۔"

"خود بھگتو میاں!.... مجھے معاف رکھو۔"

”ویسے پراپرٹی ڈیلر بننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں،اس کام میں منافع بھی کافی زیادہ ہے۔“

”میاں!....ہوش کے ناخن لو۔پراپرٹی کی خرید و فروخت کے لیے سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے۔“

وہ جلدی سے بولا۔”میں چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کروں گا۔“

”جی جی برخوردار!.... تمھارا گھر چھوٹا سا ہی تھا۔اور اسے بیچ کر تمھیں جو رقم ملی تھی امید ہے اس سے اب وہی گھر نہیں ملے گا۔“

وہ زچ ہو کر بولا۔”تو پھر میں کیا کروں۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کاروبار وغیرہ کا گھن چکر تمھارا اپنا فیصلہ تھا۔میں نے اس وقت تمھیں منع کیا تھا۔اور اگر تم سچ مچ ہی تنگ آ گئے ہو تو دوبارہ یونیورسٹی جوائن کر لو۔اس سے بہتر مشورے کی توقع مجھ سے نہ رکھنا۔“

”ہا....ہا....ہا....مذاق کر رہا تھا ابو جان!....میں نے کاروبار سوچا ہوا ہے۔“

”تو وہ رکشے خریدنے والا مشورہ چسکے لینے کے لیے کیا تھا۔“

”نہیں،وہ بھی مد نظر تھا اور اس کے علاوہ بھی کچھ سوچا ہوا ہے۔“

مثلاََ....“بشیر احمد نے جاننے میں دل چسپی ظاہر کی۔

”سوری ابو جان!....میں نہیں بتاتا۔یوں بھی آپ نے تو قسم کھائی ہوئی ہے میرا دل توڑنے کی۔“

”ٹوٹی ہوئی چیز کا کیا توڑنا برخوردار!....یہ کام مجھ سے پہلے اسوہ بی بی کر چکی ہے۔“ ہنس کر کہتے ہوئے بشیر احمد دفتر جانے کے ارادے سے وہاں سے اٹھ گیا۔مگر اس کی مذاق میں کہی ہوئی بات نے عمار کی سوچ کا دھارا اسوہ

کی جانب موڑ دیا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے اسوہ کو دیکھنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ وہ دشمن جاں، اب تک اس کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوئی تھی۔ اب بھی کاروبار کے بارے نت نئے منصوبے بناتے ہوئے اس کی یاد ہلکی سی چٹکی لیتی تو وہ سنجیدہ منصوبے کو پس پشت ڈال کر اس کی یادوں میں کھو جاتا۔ گو اس کے پاس اسوہ کی یادوں کے نام پر فقط تلخیاں، نفرتیں اور حقارتیں ہی موجود تھیں مگر پھر بھی اس کی شکل کو بھلا نہیں پایا تھا۔ کسی مفکر کا قول ہے کہ انسان محبت کو بھلا نہیں سکتا بس بھلانے کی اداکاری کر سکتا ہے۔

وہ دن اس کے آرام کا تھا مگر اس نے آرام کرنے کے بجائے یونیورسٹی جانے کا ارادہ کر لیا۔ یونیورسٹی پہنچنے کا سب سے بہترین وقت وہی ہوتا جب اسوہ چھٹی کر کے کلاس روم سے نکلتی تھی۔ اس وقت اس نے یقینی طور پر پارکنگ ایریا میں اپنی کار کے پاس آنا ہوتا تھا۔

وہ اس وقت یونیورسٹی پہنچا جب اس کی کلاس کا سیکنڈ لاسٹ پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ چونکہ کبھی کبھی اسوہ ایک ادھ پیریڈ پہلے چھٹی کر لیتی تھی اس لیے وہ ایسے وقت پہنچا تھا کہ اگر وہ آخری پیریڈ اٹینڈ نہ کرتی تب بھی وہ اس کے دیدار سے اپنی نگاہیں سیراب کر لیتا۔ اپنے چہرے کے گرد اس نے مفلر لپیٹا ہوا تھا۔

اور پھر وہ اس کی کار کے آس پاس کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس نے دور سے اسوہ کو آتے دیکھا۔ وہ کالے رنگ کے لباس میں کسی اور دنیا ہی کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ شانوں پر بکھرے کالے سیاہ بال دیکھ کر اس کے دل میں بے ساختہ کسی دل جلے کا شعر گونجا....

سر سے گرتی ہیں تو شانوں پہ بکھر جاتی ہیں

تم نے زلفوں کو بڑا سر پہ چڑھا رکھا ہے

پارکنگ میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے سیل فون پر کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ وہ جلدی سے ایک موٹر سائیکل کے اگلے پہیے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اگر اس وقت موٹر سائیکل کا مالک وہاں آجاتا تو یقیناً عمار کی شامت آجاتی۔ مگر اسوہ کو قریب سے دیکھنے اور اس کی آواز سننے کی لگن اور شوق نے اس کے ذہن سے ہر اندیشہ محو کر دیا تھا۔

"پاپا!.... ایک خبیث لڑکے نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ میری کلائی کو پکڑ کر مروڑا ہے اور..........." وہ اپنی کار کے ساتھ کھڑے ہو کر والد کو تفصیل بتانے لگی۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر موٹر سائیکل کے پہیے کے ساتھ چھیڑ خانی کرتا عمار اس کی ساری گفتگو سنتا رہا۔ اسے ارشد پر غصہ آرہا تھا جس نے اسوہ کی نازک کلائی کو پکڑ کر مروڑا تھا۔

اپنی بات ختم کر کے وہ دوسری طرف کی بات سننےلگی۔ اور پھر جواباً بولی۔

نہیں پاپا!.... یہ وہ نہیں ہے۔ اس کا باپ غالباً پراپرٹی کا کام کرتا ہے اور بیٹا پوری کراچی کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔"

یقیناً اس کے باپ نے عمار کے متعلق دریافت کیا تھا۔ جو اسے وضاحت کرنا پڑی تھی۔

پھر اپنے والد کی بات سن کر اس نے "جی پاپا۔" کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر کسی کا انتظار کرنے لگی۔ جبکہ عمار اس پر آخری نگاہ ڈال کر وہاں سے چل پڑا۔ اب مزید رک کر وہ اپنی پہچان کو یقینی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اگر اسوہ اسے وہاں دیکھ لیتی تو شاید ارشد کے ساتھ اسے بھی حوالات کی سیر کرنا پڑتی۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ وہی تیور، وہی مزاج، وہی غصہ۔ اور اتنی ہی پیاری جتنا کہ وہ اسے پہلی نگاہ میں لگی تھی۔

☆☆☆

”مسٹر تھانے دار!.... تمھیں جرا□ ت کیسے ہوئی میرے بیٹے کو گرفتار کرنے کی؟“ ارشد کے باپ ملک طاہر جواد نے، تھانے میں داخل ہوتے ہی ہنگامہ کر دیا تھا۔

انسپکٹر راحیل اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھا اس کا واویلا سنتا رہا۔

”تم جانتے نہیں میں کون ہوں.... میں ایک فون کال کر کے تمھاری پیٹی اتروا سکتا ہوں۔ اگر عزت مطلوب ہے تو فی الفور میرے بیٹے کو رہا کرو۔“

”اگر تمھارا غصہ اتر گیا ہو تو اپنا تعارف کرا دو؟“ اس کی زبان کی بریک لگتے ہی انسپکٹر راحیل سکون بھرے انداز میں پوچھا۔

”میرا نام ملک طاہر جواد ہے۔ اور پولیس نے بے جا میرے بیٹے کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔ میں.... میں.... میں تم پر مقدمہ کر دوں گا۔“

”تو کرو۔ روکا کس نے ہے۔“

”دیکھو انسپکٹر صاحب!.... یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں۔“ اس کے اطمینان بھرے انداز نے ملک طاہر کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ملک صاحب! مناسب کیا ہے اور غیر مناسب کیوں ہے، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آپ کے بیٹے سے جرم سرزد ہوا ہے اور سزا بہ ہر حال بھگتنی پڑے گی۔“

”کیا جرم کیا ہے، اپنی کلاس فیلو لڑکی کے ساتھ مذاق کرنا کون سا جرم ہے؟“

"تو یہ بات آپ اس کو کیوں نہیں سمجھاتے جس کے ساتھ کہ مذاق ہوا ہے۔ پولیس کا کام تو رپورٹ درج کرنا اور ملزم کو پکڑنا ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑیں انسپکٹر صاحب!.... جرمانہ فیس بتائیں اور اس کیس کو یہیں دفن کریں۔"

"شاید یہ میرے لیے ممکن نہ ہو۔" انسپکٹر راحیل رکھائی سے بولا۔

"مطلب مفت رہا کرنے کا ارادہ ہے۔"

"نہیں ملک صاحب! ایسا کوئی ارادہ ہے ہی نہیں۔"

"میرا خیال ہے ایس پی صاحب سے بات کرنا پڑے گی۔"

"اب تک کر لینی چاہیے تھی۔" انسپکٹر راحیل کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سرائیکی کی کہاوت ہے کہ "بھینس کا بچہ اینٹھی کے زور پر کودتا ہے۔" اور انسپکٹر راحیل کی اینٹھی بہت مضبوط تھی۔

ملک طاہر موبائل فون نکال کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"وعلیکم اسلام!.... جی ایس پی صاحب! کیسے ہیں آپ؟"

"بس ایک چھوٹا سا مسئلہ درپیش ہے...." انسپکٹر راحیل اس کی یک طرفہ گفتگو سنتا رہا۔ ساری تفصیل سنانے کے بعد اس نے اپنا موبائل فون انسپکٹر راحیل کی جانب بڑھایا۔

"ایس پی صاحب، آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

موبائل فون لے کر وہ مودّبانہ لہجے میں بولا۔ "جی سر!.... انسپکٹر راحیل عرض کر رہا ہوں۔"

"راحیل صاحب!....ملک طاہر میرے بہت اچھے دوست ہیں، امید ہے آپ ان کا خیال رکھیں گے۔"

"سر جی!.... آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ملک صاحب کو کبھی بھی آپ کو کال کرنے کی زحمت نہ دیتا، مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بیٹے نے اسلم شکور خان کی بیٹی کو چھیڑا ہے۔ اور سیٹھ صاحب سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔"

"اوہ!...." ایس پی کی تحیر بھری آواز ابھری۔ "اوکے راحیل صاحب! شکریہ۔ آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

"یہ لیں ملک صاحب!" اس نے موبائل فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب آپ یوں کریں کہ ڈی آئی جی یا پھر براہ راست آئی جی صاحب کو شکایت کر لیں۔"

یہ بات انسپکٹر راحیل نے مزاحیہ لہجے میں کہی تھی مگر بات ایسی تھی کہ ملک طاہر جواد سر تا پا سلگ کر رہ گیا تھا۔

اس کے چہرے پر خفت و ذلت کے آثار دیکھ کر انسپکٹر راحیل نے ہمدردانہ انداز میں مشورہ دیتے ہوئے کہا

...."ملک صاحب!....دائیں بائیں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بہتر ہے کہ آپ خود جا کر اسلم شکور صاحب سے مل لیں۔ وہ کیا بھلی سی کہاوت ہے لاٹھی اور بھینس والی۔ تو بھائی اب لاٹھی اسلم شکور صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے ۔اس لیے پولیس کے کسی عہدہ دار نے آپ کی بات نہیں سننی۔"

"انسپکٹر صاحب!....اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میرے جانے کے بعد آپ تفتیش کے نام پر میرے بیٹے کو زدو کوب نہیں کریں گے۔"

"تفتیش تو آپ کی موجودی میں بھی ہو سکتی ہے، بلکہ ہو گی۔ کیونکہ اس کام کے ہمیں پیسے ملے ہیں۔"

”میں آپ کو منہ مانگی رقم ادا کر سکتا ہوں۔“

”ملک صاحب!.... آپ دیر کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اسلم شکور صاحب آپ کی بات مان جائے۔ باقی جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری آپ سے ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو بس حکم کا غلام ہوں۔“

اس مرتبہ بات ملک طاہر جواد کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ مستفسر ہوا۔ ”کیا آپ اس کے گھر کا پتا بتا سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ انسپکٹر راحیل نے اسلم شکور کی کوٹھی کا محل وقوع دہرا دیا۔

☆☆☆

”کیا آپ کی ملاقات پہلے سے طے ہے؟“ اسلم شکور خان کا چوکیدار ملک طاہر سے مستفسر ہوا۔

”نہیں، لیکن آپ خان صاحب کو بتا دیں کہ ملک طاہر جواد پراپرٹی ڈیلر آیا ہے۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر چوکیدار انٹر کام پر اپنے کسی سینئر کو یہ بات بتانے لگا۔ چار پانچ منٹ بعد انٹر کام کی گھنٹی بجی چوکیدار نے کال اٹینڈ کی اور ”جی اچھا“ کہہ کر اس نے رسیور واپس کریڈل پر رکھا اور باہر نکل آیا۔ ملک طاہر جواد کی کار کی سرسری تلاشی لے کر اس نے دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔

وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہو کر ملک طاہر جواد سرخ بجری کی چوڑی روڈ پر آگے بڑھتا گیا روڈ کے اختتام پر گیراج بنا تھا جس میں اس وقت چار قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اپنی کار گیراج سے باہر کھڑی کر کے وہ نیچے اترا ۔اسی وقت ایک معزز سے جوان نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”اسلام علیکم سر!.... میرا نام احتشام ہے اور میں اسلم شکور خان صاحب کا پرسنل سیکرٹری ہوں۔“

”وعلیکم اسلام!....میں ملک طاہر جواد۔“وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جواباً بولا۔

”سر!.... آپ کی آمد کی غرض وغایت جان سکتا ہوں؟“

وہ مختصراً بولا۔”ذاتی کام ہے۔“

ایک لمحہ سوچنے کے بعد احتشام سر ہلاتا ہوا بولا۔”آئیں سر“!

ملک طاہر خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سجے سجائے پر تعیش ڈرائینگ روم میں موجود تھا۔ اسے وہاں بٹھا کر احتشام اسلم شکور خان کو اطلاع دینے چلا گیا۔

چند منٹ بعد ایک ملازم چائے اور مختلف لوازمات سے بھری ٹرالی کے ساتھ نمودار ہوا اور ملک طاہر کے سامنے سنٹر ٹیبل پر اس نے خاموشی سے لوازمات سجانے شروع کر دیے۔

”سر چینی کتنی ڈالوں؟“ چائے بناتے ہوئے اس نے مودّبانہ لہجے میں پوچھا۔

”ایک چمچ۔“

چائے بنا کر اس نے ملک طاہر کے سامنے رکھی اور جس خاموشی سے آیا تھا اسی طرح واپس لوٹ گیا۔

وہ بہ مشکل چائے کی پیالی ختم کر سکا تھا کہ اسلم شکور خان موسم کی مناسبت سے ہلکا پھلکا لباس پہنے نمودار ہوا۔ گو ملک طاہر اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا مگر اس کی پر رعب شخصیت نے بغیر کسی شائبے کے اپنی پہچان کرا دی تھی۔ وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھو۔“ اس سے مصافحہ کر کے اسلم شکور نے بھی اس کے سامنے نشست سنبھال لی تھی۔

"شکریہ سر!" کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔

"جی؟" اسلم شکور نے اسے بات کرنے کا اشارہ کیا۔

"خان صاحب!.... میں ارشد کا والد ہوں۔"

"ارشد۔" اسلم شکور کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"جی ارشد، وہ آپ کی بیٹی کا کلاس فیلو ہے۔"

"اوہ!.... کہیں یہ وہ تو نہیں جس نے بے بی سے بدتمیزی کی ہے۔" اسلم شکور خان تیکھے لہجے میں مستفسر ہوا تھا۔

"جی آپ کو تو یہی اطلاع ملی ہوگی، مگر اصل میں تو یہ مسایل نوجوانوں کے روز کا معمول ہیں۔"

"مجھے یہ اطلاع اپنی بیٹی سے ملی ہے۔ کیا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

"نہیں سر!.... جھوٹ نہیں بول رہی، وہ بھی حق بہ جانب ہے۔ کیونکہ جب غصہ آئے تو پھر انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"غصہ کسی وجہ ہی سے آتا ہے۔"

"خان صاحب!.... نوجوانوں کو غصہ بھی ذرا سی بات پر آتا ہے اور پھر راضی بھی جلدی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمیں تھانے کچہری کا رخ نہیں کرنا چاہیے۔"

”مسٹر طاہر!.... تمھارے نزدیک یہ چھوٹی بات ہو گی میرے لیے نہیں۔اور میرا خیال ہے تمھاری آمد کی غایت یہی چھوٹی سی بات تھی۔اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمیں وقت ضایع نہیں کرنا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے اسلم شکور خان کھڑا ہو گیا۔

ملک طاہر گھبرا کر بولا۔”سر!آپ میری بات تو سنیں۔“

”اورہاں،اگر مزید چائے پینا ہو تو ملازم کو کہہ دینا۔“اس کی درخواست ان سنی کر کے وہ وہاں سے چل دیا۔

”خان صاحب!....بات سنیں....؟“ملک طاہر جواد نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ ڈرائینگ روم سے نکل گیا۔

طاہر سر پکڑے وہیں بیٹھ گیا تھا۔اسلم شکور پر اسے سخت غصہ آرہا تھا مگر وہ مجبور تھا۔اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

اسی وقت اسلم شکور کا سیکرٹری احتشام اندر داخل ہوا۔

ملک طاہر جلدی سے بولا۔”احتشام صاحب!....میں خان صاحب سے دوبارہ ملنا چاہوں گا۔“

”سوری سر!....اب شاید یہ ممکن نہ ہو۔“

”کیوں؟“

”کیوں کا تو پتا نہیں....لیکن یہاں حکم صرف خان صاحب کا چلتا ہے اور انھوں نے آپ سے ملنے سے منع فرما دیا ہے۔“

ملک طاہر ہونٹ بھینچتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی گاڑی واپس تھانے کی جانب اڑی جا رہی تھی۔

اس کا والد بھرپور کوشش کے باوجود اسے رہا کرانے میں ناکام رہا تھا۔ انسپکٹر راحیل کا دل نہ تو اس کی منتوں سے پسیجا تھا اور نہ اس کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہوا تھا۔ مجبوراً اسے اپنے بیٹے کو پولیس والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ کہیں بھی اس کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ اسلم شکور خان جیسے مگرمچھ کے سامنے اس کے سارے تعلقات، ساری سفارشیں ساری دولت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

رات گئے ارشد کو حوالات سے باہر نکال کر پولیس والے اسے تفتیش کے کمرے میں لے گئے تھے۔ وہ ارشد کی زندگی کی طویل اور بھیانک ترین رات تھی۔ پولیس والوں نے جانے کس کس جرم کا حساب لیا تھا۔ وہ کئی مرتبہ بے ہوش ہوا تھا۔ مگر وہ اس پر پانی کا جگ ڈال کر پھر جگا لیتے تھے۔ اس کی ساری اکڑفوں، ساری شیخی، ساری بڑھکیں چیخوں، کراہوں اور آہوں میں بدل گئی تھیں۔ رات کے دو بجے انسپکٹر راحیل عقوبت خانے میں داخل ہوا اور اس کے اشارے پر ارشد کو زدوکوب کرتے دونوں سپاہیوں کے ہاتھ چابی کے کھلونے کی طرح ساکت ہو گئے۔

"ملک صاحب! شاید اب تمھیں پتا چل گیا ہو گا کہ میڈم □ سے کس طرح گفتگو کرنا ہے۔" وہ بولنے کے قابل نہیں تھا مگر سپاہیوں کے وحشیانہ تشدد سے بچنے کے لیے بہ دقت تمام بولا۔

”مجھے معاف کر دو انسپکٹر صاحب! میرے باپ دادا کی توبہ۔ اگر اس کے بعد آپ کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی بولوں تو گردن اتار دینا۔“

”گڈ۔“ انسپکٹر راحیل خوشی سے چہکا۔ ”مطلب اب تمھیں آرام دینا پڑے گا۔“

جواباً وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا تھا۔

”ویسے میں ضرور تمھیں آرام دے دیتا، مگر سوری یار! میڈم کا حکم تھا کہ پوری رات تمھاری سیوا کی جائے۔ اس لیے معافی چاہتا ہوں۔“ اسے کہہ کر وہ جلاد سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اپنا کام جاری رکھو دوستو۔“

”خدا کے واسطے انسپکٹر صاحب! اگر میڈم صاحب کو ذرا بھی شکایت کا موقع دیا تو کل رات جو چاہے سزا دے لینا، مگر اس وقت مہربانی فرماو ٔ مجھ میں مزید برداشت نہیں ہے۔“

”کل کی کل دیکھی جائے گی۔“ انسپکٹر راحیل یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ دونوں جلاد دوبارہ اپنی کارروائی میں مشغول ہو گئے۔ اور عقوبت خانہ ارشد کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر اس کے والد نے اسے ارشد کے والد کی آمد کا بتایا اور یہ بھی کہ اس نے اسے کیا جواب دیا۔

”بہت اچھا کیا پاپا! دو تین دن تھانے میں گزارے گا تو اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ لڑکیوں سے کیسے گفتگو کی جاتی ہے۔“

”دو تین دن کیوں، مہینا بھر تو ہونا چاہیے۔“

وہ ہنسی۔ ”نہیں پاپا! بس دو تین دن کافی ہیں۔“

”پھر کون سا نیا مسئلہ پیدا کر دیا ہے؟“ اس کی ماں پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں مما! آپ کے مطلب کی بات نہیں ہے۔“

”لڑکی! کچھ ہوش کے ناخن لو، تم روز بہ روز بگڑتی جا رہی ہو۔“

اس نے منہ بنایا۔ ”مما! آپ بھی بس ہر وقت ڈانتی رہتی ہیں۔“

اس کی ماں نسرین بیگم نے کہا۔ ”تو تم ایسے کام نہ کرو۔“

”کیا کر دیا ہے ہماری گڑیا نے، بیگم!“ اسلم شکور فوراً اپنی بیٹی کی طرف داری کرنے لگا۔

”مجھے کیا پتا ہے، آپ دونوں ہی شروع تھے۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ جتنا جلدی ہو سکے اس کی شادی کر دو اتنے اچھے اچھے رشتے آ رہے ہیں۔ تعلیم کا کیا ہے شادی کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہے۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے بیگم!....“ اختر محمود نے ہنس کر جواب دیا۔

”پاپا مجھے اجازت دیں۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی کیونکہ اس کا ناپسندیدہ موضوع شروع ہو گیا تھا۔ اپنی شادی کی بات تو اسے عمار سے محبت ہونے سے پہلے بھی بری لگتی تھی۔ اب تو ماں کی ان باتوں پر اس کا سانس رکنے لگتا تھا۔ گو وہ جانتی تھی کہ ماں اس کی شادی کی بات تب ہی چھیڑتی ہے جب اس کا کسی سے لڑائی جھگڑا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس ضمن میں اس کے باپ کی رائے بالکل متضاد تھی، مگر اس کے باوجود وہ اپنی شادی کی بات

سنتے ہی بھاگ جاتی تھی۔اور اس کی ماں کی نظر سے اس کی یہ کمزوری اوجھل نہیں تھی۔وہ بھی بس اسے تنگ کرنے کے لیے یہ موضوع چھیڑ دیتی اور اسوہ کو بھاگنا پڑتا۔

بستر پر لیٹتے ہی عمار کا خیال دھم سے اس کے دماغ میں آن گھسا تھا۔اس کے ساتھ ہی اسے آج کا واقعہ یاد آیا۔

اس لڑکے کی چال ڈھال اور جسامت بالکل عمار کے جیسے تھی۔ مگر اس کے ساتھ اسے عمار کا آخری دنوں کا رویہ یاد آیا، محبت تو کجا وہ اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

"کیا اس کے دل سے میری محبت ختم ہو گئی ہو گی؟" اس نے خود سے سوال کیا۔اور اسے ہنسی آگئی۔

"جو شخص اپنی پڑھائی درمیان میں چھوڑ کر اس لیے چلا گیا ہو کہ وہ میری شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔میں اس کے بارے سوچ رہی ہوں کہ کیا اس کے دل سے میری محبت ختم ہو گئی ہو گی۔" ایسا سوچنا ایک لطیفہ ہی تو تھا۔

مگر اس کے ساتھ اسماء اور مدثر کی تسلیوں کو وہ کہاں لے جاتی۔ گو وہ یہ مانتے تھے کہ عمار کے یونیورسٹی چھوڑ کر جانے کی اصل وجہ اسوہ تھی۔ لیکن وہ دونوں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ عمار اس سے نفرت کرنے لگ گیا تھا۔بلکہ اس کے جانے کو بھی وہ عمار کی محبت گردانتے تھے کہ اس نے محبوب کی خواہش پر سرِ تسلیم خم کیا تھا

۔

وہ سوچتی رہی، مختلف خیالات اس کے دماغ میں سرگرداں رہے۔وہ اپنے دل کی حالت پر سخت حیران تھی کہاں عمار سے اتنی نفرت، کہ اس کا دیکھنا بھی اسے برا لگتا تھا اور اب اس کی ایسی محبت کہ محسوس ہوتا اسے صدیوں سے چاہتی رہی ہو۔

اسے یاد آیا کہ اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میرے علاوہ کبھی کسی سے شادی نہیں گا۔شاید یہ بات تو اسے بھول ہی گئی ہو۔ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

اسے عمار کی آخری نگاہ یاد آئی۔اس وقت اگر وہ اسے روک لیتی تو یقیناوہ یونیورسٹی چھوڑ کر نہ جاتا۔بلکہ اس واقعے کے بعد بھی وہ چند دن تک یونیورسٹی آتا رہا تھااور پھر آخری دن اپنی نظم کے ذریعے اسے جتا بھی گیا تھا کہ وہ محبت سے تھک گیا تھا۔

"اسے تھکنا ہی چاہیے تھا، میں اتنی سخت دل جو ہو گئی تھی۔یا پھر دولت کی ریل پیل نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ماند کر دی تھیں، کہ مجھے کسی کی پر خلوص چاہت بھی سجھائی نہ دی۔یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ خود میرے دل میں اس کی محبت پوشیدہ ہے۔"وہ خود کو کوستی رہی،دوش دیتی رہی،اپنے ماضی پر پچھتاتی رہی،مگر اب چڑیاں کھیت چگ کر جاچکی تھیں۔اب کفِ افسوس ملنے سے کچھ ہاتھ نہیں آنے والا تھا۔

آخر نیند کی مہربان دیوی کو اس پر ترس آ گیا لیکن دماغ کے اندر سر گرداں الٹے سیدھے خیالوں نے خواب کی شکل دھار کر اسے بے چین رکھا۔صبح بھی سویرے سویرے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ناشتا کر کے وہ تھانے کی جانب چل پڑی۔

انسپکٹر راحیل اسے اپنے آفس میں اونگھتا ملا تھا۔اسے دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور باقاعدہ سیلوٹ جڑ دیا۔

"سناو ٔ انسپکٹر صاحب؟"وہ مسکراتے ہوئے مستفسر ہوئی۔جواباً انسپکٹر تفصیل سے ساری کارروائی بتانے لگا

۔

"گڈ،چلو اسے دیکھ لیتے ہیں۔"اس نے کہا اور انسپکٹر راحیل مودّبانہ انداز میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔

ارشد حوالات میں الٹا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کی تکلیف کا اندازہ لگانا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔

"انسپکٹر صاحب! یہ الٹا کیوں لیٹا ہوا ہے۔" اسوہ شوخی سے ہنسی۔

"یہ تو اسے ہی پتا ہو گا میڈم!" انسپکٹر اس کا مطمح نظر جان کر مسکرایا۔ "آپ کہیں تو اس سے پوچھ لیتے ہیں۔"

"ضرور۔"

"چل اوئے! سیدھا ہو۔" انسپکٹر نے کہا اور وہ جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ہے تمھیں؟" انسپکٹر راحیل نے دبنگ لہجے میں پوچھا۔

"کک.... کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"چلو، کل کچھ نہیں ہوا تو آج رات کچھ نہ کچھ کر لینا۔" اسوہ انسپکٹر راحیل کو مخاطب ہوئی۔

"اللہ کے واسطے میڈم صاحب!" ارشد نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے رویے پر معافی چاہتا ہوں، پلیز مجھے معاف کر دو۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے، ہفتہ ڈیڑھ تو لگے گا آپ کی مردانگی پرکھنے میں۔" اسوہ نخوت سے کہہ کر واپس مڑی ۔ اسی وقت تھانے میں ارشد کا باپ داخل ہوا۔ اس کا رخ حوالات کی طرف تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر تھانے دار پر پڑی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"تھانے دار صاحب!.... کیا حال ہے میرے بچے کا۔"

"اسی سے پوچھ لو۔ میں ذرا میڈم کو رخصت کر آؤں۔"

"کون میڈم؟" ملک طاہر جواد نے چونک کر اسوہ کو گھورا جو بے نیازی سے اس کے قریب سے گزر رہی تھی۔

"میڈم اسوہ۔" کہہ کر تھانیدار نے آنکھ میچتے ہوئے ملک طاہر کو مخصوص اشارہ کیا۔ ملک طاہر بچہ تو نہ تھا کہ اس کا اشارہ نہ سمجھتا۔ وہ ایک دم اسوہ کی طرف مڑا۔

"بیٹی!.... بات سنو۔"

"جی؟" اس کی لجاجت بھری آواز سن کر اسوہ کو رکنا پڑا۔

"بیٹی! میرا نام ملک طاہر جواد ہے۔" اس نے آگے بڑھ کر جلدی سے اسوہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں ارشد کا والد ہوں۔"

"جی انکل! حکم کریں۔" وہ رک گئی تھی۔ کچھ بھی تھا وہ ایک بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہیں آسکتی تھی۔

"بیٹی!.... ارشد کی بدتمیزی اور بے ہودگی کی میں معافی مانگتا ہوں۔ اسے کافی سزا مل گئی ہے انسان کا بچہ ہوا تو آئندہ کسی شریف لڑکی کو نہیں چھیڑے گا۔"

"نہیں انکل! آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ پولیس والے اسے نصیحت کر رہے ہیں۔ ہفتے بھر میں انشاءاللہ افاقہ ہو جائے گا۔"

"بیٹی!.... پلیز میرے بڑھاپے ہی کا خیال کر لو۔" ملک طاہر جواد نے ہاتھ باندھ دئے۔ کیونکہ جانتا تھا کہ ایسا موقع دوبارہ نہیں ملنا تھا۔

"انسپکٹر صاحب!....اسے چھوڑ دو۔" اسوہ کے لیے یہ احساس کافی تھا کہ اس نے ارشد کو اس کی حیثیت یاد کرا دی تھی۔یوں بھی ارشد حوالات میں بیٹھا اپنے باپ کو منتیں کرتے اور ہاتھ جوڑتے دیکھ رہا تھا۔

"جی میڈم!" انسپکٹر راحیل مودّبانہ انداز میں کہتے ہوئے ایک سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔"اوے شاکر خان! قیدی کو چھوڑ دو۔"

"تھینک یو بیٹی!" ملک طاہر کے لہجے میں بہ ظاہر شکر گزاری بھری تھی۔ مگر اس کے دل میں جو کچھ پوشیدہ تھا اس سے صرف وہ یا اللہ پاک کی علیم ذات واقف تھی۔

"انسپکٹر صاحب! آپ میرے ساتھ آ جائیں۔" اسوہ نے ملک طاہر جواد کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"جی میڈم!" انسپکٹر اس کے پیچھے ہو لیا۔ جبکہ ملک طاہر چہرے پر عجیب سے تاثّرات سجھائے حوالات کی طرف چل پڑا۔

"بیٹھو انسپکٹر صاحب!" اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ انسپکٹر راحیل کے لیے اس نے عقبی نشست کا دروازہ ان لاک کر دیا تھا۔

رستے میں وہ خاموش رہی۔انسپکٹر راحیل نے بھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اس کا رخ اپنی کوٹھی کی جانب تھا۔اس کی کار کو دیکھتے ہی چوکیدار نے دروازہ کھول دیا مگر وہ کار کو کوٹھی میں لے جانے کے بجائے گیٹ پر روک کر نیچے اتر آئی۔انسپکٹر راحیل بھی جلدی سے باہر آ گیا۔

"انسپکٹر صاحب!.... آپ کا کام پسند آیا۔اور میرا خیال ہے آپ کے پاس ذاتی کار نہیں ہے۔تو یہ کار آپ کی ہوئی۔"

"مم.... مم.... شکریہ، میڈم صاحب!" انعام انسپکٹر راحیل کی توقعات سے کئی گنا زیادہ تھا اس لیے وہ گڑبڑا گیا تھا۔

"اگر چائے کا موڈ ہے تو آجائیں۔" وہ انسپکٹر کی ہکلاہٹ دیکھ کر مسکرائی۔

"نہیں میڈم صاحب! بس خادم کو اجازت دیں۔"

"اوکے!.... چابی اگنیشن میں ہے۔" اسوہ گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ انسپکٹر راحیل نے جلدی سے ایڑیاں بجا کر اسے زوردار سیلوٹ کیا۔ اور اس وقت تک اٹن شن کھڑا رہا جب تک اسوہ گیٹ میں داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کسی کو بھلانے کے لیے چند دن ہی کافی ہوتے ہیں۔ عمار تو جانے کب سے یونیورسٹی سے دور جا چکا تھا۔ اب تو کلاس فیلوز کو یاد ہی نہیں تھا کہ اس نام کا ان کوئی کلاس فیلو بھی ہوا کرتا تھا۔ البتہ اسماء، اسوہ اور مدثر کی یادوں میں وہ زندہ تھا۔ ان کی وجہ سے رباب کو بھی عمار کا ذکر سننے کو مل جاتا تھا۔ مدثر کی زبان اکثر عمار کی بے وفائی پر متحرک رہتی، مگر اسوہ اور اسماء نے ہمیشہ اسے اچھے لفظوں سے یاد کیا تھا۔ خاص کر اسوہ تو اسے بہت یاد کرتی تھی۔

اس دن اسوہ دیر سے یونیورسٹی پہنچی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ اسماء کو اس کے گھر سے بٹھاتی اور یونیورسٹی سے واپسی پر اسے گھر ہی پر اتار دیا کرتی۔ البتہ دیر ہو جانے کی صورت میں وہ اسماء کو کال کر کے دیر ہو جانے کا بتا دیا کرتی تھی۔

خالی پیریڈ میں وہ کیفے ٹیریا میں بیٹھی اسماء لوگوں کو ارشد کی کہانی سنا رہی تھی۔

رباب نے خوش ہو کر کہا۔ "اچھا ہوا، وہ تھا ہی اس قابل۔"

"بالکل، تمیز تو اس بے ہودہ کو چھو کر بھی نہیں گزری۔" اسماء نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رباب کی تائید کی تھی۔

"کتے کی دم ہے۔" مدثر نے تبصرہ کیا۔ "مشکل ہے کہ سدھر جائے۔"

"نہیں۔" رباب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسے لوگوں کا ٹیڑھا پن خود سے کم تر لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ جہاں برتر سے واسطہ پڑا، قدموں میں ڈھیر ہونے میں دیر نہیں کرتے۔ اور جو خوراک اسے اسوہ نے دی ہے، امید ہے دوبارہ اسوہ سے چھیڑ خانی تو درکنار مخاطب ہونے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔"

"ہا.... ہا.... ہا۔" اسوہ کا قہقہہ گونجا۔

"ویسے بہت دن بعد ہنسی ہو۔" اسماء نے اس کا ہاتھ پیار سے سہلایا۔

"کیا، نہیں ہنسنا چاہیے۔"

اسماء نے جلدی سے کہا۔ "اللہ کرے ہمیشہ ہنستی رہو۔"

رباب پوچھنے لگی۔ "اسماء! تمھیں اسوہ سے کچھ زیادہ ہی محبت ہو گئی ہے۔"

"یہ تو ہے۔" اسماء نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "اسوہ ہے ہی اتنی پیاری، محبت کرنے کے قابل۔"

اسوہ ہنسی۔ "تم کیوں جل رہی ہو؟"

رباب جواباً بولی۔"جل نہیں رہی، ڈر رہی ہوں۔ تمھاری محبت نے ایک عمار کو تو غائب کر دیا ہے، اب کہیں اسماء ہی چھو منتر نہ ہو جائے؟"

"صحیح کہا۔" اسوہ بجھے دل سے بولی اور کرسی پیچھے دھکیلتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

"اے! تم تو خفا ہو گئیں۔" رباب نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں۔" اسوہ نے نفی میں سر ہلایا۔"یہ تلخ حقیقت ہے۔"

"قسم سے مذاق تھا۔" رباب نے کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس وقت اسماء نے اٹھ کر اس کا دوسرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔"اسوہ! عمار تمھاری وجہ سے تو نہیں گیا، وہ تو بس اپنا مستقبل سنوارنے گیا ہے۔"

مدثر نے کہا۔"اسوہ بہن! اگر وہ تم سے خفا تھا تو ہم سے کیوں علاحدہ ہوا، ہمیں کیوں دھتکارا، یوں ایک دم رابطہ ختم کر دینا کہاں کا انصاف ہے؟ ....اسماء بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ اس کے جانے کو اپنی ذات سے مربوط نہ کریں۔"

ان کی منتیں سن کر وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔"تم لوگوں کی محبتیں ہمیشہ یاد آئیں گی۔"

"نہیں جی۔" اسماء نے قہقہہ لگا کر کہا۔"ہم ایسی نوبت نہیں آنے دیں گے۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی۔ باقی تمام بھی اسماء کی بات پر ششدر رہ گئے تھے۔

"مطلب بالکل واضح ہے۔ جب ہم تمھیں چھوڑیں گے نہیں تو یاد کیسے آئیں گے۔ یاد تو وہ آتے ہیں جو چھوڑ جائیں۔" اور اسماء کی بات سن کر تمام ہنس پڑے تھے۔ گو وقتی طور پر مدثر نے اسے تسلی دے دی تھی مگر اسوہ کو اس کی ماضی قریب میں ہونے والی گفتگو نہیں بھولی تھی۔ تمام جانتے تھے کہ عمار کے غائب ہونے کی وجہ اسوہ تھی۔

☆☆☆

ارشد ہفتہ بھر بعد ہی یونیورسٹی آسکا تھا۔ اس کی آمد پر کلاس فیلوز کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی معنی خیز مسکراہٹوں نے اسے باور کرادیا تھا کہ تمام کو اس کی آپ بیتی معلوم ہو چکی ہے۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت اسوہ کلاس روم میں داخل ہوئی۔ اس دن بھی اس نے اتفاق سے کالا لباس ہی زیب تن کیا ہوا تھا۔

"واو.... یہ لڑکی پھر کالے لباس میں آگئی ہے، انسان کو خود پر کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" ارشد کے ساتھ بیٹھے اکرم نے دبے لہجے میں کہا۔ اور ارشد ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اکرم اس پر طنز کر رہا ہے۔

اس کے تین چار دوستوں نے پر تپاک انداز میں اس سے حال احوال پوچھا تھا۔ گو ان کے انداز یا لب و لہجے میں کوئی طنز موجود نہیں تھا، مگر اسے یوں لگ رہا تھا کہ کلاس میں ہونی والی ساری چہ میگوئیاں اسی کے متعلق ہو رہی ہیں۔

پروفیسر ہاشم کی آمد نے اسے کچھ ڈھارس دی، مگر اس کی بد قسمتی کہ پروفیسر ہاشم نے آتے ساتھ اس کا حال دریافت کرنا شروع کر دیا۔ شاید پروفیسر کو اصل بات کی سن گن کہیں سے مل چکی تھی اس لیے ارشد کے منہ

سے۔ "طبیعت خراب تھی سر!" کاسن کر وہ زیادہ سوالات سے گریز کرتے ہوئے پڑھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سارا دن وہ کلاس میں کڑھتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ جانے وہ اسوہ کے ساتھ کیا کر گزرتا۔ وہ اپنے باپ سے بھی سخت خفا تھا۔ آخر باپ کے کچھ نہ کر سکنے کے باعث ہی اسے اتنے شدید جسمانی عذاب سے گزرنا پڑا تھا۔ اور اب وہ اس سے بھی زیادہ ذہنی عذاب سے نبرد آزما تھا۔ چھٹی ہوتے ہی اس کا رخ گھر کی طرف ہو گیا ۔وہاں باپ کو اپنا منتظر پا کر اسے شدید حیرت ہوئی۔

"چلو کہیں جانا ہے؟" ملک طاہر جواد نے اسے کار سے باہر نہیں آنے دیا تھا۔

"مگر میں تھکا ہوا ہوں۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"ضد نہیں کرتے بیٹا!" ملک طاہر فرنٹ ڈور کھول کر اس کے ہمراہ بیٹھ گیا۔

"آپ اکیلے جائیں یا ڈرائیور کو لے جائیں نا۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ تھانے سے واپسی کے دن سے اس کا موڈ باپ کے ساتھ خراب ہی رہنے لگا تھا۔

"نہیں تمھارا جانا ضروری ہے۔"

ارشد منہ بناتے ہوئے کار ریورس کرنے لگا۔

"جانا کہاں ہے؟" گیٹ سے نکلتے ہی اس نے پوچھا۔

"اسلم شکور خان کے گھر۔" ملک طاہر نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا...." ارشد نے جھنجلاتے ہوئے بریک لگادی تھی۔ "وہاں کیوں؟"

"اسلم شکور صاحب اور اس کی سے بیٹی سے معذرت کرنے۔"

"پاپا!.... آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"تمھارا بھلا۔"

"میری توہین سے کیسے میرا بھلا ہو گا۔"

"کیا تم بدلہ نہیں لینا چاہتے۔" ملک طاہر نے معنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا۔

"بدلہ لینے کے لیے میں ہر قیمت ادا کر سکتا ہوں۔"

"تو بس اپنے والد کے احکامات بے چوں چراں مانتے جاو، اگر دل خوش نہ کر دیا تو اپنا باپ نہ کہنا۔"

"مگر پاپا"........

"اگر مگر نہیں بیٹا!.... بس جو کہتا ہوں وہ کرتے جاو اور صبر کرو۔"

ارشد نے منہ بناتے ہوئے سر کھجایا اور بے دلی سے کار آگے بڑھادی۔ اسوہ کے گھر کی طرف رہنمائی کرنے ساتھ ساتھ طاہر ملک اپنے بیٹے کو مختلف ہدایات بھی دیتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسلم شکور خان کی محل نما کوٹھی کے ڈرائینگ روم میں موجود تھے۔ ابھی تک وہ اپنی چائے بھی ختم نہیں کر پائے تھے کہ اسلم شکور ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے پر رعب چہرے پر ہلکی سی حیرانی بھی ہویدا تھی۔ باپ بیٹے نے کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی۔

"جی طاہر صاحب! کیسے تشریف آوری ہوئی؟" بیٹھتے ساتھ اسلم شکور مستفسر ہوا۔

"خان صاحب! معذرت کرنے حاضر ہوئے تھے۔"

"معذرت۔"

"جی خان صاحب!....وہ پچھلے ہفتے اس بے وقوف نے نادانستگی میں بے بی کے ساتھ گستاخی کر دی تھی نا۔"

"حساب کتاب تو غالباً پولیس نے برابر کر دیا تھا۔"

"پولیس کی کارروائی اپنی جگہ سر!.... مگر اس کارروائی سے بے بی کے ساتھ ہونے والی گستاخی تو معاف نہیں ہو جاتی نا....بس اس لیے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں تاکہ یہ آپ سے اور بے بی سے میرے سامنے معافی مانگے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" اسلم شکور کے لہجے میں ہلکا سا تفاخّر در آیا تھا۔

"نہیں خان صاحب!.... جس طرح آپ ایک اعلا و ارفع خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح ہماری خاندانی روایات بھی ہمیں یہ اجازت نہیں دیتیں کہ کسی کی بہن بیٹی کی شان میں نازیبا لفظ یا کوئی اور گستاخی کرنے کا سوچ بھی سکیں۔ اور برخوردار نے سنا ہے اچھی خاصی بکواس کی تھی۔ میں اس کے حوالات سے رہا ہوتے ہی اسے لے آیا ہوتا، مگر پولیس نے اسے بستر سے اٹھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔" آخری جملہ کہتے ہوئے ملک طاہر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔ اسلم شکور خان کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھلنے لگا تھا۔

"زیادتی تو ہماری بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی طاہر صاحب"!

"تو بلائیں ناں ہماری بیٹی کو۔"

"نہیں بس آپ نے کہہ دیا اور ہو گیا۔"

طاہر ملک شکوہ کناں ہوا۔"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ آپ نے ہمیں دل سے معاف نہیں کیا۔"

"ارے نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔" اسلم خان نے جلدی سے کہا۔"اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو اسوہ کو بلا لیتے ہیں۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے ملازما کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا دی۔

ملازما نے ڈرائینگ روم میں داخل ہو کر پوچھا۔"جی صاحب جی؟"

"اسوہ کو بلاو ٔ۔"

ملازما دوبارہ "جی صاحب!" کہہ کر واپس مڑ گئی۔

"اور سنائیں آپ کی صحت کیسی ہے؟" طاہر ملک کے لہجے میں خوشامد اور چاپلوسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔اور فی زمانہ یہ لہجہ سامنے والے کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔

"اللہ کا شکر ہے ملک صاحب"!

"ویسے ،ماشاءاللہ آپ نے اپنے کاروبار کو بہت اچھا سنبھالا ہوا ہے۔ایک نام اور پہچان ہے آپ کی۔پاکستان میں اور پاکستان سے باہر کاروباری حلقوں میں آپ کا نام نیک نامی کی علامت ہے۔یقین مانیں میرے تو آپ ہمیشہ سے آئیڈیل رہے ہیں۔ جس دن مجھے راشد کی بے ہودگی کے بارے پتا چلا، خدا قسم میرے تو پاو ٔں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔"

"اب جانے دیں ملک صاحب !" اسلم خان کے ہونٹوں پر اپنی تعریف سن کر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ۔"جو ہونا تھاوہ ہو چکا۔جوان خون ہے بے احتیاطی ہو جاتی ہے۔"

اس سے پہلے کہ ملک طاہر اسے کوئی جواب دیتا اسوہ "اسلام علیکم!" کہتے ہوئے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔

"وعلیکم اسلام!" طاہر نے جلدی سے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔"کیسی ہو بیٹی ؟"

"ٹھیک ٹھاک انکل!" کہہ کر اس نے باپ کے ساتھ نشست سنبھال لی تھی۔راشد اور ملک طاہر کو دیکھ کر اسے کافی حیرت ہوئی تھی۔

"بیٹی !....یقیناآپ ہمیں دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں گی۔اصل میں ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ آپ سے معذرت کر سکیں۔ارشد نے اس دن جس بے ہودگی کا مظاہرہ کیا تھاوہ قابل معافی تو نہیں، مگر پھر بھی آپ ایک اعلاخاندان کی چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے یقینادر گزر کا معاملہ کریں گی۔"

"نہیں نہیں انکل !....ایسی کوئی بات۔"اسوہ پریشان ہی تو ہو گئی تھی۔

"نہیں ایسی ہی بات ہے۔"ملک طاہر نے ارشد کو اشارہ کیا۔

وہ جلدی سے بولا۔"مس اسوہ!....میں تھانے میں بھی آپ سے معذرت کر چکا ہوں اور اب ایک مرتبہ پھر اپنی حرکت پر معافی کا خواست گار ہوں۔"

"اٹس اوکے، مسٹر ارشد!" وہ خوش دلی سے بولی۔"جو گزر گیا اسے بھول جائیں۔"

"تھینکس گاڈ، کہ اتنا بڑا مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔"ملک طاہر دعائیہ انداز میں بولا۔

”پاپا!....میں جاسکتی ہوں؟“

”جیسے تمھاری مرضی بیٹا!“اسلم شکور خان خوش دلی سے بولا اور اسوہ سر ہلاتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی
۔

☆☆☆

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ گو کراچی میں اتنی سردی نہیں پڑتی، مگر ہلکے پھلکے کوٹ اور سوئیٹر وغیرہ کی ضرورت بہ ہر حال محسوس ہو ہی جاتی ہے۔اس دن صبح کے وقت اس کی ماں ناشتا اس کے سامنے رکھ کر اس کے والد کا کوٹ سلائی کرنے لگی۔

”امی جان!....ابو جان کو کہیں اب اس کوٹ کی جان بخشی کر دیں۔ پچھلے دس پندرہ سال سے وہ یہی کوٹ پہن رہے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ اس کی ماں کوئی جواب دیتی بشیر احمد اندر آتے ہوئے بولا۔”برخوردار!.... تمھارا والد ایک کلرک ہے۔ تمھاری طرح بزنس مین نہیں ہے کہ کوئی اچھا کوٹ یا سوئیٹر خرید سکے۔“

عمار نے منہ بنا کر کہا۔”بیٹے کو شرمندہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا۔“

”اس میں جھوٹ ہی کیا ہے۔“

”پھیری لگانے والے کو بزنس مین کہنا جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔“

بشیر احمد ہنسا۔”اچھا کپڑا ڈیلر اب پھیری والا ہو گیا۔“

عمار پچھلے ایک سال سے کراچی سے زمانہ و مردانہ کپڑے کے سوٹ چھوٹے شہروں کے دکانداروں تک پہنچا رہا تھا۔اس مقصد کے لیے وہ پہلے مختلف شہروں میں جا کر وہاں کپڑے کی مارکیٹوں میں خوار ہوتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے چھوٹے موٹے دکانداروں کی طرف سے آرڈر ملنے شروع ہو گئے تھے۔ کپڑے کی ترسیل کے لیے اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ ڈاٹسن بھی خرید لی تھی۔ بہت زیادہ محنت اور کوشش کے بعد بھی وہ ماہانہ ساٹھ، ستر ہزار سے زیادہ منافع نہیں کما سکا تھا۔ شروع شروع میں دس پندرہ ہزار سے شروع ہونے والا منافع ساٹھ ستر ہزار کی بلندی کو چھو کر جامد ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کی رسائی چھوٹے دکانداروں تک ہی تھی۔ بڑے ڈیلرز اسے منہ لگانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب اس کام سے بھی اس کا جی کھٹا ہو گیا تھا۔

"ابو جان!.... اس کام سے بھی ہاتھ کھینچ رہا ہوں۔"

"یار!.... کوئی کام تو ٹک کر کرو۔" بشیر احمد کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ "پچھلے تین سال میں تم نے دس بارہ کاروبار کر کے دیکھ لیے ہیں۔ یہ پہلا کام ہے جسے تم نے سال بھر کا وقت دیا ہے ورنہ ہر دوسرے تیسرے ماہ تم نے کاروبار بدلی کیا ہوتا ہے۔ اس طرح تو تم ترقی نہیں کر سکتے.... کوئی نہ کوئی کام مستقل بنیادوں پر شروع کرنا پڑے گا تبھی تم ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکو گے۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں ابو جان!.... لیکن کوئی ایسا کام ملے بھی تو سہی جس میں ترقی کے مواقع نظر آئیں۔"

"بھلے مانس مجھ سے تو اچھا کما لیتے ہو اور کیا چاہیے؟"

"بس آپ کی دعا چاہیے ابو جان"!

"اچھا اب کیا ارادہ ہے؟"

"فی الحال نہیں سوچا۔چند دن آرام کروں گا۔"

"چلو تم آرام کرو میں تو گیا آفس۔"

والد کے جانے کے بعد وہ تھوڑی دیر ماں سے گپ شپ کرتا رہا اور پھر گھر سے باہر نکل آیا۔اس کا ارادہ مارکیٹ جا کر والد صاحب کے لیے کوٹ وغیرہ خریدنے کا تھا۔کافی دیر وہ مختلف مارکیٹوں میں گھومتا رہا۔ایک بڑی دکان میں خوب صورت لیدر جیکٹس دیکھ کر وہ اندر گھس گیا۔آخر اسے اپنی پسند کی ایک خوب صورت جیکٹ نظر آ ہی گئی۔اس نے جیکٹ کے ساتھ لگی پرائس سلپ دیکھی۔جس پر ایک روپیا کم چھے ہزار کی رقم درج تھی۔

"تھرڈ کلاس۔"وہ جیکٹ اتارنے ہی لگا تھا کہ اسے اپنے عقب میں طنزیہ آواز سنائی دی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ایک ادھیڑ عمر کا ایک کمزور سا آدمی نظر جس کے چہرے پر بیزاری ہویدا تھی۔

عمار مستفسر ہوا۔"آپ نے مجھے کچھ کہا ہے؟"

"ہاں۔"اس نے اثبات میں سر ہلایا۔"میں کہہ رہا ہوں تھرڈ کلاس کٹنگ ہے اس جیکٹ کی۔اور سلائی دیکھو...."وہ جیکٹ ہاتھ میں پکڑ کر عمار کو سلائی کی خامیاں دکھانے لگا۔"ڈیزائن بھی بے ہودہ سا ہے۔"

عمار خوش دلی سے مسکرایا۔"تو پھر آپ میری مدد کریں ناں۔میں نے ابو جان کے لیے کوئی اچھی سی جیکٹ خریدنا ہے۔"

"اچھی سی جیکٹ کا ملنا تو مشکل ہے،خاص کر ایسی جیکٹ تو نہیں مل سکتی جو میرے معیار پر پوری اتر سکے۔البتہ گزارے لائق خرید کر دے سکتا ہوں۔"

"چلو گزارے لائق ہی سہی جناب!" عمار نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"آو □ ٔ میرے ساتھ۔" وہ عمار کو لے کر اس دکان سے باہر نکل آیا۔

"میرا نام عمار ہے۔"

"میں انوار الحق ہوں۔ ائس نے جواباً تعارف کرایا۔

"آپ کرتے کیا ہیں؟" وقت گزاری کے لیے عمار نے تعارف کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

عمار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مطلب میرے بھائی ہو۔"

"یعنی آپ بھی بے روزگار ہیں۔" اس کے سانولے چہرے پر ہلکا سا تبسم جھلکا۔

"بالکل۔" عمار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسی طرح گپ شپ کرتے وہ اگلی مارکیٹ میں پہنچ گئے تھے۔ ایک دکان میں داخل ہو کر اس نے عمار کو لیدر کی چند جیکٹس دکھائیں جو عمار کو بہت پسند آئی تھیں۔ عمار نے ایک کے بجائے دو جیکٹس خرید لی تھیں۔ ایک اپنے لیے اور ایک والد صاحب کے لیے۔

انوار الحق اجازت لے کر جانے لگا تو عمار نے اصرار کرتے ہوئے اسے چائے پینے کے لیے روک لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔

"ویسے آپ چمڑے کی جیکٹس کے بارے کافی معلومات رکھتے ہیں؟"

"معلومات۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "محترم میں نے ساری زندگی اسی کام میں گزاری ہے۔"

”یعنی آپ لیدر جیکٹس کا کاروبار کرتے ہیں؟“ عمار نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں.... جیکٹس ڈیزائننگ وغیرہ کرتا ہوں۔“

عمار نے حیران ہو کر کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تو آپ کہہ رہے تھے، کہ آپ بے روزگار ہیں۔“

”وہ تو ہوں....“ اور عمار کے چہرے پر حیرانی دیکھ کر وہ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔ ”بے روزگار اس لیے ہوں کہ میں اپنے اوپر مالک برداشت نہیں کر سکتا۔ میں کسی کے کہنے پر نہیں چل سکتا۔ خاص کر جب مجھے بے ایمانی اور دھوکا دہی کرنے کا کہا جاتا ہے۔ اور خود میرے پاس اتنا سرمایا نہیں ہے کہ اپنا کاروبار کر سکوں۔“

”اچھا۔“ کہہ کر عمار گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔

”کن سوچوں میں گم ہو گئے۔“ خالی کپ ٹیبل پر دھرتے ہوئے وہ جانے کے ارادے سے اٹھا۔

”ایک منٹ انوار صاحب!....“ عمار نے اسے جانے سے روکا۔ ”آپ بیٹھیں۔“

”خیر تو ہے؟“ عمار کے چہرے پر نظر آنے والے دبے دبے جوش نے اسے چونکا دیا تھا۔

”آپ بیٹھیں تو سہی۔“

”جی! بولیں؟“ وہ بیٹھ گیا تھا۔

”ایک تجویز ہے۔“

”میں سمجھا نہیں، کیسی تجویز۔“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"اگر ہم دونوں مل کر یہ کاروبار شروع کریں۔ میرا مطلب لیدر جیکٹس بنانے کا۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "بھولے بادشاہ اس کے لیے پیسا، کاریگر، سلائی مشینیں، لیبر اور پھر مارکیٹنگ کے لیے تعلقات اور بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔"

"تیس، پینتیس لاکھ سے کام چل جائے گا؟" عمار نے کھوئے کھوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"چھوٹی سطح پر کر سکتے ہیں۔ مگر بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی؟.... رقم ڈوب بھی سکتی ہے۔"

عمار کو اس کی صاف گوئی پسند آئی تھی۔ وہ اعتماد سے بولا۔ ”دیکھیں انوار بھائی! رقم میں لگاؤں گا۔ آپ اپنے ہر کام میں کسی کو بھی جواب دہ نہیں ہوں گے۔ تنخواہ آپ کی مرضی ہے جتنی بھی لیں۔ اور آپ اس پیشے سے منسلک رہ چکے ہیں یقیناً ایماندار کاریگروں سے آپ کی واقفیت ہو گی۔ انھیں ڈھونڈیں اور بسم اللہ کرتے ہیں ۔“

”عمار صاحب!.... آپ مجھے جانتے ہی نہیں ہیں اور یوں ایک دم اتنی بڑی ذمہ داری، مجھے لگتا ہے آپ جلد بازی کر رہے ہیں۔“

”انوار بھائی! میں پچھلے تین سال سے مختلف قسم کے کاروبار کرتا آرہا ہوں مگر کوئی بھی ڈھنگ کا کاروبار نہیں ملا جو مجھے پسند آئے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے بہتری کی کوئی امید نظر آرہی ہے۔ میرا خیال ہے کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“

”یعنی آپ کو میرا آرام کرنا بالکل پسند نہیں آرہا۔“ انوار الحق نے مسکرا کر کہا۔

”ارادہ تو یہی ہے۔“ عمار نے بھی جواباً مسکراہٹ اچھالی تھی۔ ”ویسے بھی ایک بے روزگار کو روزگار ڈھونڈ کر دینا کوئی غلط کام تو نہیں۔“

”میرے دو بیٹے اسی کام سے وابستہ ہیں بھئی اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔“

عمار مسکرایا۔ ”چلو یہ تو اور بہتر ہو گیا کہ ہم دو نہیں چار ہیں۔“

اس کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ اس دوران انھوں نے دوپہر کا کھانا کھانے کے ساتھ دو مرتبہ چائے بھی پی لی تھی۔

فون نمبرز کے تبادلے کے بعد اگلے دن سے انھوں نے با قاعدہ کام کا آغاز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے انھوں نے سلائی مشینوں کی خریداری کے ساتھ کوئی مناسب جگہ کرائے پر لینے کی بابت سوچا تھا کہ جہاں وہ با قاعدہ کام شروع کر سکتے تھے۔

☆☆☆

آخر کب تک یہ لڑکی نہ نہ کرتی رہے گی۔" نسرین بیگم اپنے شوہر اسلم شکور خان کو مخاطب تھیں۔

"بیگم !.... اس کی عمر ہی کتنی ہے۔" اسلم شکور نے منہ بنایا۔

"واہ.... ایم بی اے کر چکی ہے اور عمر ہی کتنی ہے۔ والد صاحب نے میرے ایف اے کرنے کے ساتھ ہی مجھے بیاہ دیا تھا۔"

"توبہ ہے بیگم۔" وہ ہنسا۔ "اچھا یہ بتاؤ ، کوئی اچھا رشتا ہے نظر میں؟"

"ہاں ناں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "کل رخسانہ حمید سے بات ہو رہی تھی۔ اسی نے بتایا ہے۔ ایم این اے کا بیٹا ہے، جدی پشتی جاگیر دار ہے۔ سیاسی حلقوں میں اچھا نام ہے۔ کہہ رہی تھیں اگلے الیکشنز میں خود اس کے ایم این اے بننے کی قوی امید ہے۔"

اسلم شکور نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا مجھے ان کے گھر بیٹی کا رشتا لے کر جانا پڑے گا؟"

"ایسا کب کہا میں نے ؟" نسرین بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

"جتنی بات اپ نے بتائی ہے اس سے تو میں یہی سمجھا ہوں۔"

”رخسانہ حمید کہہ رہی تھیں کہ اس سے لڑکے کی ماں کسی اچھے رشتے کی بابت پوچھ رہی تھیں تو اس نے ہماری بیٹی کا نام لے دیا۔“

”ہونہہ!.... چلو کوئی آئے تو سہی ناں پھر بات ہو گی۔“

”ہاں، مگر آپ اپنی لاڈلی کو تو تیار کر لیں۔“

”اچھا، میں اسے بات کرتا ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

”ڈیڈی!.... دو سال ہو گئے ہیں اور اب تک آپ منصوبے بنا رہے ہیں۔“ ارشد نے اپنے والد کو مطعون کرتے ہوئے کہا۔

”منصوبہ نہیں بنا رہا بیٹے!.... منصوبے پر عمل پیرا ہو رہا ہوں۔“ ملک طاہر نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے بیٹے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔

”ان دو سالوں میں آپ نے اس مغرور شخص کے آگے پیچھے پھرنے کے علاوہ کیا ہی کیا ہے؟“ ارشد نے نشست سنبھالتے ہوئے منہ بنایا۔

”منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی راہ ہموار کی ہے برخوردار!.... اب وہ مجھ پر بہت زیادہ اعتبار کرتا ہے، میری بات کو اہمیت دیتا ہے اور اس کے پانچ چھے اہم اور خصوصی بندوں کو میں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

"بس جو کرنا ہے جلدی کریں ڈیڈ!.... میں اس نک چڑھی نخریلی لڑکی کو ایسا سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ وہ ساری زندگی یادرکھے۔"

"کیا یادرکھے یار! تمھیں اتنا موقع دیا کہ تم اسے ورغلا کر اپنے بس میں کرلو، مگر تمھیں تو وہ ذرا بھی لفٹ نہیں کراتی، مجبوراََ مجھے دوسرا منصوبہ سوچنا پڑا۔"

"ڈیڈ!.... آپ اسے نہیں جانتے کہ اسے اپنی دولت پر کتنا گھمنڈ ہے۔ میں لاکھ سر پٹختار ہوں اس نے مجھے اہمیت نہیں دینا۔ آپ ہی کچھ کریں میں بس اس کا سر جھکانا چاہتا ہوں۔ یوں کہ وہ میرے پاو□ ں میں گر کر زندگی کی بھیک مانگے۔"

"صرف وہ نہیں، اس کا باپ بھی ہاتھ باندھ کر معافی مانگے گا۔ بس تھوڑا سا انتظار اور کرنا پڑے گا۔"

"انتظار ہی تو کر رہا ہوں ڈیڈ"!

"بیٹا!.... ٹھنڈا کر کے کھانے ہی سے منہ کو جلانے سے بچایا جاسکتا ہے۔"

"ڈیڈ!.... کہیں اتنا ٹھنڈا نہ کر دینا کہ کھایا ہی نہ جاسکے۔" طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے ارشد دفتر سے باہر نکل گیا ۔ جبکہ ملک طاہر سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کا شیطانی دماغ از سرِ نو منصوبے پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے چپڑاسی کو بلا کر کافی کا کپ منگوایا۔ کافی ختم ہونے تک وہ اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ اسے اپنے منصوبے پر باقاعدہ عمل شروع کر دینا چاہیے۔ اپنے دفتر سے باہر نکل کر وہ کار میں بیٹھ گیا۔ اس کا رخ اسلم شکور کے دفتر کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ اسلم شکور نے پرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس کے نشست سنبھالتے ہی اسلم شکور نے پوچھا۔ "چائے یا کافی؟"

وہ جواباً بولا۔" ابھی اپنے دفتر سے کافی ہی پی کر اٹھا ہوں۔"

"تو پھر چائے ٹھیک رہے گی۔" کہتے ہوئے وہ فون کا رسیور اٹھا کر چائے کا بتانے لگا۔ رسیور رکھ کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"کافی دنوں بعد چکر لگایا ہے؟"

"مصروفیت ہی اتنی ہے خان صاحب"!

"اور سناو □ ز، کوئی نئ تازی؟"

"نئ تازی تو ہے اور بہت اہم ہے اسی لیے آپ سے مشورہ لینے حاضر ہوا تھا۔" ملک طاہر نے تمہید باندھنے کے لیے میدان ہموار کیا۔

"جی جی ضرور؟.... کہیے میں سن رہا ہوں۔"

"خان صاحب!.... ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہاتھ لگا ہے۔ بس رقم کی کمی آڑے آرہی ہے۔"

"کتنی رقم، کیا میں کچھ مدد کر دوں؟" اسلم شکور نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں خان صاحب!.... رقم اتنی کم نہیں ہے کہ کسی سے قرض لی جا سکے۔"

"کچھ پتا تو چلے۔"

"بات کروڑوں کے ہندسے کو بھی عبور کر رہی ہے۔" ملک طاہر بہت احتیاط سے اپنی گوٹیں کھیل رہا تھا۔ یوں کہ اسلم شکور کو شک بھی نہ ہو۔

”اچھا اصل بات بتاو□ ٔ رقم کے بارے تو بعد میں بات ہو گی نا؟“ اسلم شکور اپنی دلچسپی نہیں چھپا سکا تھا۔

”اچھا خان صاحب! کیا آپ چودھری ریاض کے نام سے واقف ہیں۔“

”چودھری ریاض.... کہیں آپ بحریہ ٹاو□ ٔن والے چودھری ریاض کی بات تو نہیں کر رہے۔“

”بالکل وہی۔“ ملک طاہر جوش سے بولا۔

”اس کا اس معاملے سے کیا تعلق۔“

”تعلق تو نہیں ہے.... صرف اس کی مثال دینا مقصود ہے۔ دیکھیں ایک بحریہ ٹاو□ ٔن کے پراجیکٹ سے اس کی شہرت کہاں تک پہنچ چکی ہے، اپ یقینا ایک بہت بڑے بزنس مین ہیں مگر آپ کو جاننے والوں کی تعداد بہت محدود ہو گی۔“

”آپ بجھارتوں کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔“ اسلم شکور اس لمبی تمہید سے اکتانے لگا تھا۔

”خان صاحب!.... اگر ہم بھی بحریہ ٹاو□ ٔن کی طرز پر یہاں کسی بڑے ٹاو□ ٔن کی بنیاد رکھیں تو مجھے نہیں شک کہ یہ گھاٹے کا سودا ہو گا۔ ذرا سوچیں پندرہ بیس لاکھ روپے ایک کنال زمین خرید کر ہم چار پانچ مرلے کے پلاٹ بیس بیس لاکھ میں بیچ سکیں گے۔ بلکہ پانچ چھے مرلہ کے پلاٹ میں اگر فلیٹس تعمیر کریں تو چار منزلہ عمارت میں سولہ فلیٹ آسانی سے بن سکتے ہیں۔ اور ایک ایک فلیٹ قسطوں پر پچیس، تیس لاکھ میں با آسانی بک جائے گا؟ اب ذرا تیس کو سولہ سے ضرب دیں؟ یقینا حاصل ضرب آپ کو چیخ چیخ کر دعوت دے گا کہ یہ کر گزرو۔ اس کام میں صرف پیسا نہیں شہرت بھی ہے، عزت بھی اور نیک نامی بھی۔“

"ملک صاحب!.... آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔"

"خان صاحب!.... آپ سوچ لیں، ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتے۔ آپ جس کاروبار کو لیے بیٹھے ہیں یہ بہت جلد آپ کے داماد کو وراثت میں ملنے والا ہے۔ اور نسل بیٹے سے چلتی ہے بیٹی سے نہیں۔ یقین مانو میرے منہ میں خاک، مگر مرنے کے چند سالوں بعد کسی کو آپ کا نام بھی یاد نہیں رہے گا سوائے آپ کی بیٹی کے۔"

"اچھا مجھے تفصیل سے بتاو ، منصوبہ کیا ہے؟" اسلم شکور نے سامنے کھلی فایل بند کر کے ایک طرف رکھی اور سگار سلگا کر ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگا لی۔

یہاں چار پانچ سو ایکٹر کی جگہ قریباً خالی پڑی ہے۔ کچھ غریب غربا کے جھونپڑے وغیرہ ہیں جو انھوں نے کسی اور کی زمین میں کھڑے کیے ہوئے ہیں۔ میں نے زمین کے اصل مالک کو ڈھونڈ نکالا ہے اور وہ بہت مناسب قیمت پر یہ زمین فروخت کرنے پر تیار ہو گیا ہے۔ اصل میں عام لوگ اسے سرکاری زمین سمجھتے ہیں، لیکن آپ تو جانتے ہیں میں پراپرٹی ڈیلر ہوں اور ایسی بات کی کھوج میں لگا رہتا ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں نے اسی طرح کے مختلف پلاٹ خرید کر اچھی قیمت پر فروخت کیے ہیں لیکن اس جگہ کی قیمت تک میری رسائی نہیں ہو پا رہی اور مجبوراً مجھے دوسرے بندوں کو بھی شامل کرنا پڑ رہا ہے۔ تین چار اور جاننے والے بھی اس پراجیکٹ میں دلچسپی ظاہر کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو بھی دل چسپی ہو تو اس سوموار کو میں نے ایک نشست رکھی ہے جس میں ایک تو ہم ہر فرد کا حصہ مختص کریں گے اور دوسرا پراپرٹی خریدنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بنائیں گے۔"

"تو آپ کیا چاہتے ہیں میں کتنا حصہ ڈالوں؟"

”فی الحال اس بحث کو رہنے دیں۔ آپ کے پاس تین چار دن ہیں آپ سوچیں سوموار کے دن جو نشست ہو گی اس میں حصے طے کریں گے۔ اور بے فکر رہیں آپ سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں ہے۔“

”شکریہ ملک صاحب!“ اسلم شکور ممنونیت سے بولا۔

”ٹھیک ہے خان صاحب!.... تو پھر سوموار کو مل رہے ہیں۔“ ملک طاہر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اسلم خان نے پوچھا۔ ”جگہ؟“

”میں آپ کو بعد میں کال کر کے بتا دوں گا۔“

اسلم شکور اثبات میں سر ہلاتا ہوا اسے دروازے تک چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ ہو لیا۔

☆☆☆

اگلی رات کو ڈائینگ ٹیبل پر نسرین بیگم نے دوبارہ اسوہ کی شادی کی بات چھیڑ دی تھی۔

”آج رخسانہ حمید بتا رہی تھیں کہ لڑکے والے ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں۔“

ماں کی بات سن کر اسوہ منہ کی طرف لے جانے والا نوالہ دوبارہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے ماں سے پوچھنے لگی۔

”کون لڑکے والے ماں جی؟“

”تمھیں دیکھنے آ رہے ہیں؟“ نسرین بیگم شوخی سے بولی۔

”امی جان مجھے ایسا مذاق بالکل پسند نہیں ہے؟“ وہ کرسی پیچھے کو کھسکا کر اٹھنے لگی۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے اسوہ؟“ اسلم شکور کا لہجہ کافی سخت تھا۔ ایسا لہجہ اسوہ پہلی بار سن رہی تھی۔ وہ حیرت سے جامد ہو کر والد کو دیکھنے لگی۔

”بیٹھو کھانا کھاؤ۔“ اس مرتبہ اس کے والد کے لہجے میں پہلی والی سختی مفقود تھی۔

اسوہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو بہ مشکل روکتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابو جان اسے یوں بھی مخاطب کر سکتے تھے۔

”ہاں بیگم!.... آپ کچھ بتا رہی تھیں؟“ اسلم خان بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔

”جی جی، میں بتا رہی تھی کہ لڑکے والوں کی رخسانہ حمید سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس رشتے میں دلچسپی لے رہے ہیں اور ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں۔“

”تو پھر آپ نے کیا کہا؟“

”یہی کہ شوہر سے مشورہ لے کر بتا دوں گی۔“

”ہاں اسوہ!.... اب تم بتاؤ کیا خیال ہے، لڑکا ایم این اے کا بیٹا ہے اور شاید اگلے انتخاب میں وہ خود بھی ایم این اے بن جائے۔ جاگیردار فیملی سے ہے۔“

اسوہ باپ کی بات کو جواب دئے بغیر خاموش بیٹھی رہی۔

”اسوہ! میں نے کچھ پوچھا ہے؟“ اسلم شکور نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

"پاپا!....مجھے شادی نہیں کرنا اور اگر آپ زبردستی میری شادی کرنا چاہتے ہیں تو پھر مجھ سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ آنکھوں میں موجود پانی کو بعض اوقات روکنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ اس وقت بھی بے وقت کی برسات شروع ہوئی اور وہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس سے عمار کو چھین کر لے جا رہا ہے۔ اپنے والد کا سخت لہجہ بھی اسے ہلکان کیے دے رہا تھا۔

اسے خواب گاہ میں آئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹا کر اس کا والد اندر داخل ہوا۔ وہ جلدی سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"میری گڑیا ناراض ہے۔" اسلم شکور نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور وہ ایک دم بلکتے ہوئے اپنے والد سے لپٹ گئی۔

"ارے پاپا کی جان۔" وہ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلیاں دینے لگا۔ "اچھا بات کیا ہے مجھے اصل بات بتاو ؟"

مگر وہ ہچکیاں لے لے کر آنسو بہاتی رہی۔

"دیکھو گڑیا!....اگر تم اصل بات نہیں بتاو ٔ گی تو میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچوں گا۔"

"پاپا!....میں نے شادی نہیں کرنا۔"

"شادی تو تمھیں کرنا پڑے گی۔ ہاں یہ کہہ سکتی ہو کہ اس جگہ نہیں کرنی۔"

وہ جلدی سے بولی۔"ہاں پاپا!....اس جگہ نہیں کرنی۔"

"توٹھیک ہے۔جہاں کرنا ہے وہاں کر دیتا ہوں۔بتاو کیا نام ہے، کیا کر تا ہے، خاندانی پس منظر کیا ہے؟"

"کیا امیر ہونا ضروری ہے پاپا؟"

"فی زمانہ سمجھا تو یہی جاتا ہے، لیکن مجھے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"آئی لو یو پاپا!"وہ خوشی سے سر شار ہو گئی تھی۔

وہ ہنسا۔"میں جانتا ہوں۔اب ذرا مکمل تفصیل بتاو؟"

"اس کا نام عمار ہے، میر اکلاس فیلو تھا۔اور اس کا والد سر کاری محکمے میں کلرک ہے۔"

گہر اسانس لیتے ہوئے اسلم شکور خان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔اسوہ امید بھری نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد اسلم شکور مستفسر ہوا۔"کیا وہ اس قابل ہے کہ کوئی کاروبار وغیرہ سنبھال سکے۔"

"جی پاپا!....وہ کلاس کے نمایاں لڑکوں میں ایک تھا۔نہایت شریف، سادہ، سلجھا ہوا، خو دار اور سب سے بڑھ کر قابل بھروسا۔"

"بس اتنی تھوڑی سی خوبیاں۔"اسلم شکور ہنسا۔"اور اصل خوبی تو تم نے بتائی نہیں۔"

"اصل خوبی؟"

”ہاں اصل خوبی!.... کہ وہ ہماری گڑیا کو پسند کرتا ہے اور ہماری گڑیا اسے چاہتی ہے۔“

وہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔

”اچھا ایسا ہے؟ اسے کل شام کو گھر پر بلا لو میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔“

اچانک اسوہ کو یاد آیا کہ عمار کو بلانا ممکن نہیں تھا۔ وہ پریشانی سے ہکلائی۔ ”پپ.... پاپا!.... ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔“

”کیسا مسئلہ؟“

”پاپا!.... وہ اپنی تعلیم کی تکمیل سے ایک سال پہلے یونیورسٹی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

”چلو خیر ہے، میں کون سا اسے نوکری پر رکھ رہا ہوں.... تم بس اسے بلا لو۔“

”مگر پاپا!.... میرے پاس اس کا پتا یا فون نمبر موجود نہیں ہے نا۔“

”کیا مطلب اس بات کا؟“ وہ حیرانی سے بیٹی کی جانب دیکھنے لگا۔

”پپ.... پاپا.... آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک بار ایک لڑکے کی شکایت تھی اور آپ نے انسپکٹر جمیل کو پہلی مرتبہ یونیورسٹی بھیجا تھا۔“

”یہ ملک طاہر جواد کے بیٹے سے پہلے کا واقعہ ہے۔“ اسلم شکور نے اپنی یاداشت کو تازہ کیا۔

”جی پاپا! بالکل وہی، بس اس دن انسپکٹر صاحب اسے پکڑ کر یہاں لے آیا تھا۔ میرے سامنے اس کی بے عزتی ہوئی اور اگلے دن وہ یونیورسٹی چھوڑ کر چلا گیا۔“

"تو اب کہاں ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں پاپا!....وہ پچھلے تین سال سے غائب ہے۔"

اسلم شکور نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔"اور تم اس کے لیے یہ رشتا ٹھکرا رہی ہو، بلکہ اس کے بعد بھی کوئی رشتا آیا تو تمھیں قبول نہیں ہو گا۔ وہ بھی ایک ایسے لڑکے کی خاطر جس کا اتا پتا بھی تمھیں معلوم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے، اس کی شادی ہو گئی ہے یا وہ کنوارا ہے۔ واہ بیٹی واہ بہت اچھا فیصلہ ہے ۔ ویسے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی زیادہ عقل مند ہو۔"

باپ کے انداز نے اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"دیکھو بیٹی!.... میں ایک عملی آدمی ہوں۔ میں نے لڑکے کے خاندانی پس منظر کو زیرِ بحث نہیں لایا حالانکہ میری بیٹی کی شادی کسی سرکاری کلرک کے بیٹے سے ہونا ناممکن سا لگتا ہے، مگر میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی کہ میرے مد نظر تمھاری خوشی تھی۔ اور اب جو کچھ تم بتا رہی ہو اس کے بعد اگر تم یہ سوچو کہ میں موجودہ رشتے سے انکار کر دوں گا یہ تمھاری خوش فہمی ہو گی۔ میں تمھاری والدہ کو بتا دیتا ہوں، کل یا پرسوں لڑکے والے آ رہے ہیں تمھیں دیکھنے۔ خبر دار اگر تم نے آئیں بائیں کرنے کی کوشش کی۔ تمھیں شاید میں کچھ نہ کہہ سکوں مگر اپنے سر میں ضرور گولی اتار دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ بیٹی کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور اسوہ جو والد کی امید افزا باتیں سن کر مکمل خوش بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ایک مرتبہ پھر رونے کے لیے تیار ہو گئی۔ کچھ بھی تھا اپنے والد کی موت اسے کسی طور قبول نہیں تھی۔ عمار نے بھی تو اس کے لیے کوئی گنجایش نہیں چھوڑی تھی۔

☆☆☆

والد کے جانے کے بعد وہ کافی دیر بے حس و حرکت بیٹھی خود کلامی کرتی رہی....

"کہاں چلے گئے ہو عمار، آجاو ناں دیکھو تمھاری اسوہ تمھیں بلا رہی ہے۔ تم تو مجھے دیکھے بنا ایک پل بھی نہیں رہ پاتے تھے۔ لوگوں کے طنز، طعنوں اور حقارتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور کہاں اتنے سال گزار دیئے۔ کیا تمھیں اپنی اسوہ کی یاد نہیں آتی۔ تم تو میری آنکھوں کو جھیل سے تشبیہ دیتے تھے آو دیکھو تو سہی اب یہ آنکھیں جھیل کے بجائے آبشار بن گئی ہیں۔ ہر وقت بہتی رہتی ہیں۔ تمھیں تو میری آواز کویل کی سی لگتی تھی، تو کیا اب تمھارے کانوں کو میری آواز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ میری آمد پر تمھیں بہاروں کی آمد کا گماں ہوتا تھا، تو اب اپنی زندگی اور میری زندگی کو کیوں خزاں بنانے پر تلے ہو؟.... کہاں گئی ہیں تمھاری وہ بے تاب نگاہیں جو میرے رخ کا طواف کرنے کے لیے بے چین رہتی تھیں۔ اب تو یہ چہرہ تمھاری نگاہوں کی تپش کے لیے جانے کب سے ترس رہا ہے.... ایک دفعہ آکر دیکھو تو سہی؟ اسوہ نے بلکہ تمھاری اسوہ نے تمھارے رستے کے سارے کانٹے چن لیے ہیں، ساری مشکلیں دور کر دیں ہیں، ساری کٹھن منزلیں طے کر لی ہیں۔ ساری کھائیاں عبور کر لی ہیں بس کمی ہے تو تمھاری۔ آجاو ناں اور اسوہ کو اپنا لو۔ اسوہ مر جائے گی تمھارے بغیر۔ اب تو بس تمھاری گم شدگی ہی ملاپ کے رستے کا سب سے بڑا کانٹا ہے۔ آجاو عمار!.... میں نہیں رہ پاوں گی۔ عمار آجاو مجھے تمھاری جتنی محبت کوئی نہیں دے پائے گا۔ کوئی دے بھی کیسے سکتا ہے، باقی دینا کے لیے میں ایک خوب صورت لڑکی سہی مگر تمھارے لیے تو تمھاری اسوہ ہوں ناں جسے تم دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہو.... بس کرو بہت لمبا کر دیا جدائی کو.... کہیں اس جدائی نے تمھیں میرے بغیر جینا تو نہیں سکھا دیا۔ پلیز عمار آجاو اگر تم میرے بغیر جینا سیکھ بھی گئے تو یقین مانو مجھے تمھارے بغیر جینا بھول گیا ہے۔ میں تو ایک ایسی لاش بن گئی ہوں جو بس سانس لینا جانتی ہے اور لوگوں کو لگتا ہے میں زندہ ہوں حالانکہ میں زندہ نہیں

ہوں۔ دیکھو تو سہی اب مجھ سے تمھارے انتظار کی لذت بھی چھینی جا رہی ہے.... میرا پیارا ابّا ہی نادانستگی میں میرے خلاف ہو گیا ہے۔ عمار!.... اگر میں کسی اور کے نام ہو گئی تو یاد رکھنا کچھ بھی باقی نہیں بچے گا، پھر تم یہ ہونا واپس نہیں لا سکو گے.... عمار! پلیز آ جاو پلیز پلیز.... تم نہیں جانتے تم میرے لیے کیا ہو؟.... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میرے لیے اتنے ضروری ہو.... مجھے میری بے خبری کی اتنی بڑی سزا نہ دو؟.... میرا جرم جتنا بھی بڑا ہو، جان بوجھ کر تو نہیں کیا گیا نا.... تم تو میری ہر بات کو اہمیت دیتے تھے.... کب سے میں اتنی غیر اہم ہو گئی ہوں کہ تمھیں میری آہیں، میری سسکیاں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ پلیز عمار! اب بس کر دو۔ اگر تمھیں میری ضرورت نہیں رہی، اگر تمھیں مجھ سے بہتر مل گئی ہے تو آ کر میرے لا حاصل انتظار کا تو خاتمہ کر دو۔ مجھے کوئی سزا ہی سنا دو.... یہ کرب ناک خاموشی مجھ سے سہی نہیں جا رہی.... عمار پلیز پلیز پلیز.... میں خود کو یقین نہیں دلا سکتی کہ تمھیں میری ضرورت نہیں رہی۔ یقین کروں بھی تو کیسے؟ میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ تم بھی میرے لیے تڑپتے ہو، تم بھی رات بھر کروٹیں بدلتے رہتے ہو.... تمھیں اب بھی اپنی اسوہ اتنی ہی پیاری ہے جتنا پہلے تھی۔ ایسا ہے نا عمار!.... کہو نا، کہہ دو نا کہ تم صرف اسوہ کے ہو صرف اور صرف اسوہ کے۔ اور ہاں سن لو اسوہ بھی صرف تمھاری ہے صرف اور صرف تمھاری.... مگر خدارا دیر نہ کرنا.... یہ نہ ہو صرف تمھاری اسوہ کسی دوسرے کی تحویل میں چلی جائے۔ کسی ایسے کی جو دنیاوی رتبے میں تم سے برتر ہو۔ پھر تمھارے ہاتھ ملنے سے کچھ بھی نہ ہو گا.... اس وقت تمھاری اسوہ بھی بے بس ہو جائے گی عمار! پلیز پلیز پلیز“....

روتے روتے اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ جانے کتنے عرصے سے اس نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ اب تو اسے نماز پڑھنا بھی بھول گیا۔ لیکن انسان پر جب ایسی مشکل پڑتی ہے کہ جس کا مداوا ممکن نہ ہو تو وہ اسے اپنے رحیم و کریم ربّ کی یاد آتی۔ تب اسے خیال آتا ہے کہ اس مشکل سے نکالنے والی ذات بس ایک ہی ہے۔ وہ بھی اپنے

ربّ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ رات کہ اس پہر عشاء کی نماز ہو سکتی تھی یا نہیں، مگر وہ نماز پڑھنے لگی اور پھر فرض نماز کے بعد نوافل پڑھتے پڑھتے اسی طرح مصلے پر لیٹ کر سو گئی۔

☆☆☆

مہینے بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد عمار اور انوار الحق نے مل کر کام شروع کر دیا تھا۔ عمار کو ایک مشہور دکان کی طرف سے پچاس جیکٹس کا آرڈر بھی موصول ہو چکا تھا۔ وہ سر گرمی سے اس آرڈر کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ جیکٹس پر لگانے کے لیے اس نے ایک خوب صورت سامونو گرام بھی ڈیزائن کیا تھا جس پر انگریزی کے دو حرف یو اور اے بڑی ہنر مندی سے لکھے گئے تھے۔ وہ سارا سارا دن انوار الحق کے ڈیزائن کیے ہوئے جیکٹس ساتھ لیے مارکیٹ میں گھومتا رہتا۔ اس کا ارادہ کراچی کے باہر جا کر بھی آرڈر تلاش کرنے کا تھا، مگر پہلے مرحلے میں وہ کراچی میں گھوم لینا چاہتا تھا۔ انوار الحق اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ جیکٹوں کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ رات گئے تھکا ہارا گھر پہنچتا لیکن بستر پر لیٹتے ہی دشمن جاں کود کر اس کے خیالوں میں آدھمکتی۔ جب تک وہ یونیورسٹی میں تھی وہ کبھی کبھی اسے دیکھنے کے لیے چھپ چھپا کر چلا جاتا مگر جب سے وہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئی تھی وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ لے دے کے اس کی ایک تصویر عمار کے پاس موجود تھی جسے وہ سونے سے پہلے وہ جی بھر کے دیکھا کرتا مگر اس کا جی اسوہ کے دیدار سے کبھی بھر ہی نہیں پایا تھا اس لیے یہ وظیفہ اسے درمیان میں چھوڑ کر سونا پڑتا۔

اس دن بھی اسے اسوہ کی یاد بہت شدت سے آئی یہاں تک کہ اس کا جی کرنے لگا کہ وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ اور پھر اس کی دید کے بدلے اسے جو سزا ملے وہ ہنسی خوشی قبول کر لے۔ وہ شاید ایسا کر بھی لیتا مگر

ایک دم اس کی آنکھوں میں اسوہ کا پر غضب چہرہ لہرایا۔اس کی دل خراش باتیں عمار کی سماعتوں میں گونجنے لگیں....

"میں نے تمھیں منع کیا تھا کہ جب تک میرے ہم پلہ نہیں ہو جاتے اس عشق وغیرہ سے باز آجاو... نظر آرہی ہے میری کوٹھی؟....ہو رہا ہے کچھ اندازہ.... تمھارا کیا خیال ہے ایک کلاس میں پڑھنے کی وجہ سے ہم دونوں برابر ہو گئے ہیں....احمق انسان........ تم مجھے اپنی گھٹیا محبت سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو........میرے نزدیک، تمھاری حیثیت سڑک پر پھرنے والے کتے کے آوارہ پلّے سے زیادہ نہیں ہے ....گھٹیا نسل کے پنچ انسان! تمھیں میرے نرمی سے سمجھانے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا کیوں؟.... آیندہ اگر مجھے فلمی محبت دکھانے کی کوشش کی تو آنکھیں نکال کر چیل کوّوں کو ڈال دوں گی....بڑا آیا مجنوں کی اولاد.... تھانے جا کر تمھارے سر سے محبت کا بھوت اچھی طرح اتر جاتا مگر مجھے تمھاری ماں پر ترس آرہا ہے۔ اور یاد رکھنا ہمیشہ یہ ترس نہیں آئے گا....انسپکٹر صاحب!اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال باہر کرو....لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے.... نفرت ہے مجھے تم سے، بے انتہا نفرت....اپنی شکل دیکھی ہے؟....اپنا سٹیٹس دیکھا ہے؟....ہو رہا ہے کچھ اندازہ؟ تمھاری فلمی محبت.... گھٹیا محبت.... گھٹیا محبت.... گھٹیا محبت....“عمار کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔اسوہ کی تصویر دوبارہ پرس میں ڈال کر وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

"اس لڑکی نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا اور اب دوپہر کے کھانے کے لیے بھی اپنی خواب گاہ سے نہیں نکلی ۔“نسرین بیگم اپنے شوہر کو مخاطب ہوئی جو اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی تھا۔

”کیا.... گڑیا نے صبح ناشتا نہیں کیا؟.... آپ کو چاہیے تھا کہ زبردستی اسے کچھ کھلاتیں۔“

”وہ میری مانتی کب ہے، آپ ہی نے سر پر چڑھایا ہوا ہے۔ میری حیثیت تو اس کے نزدیک بس ایک خادما جتنی ہے۔“

”نسرین بیگم!.... وہ آپ کی بھی بیٹی ہے۔ اور بیٹیوں کی ساری ذمہ داریاں ماں کے سر پر ہوتی ہیں.... بہ ہر حال میں دیکھتا ہوں۔“ وہ بیٹی کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹاتے ہوئے وہ اندر داخل ہوا۔ اسوہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ نچلے دھڑ پر اس نے کمبل لیا ہوا تھا۔ اور گہری سوچ میں گم تھی۔ والد کو دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھنے لگی۔

”بیٹھی رہی.... بیٹھی رہو۔“ اسلم شکور اس کے ساتھ ہی جا کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا گڑیا!.... ٹھیک تو ہو؟“ اس نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جی پاپا!“ وہ آہستہ سے کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”تم نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا اور اب کھانے کے لیے بھی باہر نہیں نکلیں۔“

”پاپا!.... بھوک ہی نہیں ہے۔“

”دیکھو گڑیا!.... یہ سراسر زیادتی ہے۔ اپنے ساتھ بھی اور ممی پاپا کے ساتھ بھی۔ دیکھو میری جان میں تمھیں ایک سراب کے پیچھے زندگی تباہ کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔“

”پاپا!.... آپ تھوڑی مہلت تو دے سکتے ہیں نا۔“

"کتنی مہلت بیٹی؟....بہ قول آپ کے اسے غائب ہوئے تین سال ہو چکے ہیں، مزید کتنی مہلت درکار ہے؟"

"اصل میں پاپا!....وہ کچھ بن کر میرے سامنے آنا چاہتا ہے۔وہ اتنی دولت کمانا چاہتا ہے کہ آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اسے سر نہ جھکانا پڑے۔وہ بہت خود دار اور حساس شخص ہے پاپا!....جب تک وہ اس قابل نہیں بن جاتا وہ مجھ سے چھپا رہے گا۔یقین مانو اس کے جانے کے بعد بھی یونیورسٹی میں کئی بار مجھے شک گزرا کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے مجھے گھور رہا ہے مگر میں اسے تلاش نہ کر پائی۔پاپا میرا یقین کرو وہ آئے گا ایک دن ضرور لوٹے گا۔اس نے دعوا کیا تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا،پاپا پلیز مجھے تھوڑی مہلت دے دیں۔"

"یہ سب جذباتی باتیں ہیں گڑیا!....جوش اور غصے میں کیے ہوئے دعوؤں کی حیثیت بس اتنی سی ہوتی ہے کہ نظر سے اوجھل ہوتے ہی وہ دعوے بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں۔"

وہ لجاجت سے بولی۔"پاپا!....آپ تھوڑی سی مہلت تو دے سکتے ہیں نا....بالکل تھوڑی سی۔"

"گڑیا!میں اس رشتے کو کھونا نہیں چاہتا۔مجھے یہ رشتا بہت پسند آیا ہے۔"

"پاپا!....صرف ایک مہینے کی مہلت دے دیں پلیز"

"ایک ہفتہ ہے تمھارے پاس اور اس کے بعد میں انکار نہیں سنوں گا۔"

"پاپا!....ایک ماہ....پلیز۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ اس کے بعد کوئی بہانہ نہیں کرو گی اور تمھیں چپ چاپ ہمارا فیصلہ ماننا ہو گا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں پاپا!" اسوہ خوش ہو کر اپنے والد سے لپٹ گئی تھی۔

"اب یہ خوشامد چھوڑو اور اٹھو کھانا کھاو۔" اسلم شکور ہلکی سی چپت اس کے سر پر مارتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

اسلم شکور خان کے سامنے تین معزّز اشخاص تشریف فرما تھے۔ چوتھا فرد ملک طاہر جواد تھا جو اس کے پہلو میں بیٹھ کر ان تینوں کا تعارف کرا رہا تھا۔

"خان صاحب!.... یہ ہیں شیخ رئیس الدین۔" اس نے کالے سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص کا تعارف کرایا جس کی توند کافی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ "اور شیخ صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ ان کے ساتھ سید تبریز شاہ تشریف فرما ہیں۔ شاہ صاحب ڈیرہ غازی خان سے تشریف لائے ہیں۔" ملک طاہر نے پستہ قامت اور کمزور جسم کے مالک تبریز شاہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ان کے ساتھ فیروز خان رئیسانی تشریف فرما ہیں۔ رئیسانی صاحب کا تعلق کوئٹہ سے ہے۔" تیسرا آدمی بھی شیخ رئیس کی طرح موٹا تازہ ہی تھا۔ "اور آپ تینوں حضرات یقیناً اسلم شکور خان صاحب سے واقف ہوں گے۔ باقی جس مقصد کے لیے ہم اکٹھے ہوئے ہیں وہ تمام کو معلوم ہے۔ آج ہم نے طے کرنا ہے کہ ہم جو زمین خریدنے جا رہے ہے اور جو منصوبہ ہم شروع کریں گے اس میں ہر ایک کا کتنا حصہ ہو گا۔ یہ طے کر لینے کے بعد ہم عملی طور زمین کے مالک بلکہ مالکان سے بات چیت کریں گے۔ زمین کے اصل مالک کا انتقال مہینا بھر پہلے ہی ہوا ہے اس کے ورثاء اس کے چار بیٹے ہیں، چونکہ اس زمین کے علاوہ بھی اس کی کافی جائیداد موجود ہے اس لیے مذکورہ زمین میں، چاروں بیٹوں کا حصہ برابر نہیں ہے۔ خیر

یہ ایک ضمنی بات تھی اس بارے بعد میں تفصیل سے بات ہوتی رہے گی اس وقت میں اصل مدعا پر آتا ہوں۔ کہیے شیخ صاحب!.... آپ اس بارے کیا کہتے ہیں۔"

"طاہر صاحب!.... ایسا ہے کہ پچاس فیصد میں رکھ لیتا ہوں اور باقی کے پچاس فیصد آپ چاروں بھائی تقسیم کر لیں۔"

"واہ شیخ صاحب!.... واہ؟" تبریز شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ سارا منصوبہ ہی سنبھال لیں نا، ہماری یہاں ضرورت ہی کیا ہے؟" فیروز خان رئیسانی بھی شیخ صاحب کو کڑی نظروں سے گھورنے لگا تھا۔

"آپ تو خفا ہونے لگے۔" شیخ نے گھبرا کر کہا۔ "میں تو آپ کے فائدے کے لیے کہہ رہا تھا، کہ اگر اس منصوبے ہماری توقعات کے مطابق نفع نہ ہو تو آپ لوگوں پر کم بوجھ پڑے؟"

"رہنے دیں محترم!" رئیسانی نے زبان کھولی۔ "اگر ایسا ہے تو میں ساٹھ فیصد حصہ رکھنے کو تیار ہوں۔ باقی کے چالیس فیصد آپ چاروں بانٹ لینا۔"

تبریز شاہ نے زبان کھولی۔ "ایسا ہے ہم پانچ آدمی ہیں اور ہر آدمی کا بیس فیصد بنتا ہے۔ اس لیے لڑائی جھگڑے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

ملک طاہر نے تمام کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہے دوستو! خان صاحب کا حصہ ہو گا پچاس فیصد۔ اب جو باقی کا پچاس فیصد ہے وہ ہم چار آدمیوں میں تقسیم ہو گا۔ اس بات میں اگر کسی بھائی کو بھی اختلاف ہے تو وہ بہ خوشی تشریف لے جا سکتا ہے۔"

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" رئیسانی گویا پھٹ پڑا تھا۔ "پچاس فیصد اکیلے خان صاحب کا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔" تبریز شاہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"نہیں یہ ہمیں منظور نہیں۔" شیخ رئیس احمد نے بھی زور و شور سے ان کی تائید کی تھی۔

"لڑنے کی ضرورت نہیں ہے صاحبان!.... میں اپنا حصہ پانچ فیصد کر دیتا ہوں کیونکہ، میرے لیے یہ اتنا زیادہ منافع بخش کاروبار نہیں ہے۔ آپ تینوں کا پندرہ پندرہ فیصد اتنا کم بھی نہیں ہے؟"

تبریز شاہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "ملک صاحب!.... آپ سیدھی بات ہمارے منہ سے نہ اگلوائیں.... میں جانتا ہوں کہ آپ اپنا حصہ پانچ فیصد کیوں رکھ رہے ہیں.... اپنا شورروم بیچنے کے بعد بھی آپ بہ مشکل پانچ فیصد حصے کی ادائی کر سکیں گے۔ اس لیے ہم پر احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔ باقی آپ اپنا پندرہ فیصد خان صاحب کو دے دیں ہم اپنے بیس فیصد سے ذرا بھی نیچے اترنے کو تیار نہیں۔"

ملک طاہر تلخی سے بولا۔ "شاہ صاحب!.... شاید آپ بھول رہے ہیں کہ یہ منصوبہ شروع کرنے والا میں ہوں۔"

"اور آپ بھی یہ بھول رہے ہیں کہ تین دن پہلے آپ نے مجھے تیس فیصد حصہ کی آفر کی تھی۔" تبریز شاہ نے بھی غصے بھرا جواب دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"مجھے بھی آپ نے پچیس فیصد کا کہا تھا؟" رئیسانی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

"مجھے آپ نے کہا تھا کہ جتنا مرضی ہو حصہ رکھ لوں۔" شیخ رئیس نے لقمہ دیا۔

"دیکھیں اس وقت تک خان صاحب سے بات نہیں ہوئی تھی۔" ملک طاہر نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

رئیسانی نے کہا۔ "یہ تو اور بھی بہتر ہے؟ ہم خان صاحب کو شامل ہی نہیں کرتے۔یوں بھی خان صاحب کا اتنا بڑا کاروبار ہے کہ انھیں اس فضول سے منصوبے میں حصہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ملک طاہر نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں میں خان صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں۔" وہ تینوں ملک طاہر کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ان کی بات چیت تلخ کلامی سے طعن و تشنیع میں بدلی اور آخر کار وہ تینوں خفا ہو کر جانے لگے۔

جاتے جاتے رئیسانی نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ "ملک صاحب!....وہ زمین آپ کی نہیں ہے....اگر ہم اس منصوبے میں شامل نہیں تو یاد رکھنا آپ لوگ بھی اتنی آسانی سے زمین نہیں خرید سکو گے۔" یہ کہہ کر وہ تینوں دندناتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تھے۔

اس دوران اسلم شکور خان نے ان کی گفتگو میں حصہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔وہ ملک طاہر کا ممنون و احسان مند تھا جس نے اس کی خاطر اپنے پرانے جاننے والوں اتنی لڑائی لڑی تھی۔

ان تینوں کے جانے کے بعد ملک طاہر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

اسلم خان نے اسے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ "ملک صاحب پریشانی کیا ہے؟"

"خان صاحب!....یہ منصوبہ بہت بڑا ہے۔ہم دونوں اکیلے اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتے۔باقی تبریز شاہ کی بات درست تھی میں واقعی بہ مشکل پانچ فیصد حصے ہی کی ادائی کر سکوں گا۔"

"آخر کتنی بڑی رقم درکار ہو گی؟"

"خان صاحب! چار سو ایکڑ کا مطلب ہے بتیس سو کنال زمین اور اگر ہمیں فی کنال دس سے پندرہ لاکھ کی بھی پڑے تو باقی آپ خود حساب کر لیں؟.... پھر زمین کے انتقال کی مد میں بھی رقم خرچ ہو گی اور اس کے بعد وہاں کچھ لوگوں نے جھونپڑے اور کچے مکان وغیرہ بھی بنائے ہوئے ہیں ان سے بھی وہ جگہ بھی خالی کرانی پڑے گی ۔تعمیراتی کام کے لیے بھی رقم درکار ہو گی۔ اب یہ سب کچھ ہم دونوں ہینڈل نہیں کر سکتے؟"

"کیا میں اپنی دونوں فیکٹریاں اور ٹرانسپورٹ کمپنی بیچ کر بھی مطلوبہ رقم پوری نہیں کر سکوں گا؟ بلکہ مزید رقم ضرورت پڑی تو میں اپنی کوٹھی گروی رکھ دوں گا۔"

"خان صاحب!.... میرا اندازہ ہے کہ یہ سب کرنے کے بعد بھی آپ ستر فیصد سے زیادہ حصہ نہیں ڈال سکیں گے۔ ہمیں کم از کم کسی ایک ایسے آدمی کو شامل کرنا پڑے گا جو پچیس تیس فیصد حصہ ڈال سکے۔"

"اور ایسا ہو گا کون؟"

"خان صاحب!.... ان تینوں میں خطرناک آدمی فیروز خان رئیسانی ہے؟ کیوں نہ اسے تیس فیصد حصے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیں؟"

"درست۔" اسلم خان نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

"یہ تینوں ذاتی گاڑی لے کر آئے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ تینوں اپنی اپنی گاڑی میں ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ یہ کہیں اکٹھے ہو کر سازش تیار کرنے کی کوشش کریں میں ابھی رئیسانی کو کال کرتا ہوں۔" طاہر ملک موبائل فون نکال کر رئیسانی کا نمبر ملانے لگا۔

کال اٹینڈ ہوتے وہ جلدی سے بولا۔ ”رئیسانی صاحب!....ملک طاہر بات کر رہا ہوں۔ دیکھیں آپ تو خفا ہی ہو گئے۔“ پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ دوبارہ بولا۔ ”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں.... آپ میرے بھائی ہیں .... اچھا آپ خفا نہ ہوں آپ کے لیے ایک آفر ہے....ہاں ہاں صرف آپ کے لیے باقی دو خارج.... ایسا ہے کہ ہم آپ کو تیس فیصد حصہ دینے کے لیے تیار ہیں........ کیا؟............اچھا چلو ٹھیک ہے آپ کا حصہ پینتیس فیصد ہو گا، خان صاحب کا ساٹھ فیصد اور میرا وہی پانچ فیصد........ تو ڈن ہو گیا۔ ٹھیک ہے اب آپ واپس تشریف لے آئیں کھانا تو ہمارے ساتھ کھائیں ناں........ ٹھیک ہے آپ کال کر کے انھیں ٹرخا دیں ،میں اور خان صاحب آپ کے منتظر ہیں۔ خدا حافظ۔“

رابطہ منقطع کر کے اس نے مسکرا کر اسلم شکور کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ”چلیں خان صاحب!.... یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔“

اسلم شکور خان نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

پہلے آرڈر کی تکمیل کے ساتھ ہی اس نے انوار الحق اور اس کے بیٹوں کو خصوصی دعوت دی تھی۔ سارا محنت ہی انھی کی تھی۔ عمار کا کام تو بس مارکیٹوں میں گھوم پھر کر اپنے لیے آرڈر حاصل کرنے کا تھا۔ اگلا آرڈر اسے سو جیکٹوں کا ملا اور پھر وہ آرڈر ابھی زیر تکمیل تھا کہ ایک غیر ملکی فرم سے اسے اکٹھی پانچ ہزار جیکٹس کی ڈیمانڈ مل گئی۔ لیکن اس کے ساتھ مسئلہ یہ بنا کہ دو ماہ کے اندر انھوں نے مال پورا کر کے دینا تھا۔ وہ انوار الحق کے ساتھ بیٹھا اسی مسئلے پر سر کھپا رہا تھا۔

”عمار بھائی!.... آپ ان سے پچاس فیصد ایڈوانس رقم پکڑیں۔باقی اللہ مالک ہے۔“

”مگر، پانچ ہزار جیکٹس کی ڈیمانڈ دو ماہ میں دو کاریگروں کے ساتھ پوری کرنا شاید ممکن نہ ہو۔“

”دیکھیں آپ لیدر اور کپڑا منگوالیں۔کٹنگ کرنا میرا کام ہے۔باقی سلائی کی دس مشینیں ہمارے پاس موجود ہیں کاریگر بھی تلاش کر لیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ایک لمحہ سوچ کر عمار نے بھی آمادگی ظاہر کر دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی پرانی ڈاٹسن میں مطلوبہ فرم کی جانب بڑھا جارہا تھا۔وہاں ایک اور سرپرائز اس کا منتظر تھا ۔

”آپ کے تیار کردہ جیکٹس کے نمونے ہم نے ہیڈ افس بھجوائے تھے۔ کمپنی کے پرچیزنگ ڈائریکٹر کو وہ نمونے بہت پسند آئے۔اور انھوں نے پانچ ہزار کے بجائے دس ہزار جیکٹس خریدنے میں دل چسپی ظاہر کی ہے اور آپ کو تین ماہ میں مال کی فراہمی کو یقینی بنانا ہو گا۔“غیر ملکی فرم کے ایم ڈی نے لمبی چوڑی تمہید کے بجائے دو ٹوک بات کی تھی۔

”مگر تین ماہ....“عمار شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

”دیکھیں مسٹر عمار!....مال وقت پر ریسیو کرنا ہماری اولین ترجیح ہو گی۔“

”اگر آپ ڈیلیوری ٹائم تھوڑا بڑھا سکیں۔“

”مشکل ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمیں دس ہزار جیکٹس کے لیے بھی دو ماہ ہی کا عرصہ ملا تھا۔ یہ تو میں نے منت سماجت کر کے تین ماہ کا وقت حاصل کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں آپ نے نیا نیا کام شروع کیا ہے اور شاید اتنے کم وقت اتنی بڑی ڈیمانڈ پوری کرنا آپ کے لیے ممکن نہ ہو۔“

عمار سر پکڑ کر سوچ میں گم ہو گیا۔ یہ اس کے مستقبل کا مسئلہ تھا۔ اگر وہ یہ ڈیمانڈ مطلوبہ وقت میں پوری کر دیتا تو وہ نہ صرف مارکیٹ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا بلکہ مالی طور پر بھی بہتر پوزیشن میں آسکتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

”ٹھیک ہے سر!.... تین ماہ کے اندر آپ کو دس ہزار جیکٹس مل جائیں گی۔ آپ بس یہ بتا دیں کہ کون سا سیمپل کتنی مقدار میں درکار ہے۔“

اس نے اپنے سامنے رکھی فایل عمار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس میں معاہدے کی دو کاپیاں پڑی ہیں۔ میں نے اپنے دستخط کر دیے ہیں آپ بھی دستخط کر دیں۔ اور اس فایل میں ساری تفصیلات موجود ہیں۔“ اس نے ایک دوسری فائل بھی عمار کی جانب بڑھا دی۔

معاہدے کی فائل کا بہ غور مطالعہ کر کے عمار نے اپنے دستخط کیے اور ایک کاپی اس کی جانب بڑھا دی۔

”آپ اپنا اکاو□ٔنٹ نمبر بھی بتا دیں تا کہ ڈیمانڈ کی ساٹھ فیصد ادائی آپ کے اکاونٹ میں منتقل کر دی جائے۔“

عمار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا اکاونٹ نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یقیناً مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں پڑے گی کہ ناقص میٹریل یا غیر تسلی بخش کام ہماری ساکھ کو تو نقصان پہنچائے گا ہی آپ کے کیریئر کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈبو دے گا۔"

"ضرورت تو نہیں تھی، مگر بتا دیا تو اچھا لگا۔" عمار خوش دلی سے کہتے ہو کھڑا ہو گیا۔

کافی وہ پی چکے تھے۔ اس نے اجازت لی اور باہر وہاں سے باہر نکل آیا۔

گھنٹے بھر کی ڈرائیونگ کے بعد وہ انوار الحق کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"یہ تو بہت زیادہ ہے۔" ڈیمانڈ سن کر انوار الحق سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

"اب تو معاہدہ دستخط ہو گیا۔ اور آج یا کل تک ایڈوانس رقم بھی میرے اکاونٹ میں منتقل ہو جائے گی۔"

"عمار بھائی!.... یہ بہت مشکل کام ہے۔ کٹنگ کے معاملے میں میں اپنے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا اور دس ہزار جیکٹس کی ایسی کٹنگ کرنا۔ آپ جانتے ہیں میں معیار پر سودے بازی نہیں کرتا.... ایک جیکٹ کی کٹنگ کرنا ہو یا ایک ہزار کی میں مکمل دیانت داری سے کرتا ہوں۔ اور پھر ان جیکٹس کی سلائی کے لیے ہمیں کم از کم پندرہ بیس کاریگروں کی فی الفور ضرورت پڑے گی۔"

"انوار بھائی!.... سمجھ لیں کہ یہ ہمارے پاس پہلا اور آخری موقع ہے۔ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو یہ روشن مستقبل کی نوید ہو گا۔ دوسری صورت میں ہمارا کاروبار ایسا ٹھپ ہو گا کہ ہم کم از کم اس کاروبار میں دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"آپ نے ٹھیک ٹھاک مشکل میں ڈال دیا ہے۔" انوار الحق کی پریشانی قابلِ دید تھی۔

"آپ سو جیکٹوں والی ڈیمانڈ مکمل کریں۔ اس بارے کچھ سوچتے ہیں؟" عمار اسے طفل تسلی دیتا ہوا بولا۔

"وہ کل تک مکمل ہو جائیں گی۔" انوار الحق نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "اصل مسئلہ تو دس ہزار جیکٹس کا ہے نا۔"

"اللہ خیر کرے گا؟" عمار نے ساری پریشانیوں کا آخری حل بتایا۔

"ہاں...." انوار الحق نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اس کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔"

باپ سے ایک ماہ کی مہلت ملنے کے اگلے ہی دن اسوہ عمار کی تلاش میں گھر سے نکل پڑی۔ تلاشی کی ابتدا اس نے یونیورسٹی سے کی تھی۔ ریکارڈ کیپر کو چند ہزار پکڑا کر بھی اسے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ کیونکہ عمار کا وہاں پر انا پتا ہی درج تھا۔ یونیورسٹی سے نکل کر وہ ایک امید کے سہارے دوبارہ عمار کے پرانے گھر چلی گئی۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی نکلا۔

وہ سارا دن مختلف روڈوں پر گھومتی رہی۔ اس کی متلاشی نظریں چاروں جانب عمار کی صورت کی متلاشی رہیں۔ دن کا کھانا بھی اسی مٹر گشت کی نظر ہو گیا تھا۔ بس سہ پہر کو درمیانہ درجے کے ایک ہوٹل میں اس نے چائے کے ساتھ چند بسکٹ حلق میں اتارے تھے۔ درمیانہ درجے کے ہوٹل کے انتخاب کے پسِ پردہ بھی عمار کی تلاش کا جذبہ کار فرما تھا۔

شام کی آذان ہو رہی تھی جب وہ اپنی کوٹھی میں واپس پلٹی۔ اس کی ماں کو شاید اسلم شکور اصل بات بتا چکا تھا کہ اس نے زیادہ باز پرس نہیں کی تھی۔ رات کا کھانا اس نے اپنی خواب گاہ ہی میں منگوا لیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی عمار کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آ موجود ہوئی۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ اسے کیسے تلاش کرے۔ وہ شخص جسے سامنے موجود ہونے پر اس نے ہمیشہ ٹھکرایا تھا۔ اب جب کہ وہ چلا گیا تھا تو اس کا سارا سکون اور چین ہی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ پیاسی اور حسرت بھری نظریں جو ہر دم اس کے چہرے کی دید کی مشتاق ہوتیں، اب قصہ پارینہ بن چکی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اسی اتنا پیارا ہو سکتا ہے۔ کسی غریب کی محبت کا مذاق اڑانے والی کی اپنی زندگی مذاق بن گئی تھی

۔اب اس کے لیے یہ تصور کرنا ہی مشکل تھا کہ اس کی زندگی کا ساتھی عمار کے علاوہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔ مگر بات صرف اس کی نہیں تھی۔وہ تو ساری زندگی عمار کے انتظار میں بتا سکتی تھی۔لیکن رشتوں کی ان دیکھی زنجیروں اسے اپنی من مانی کہاں کرنے دیتی۔وہ اپنی خواہشات کا گلا تو گھونٹ سکتی تھی ماں باپ کی نافرمانی کس طرح کرتی۔

☆☆☆

”جی ابو جان!“عمار سلائی کی جا چکی جیکٹس کا جائزہ لے کر ان کی پیکنگ کر رہا تھا جب اسے والد کی کال موصول ہوئی۔

”یار!.... آج میں آفس سے لیٹ آو ں گا،اگر تم اپنی ماں کو کوئی سبزی وغیرہ لا دو؟“

”میں تو روزانہ ہی دیر سے جاتا ہوں۔“

”تو آج ذرا پہلے چلے جاو۔“

”ٹھیک ہے ابو جان!.... آپ اپنے والد ہونے کا جتنا چاہے فائدہ اٹھالیں، کبھی تو میں بھی باپ بنوں گا،دیکھنا کیسے گن گن کر بدلے لیتا ہوں آپ کے پوتے سے۔“

”یہ منہ اور مسور کی دال۔“بشیر احمد نے قہقہہ لگایا۔”پہلے میرے پوتے کی ماں تو پیدا ہونے دو۔“

عمار ترکی بہ ترکی بولا۔”وہ تو ایم اے بھی کر چکی ہے۔“

”ایم اے کے بعد،شادی بھی نہ کر چکی ہو برخوردار!....اور تم مجھے پوتوں کا نام لے لے کر خوش کرتے رہو۔“

"ابو جان!....شاید آپ مصروف تھے۔"

"ہاں میاں!....ٹرخانے کی توڈگری لی ہوئی ہے۔" کہہ کر بشیر احمد نے رابطہ منقطع کر دیا۔ جبکہ عمار، انوارالحق کو بتائے بغیر وہاں سے نکل آیا۔ والد صاحب کی وجہ سے اسوہ چند گھنٹے پہلے ہی اس کی یادوں میں آموجود ہوئی تھی ورنہ تو وہ اس وقت آتی جب وہ بستر پر سونے کے لیے لیٹتا تھا۔ اور پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سرخ بتی پر اپنی گاڑی روکتے ہوئے اس کی نظر ساتھ والی کار پر پڑی اور وہ بہ مشکل خود کو اچھلنے سے باز رکھ سکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اسوہ بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی سے گود میں پڑی سندھی اجرک اٹھا کر چہرے کے گرد لپیٹ لی۔ یہ اجرک وہ گرد و غبار سے بچنے کے لیے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا کیونکہ اس پرانی ڈاٹسن کی کھڑکیوں کے شیشے بند نہیں ہوتے تھے۔ اور فی الحال اس کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ڈاٹسن کی مرمت کرا سکتا۔

اسوہ کے سر پر اوڑھے دوپٹے نے اسے کافی حیران کیا تھا۔ کالے دوپٹے میں اس کا چہرہ یوں دمک رہا تھا جیسے بدلیوں کی ٹکڑی میں چاند چمکتا ہے۔ جتنی دیر وہ وہاں ٹھہری رہی اس کی متلاشی نظریں فٹ پاتھ کی جانب نگراں رہیں۔ عمار کو لگا جیسے وہ کسی کی تلاش میں ہو۔

"کہیں مجھے تو نہیں ڈھونڈ رہی۔" اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں ابھرا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی پھیل گئی۔ اتنی زیادہ نفرت کرنے والی لڑکی کا اسے ڈھونڈنا ایک عجوبہ ہی کہلا سکتا تھا۔

بتی کے سبز ہوتے ہی وہ آگے بڑھ گئی۔ عمار کے دل نے بہت واویلا مچایا مگر وہ اس کا تعاقب کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ اسوہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ اس کے تعاقب سے باخبر ہوتے ہی پولیس کو کال کر کے بلا لیتی۔ اور اب عمار کے بزنس کی عمارت جن کچی بنیادوں پر کھڑی تھی وہ کسی ایسے حادثے کی صورت میں زمین بوس بھی ہو سکتی تھی۔

اپنی گاڑی کا رخ اس نے سبزی منڈی کی طرف موڑا مگر اس سے پہلے ہی اسے روڈ کے کنارے سبزی کا ٹھیلا دھکیلتا ہوا ادھیڑ عمر کا ایک باریش شخص نظر آیا اور اس نے بے ساختہ اپنی ڈاٹسن سڑک کے ایک کنارے کر کے روک لی۔

اسے اپنی جانب آتا دیکھ کر وہ ٹھیلا روک کر عمار کو امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

ایسے آدمیوں سے عمار مول تول نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس نے بغیر ریٹ پوچھے اسے کلو پیاز، ٹماٹر، آلو اور مٹر تولنے کا کہہ دیا۔

وہ خاموشی سے تمام چیزیں تولنے لگا۔ اس کے چہرے سے ہویدا پریشانی عمار کی نظر سے اوجھل نہ رہ سکی۔ یوں تو پاکستان میں مزدوری کرنے والے ہمیشہ ہی پریشانی کی زد میں رہتے ہیں، مگر وہ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہا تھا۔

”خیریت تو ہے بزرگو!....پریشان نظر آ رہے ہو؟“

”نن.... نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔

”اچھا۔“ کہہ کر عمار نے پیسے پوچھے۔

”دو سو۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

عمار نے مطلوبہ پیسے نکال کر اس کے حوالے کیے۔ اور واپس مڑنے ہی لگا تھا کہ اس نے کہا۔ ”بھائی جان! بات سنیں؟“

”جی؟“ عمار رک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

وہ لجاجت سے بولا۔ ”اگر آپ مزید سبزی خریدنا چاہیں، تو اس سے بھی سستی لگاؤں گا۔“

”سبزی تو میں خرید لوں گا، مگر آپ پریشانی تو بتائیں؟“ عمار کو ایک بار پھر اس کی پریشانی کی کرید ہوئی۔

”وہ جی!.... بیوی کی طبیعت کل سے خراب ہے اور کل بھی اتنے پیسے نہیں بچا پایا تھا کہ اس کی دوائی خرید پاتا۔ آج بھی سہ پہر ہونے کو ہے بہ مشکل تین سو کما پایا ہوں۔ دو سو روپے ٹھیلے کا کرایہ دے کر سو روپیا ہی جیب میں بچے گا، اس سے بیوی کی دوائی خریدوں یا رات کے کھانے کے لیے روٹیاں۔“

ایک تلخی سی عمار کے اندر گھل گئی تھی۔ یہ ہماری قوم کا المیہ ہے کہ کسی کے تو کتوں کو بھی امپورٹڈ غذا کھانے کو ملتی ہے۔ اور کسی کے بچوں کو بھی بھوکا سونا پڑتا ہے۔

”اچھا ایسا کرو مجھ سے کچھ رقم ادھار لے لو۔ تھوڑے تھوڑے کر کے واپس دے دینا؟“

”تھوڑے تھوڑے۔“ اس کے منہ سے زہریلی ہنسی برآمد ہوئی۔ ”بھائی جی ہوتے ہی تھوڑے ہیں۔ اگر اکٹھے کر سکتا تو ایک ٹھیلا ہی نہ خرید لیتا۔“

”کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟“

”عام مزدوری کی بھی یہی حالت ہے اور پھر اس کا تو یہ مسئلہ بھی ہے کہ کبھی مل گئی اور کبھی نہ ملی۔“

”اچھا ٹھیک ہے آپ یوں کریں کہ یہ تمام آلو اور پیاز تول دیں؟ بلکہ مٹر بھی تول دیں صرف ٹماٹر رہنے دیں کہ یہ جلد خراب ہو جاتے ہیں۔“

”جی بھائی صاحب!“ کہہ کر وہ خوشی سے سبزی تولنے لگا۔

آلو، پیاز کے بھرے تھیلے خالی سیٹ پر رکھ کر عمار اسے رقم ادا کرنے لگا۔

"شکریہ بھائی صاحب!.... اللہ پاک آپ کی مشکلیں آسان کرے۔"

عمار دل میں خوشی کی لہر محسوس کرتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ٹھیلا والا وہیں کھڑا شکر گزار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھانے ہی لگا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سکرین پر نظر ڈالنے پر اسے انوار الحق کا نمبر چمکتا نظر آیا۔

"جی انوار بھائی"!

"آپ پیکنگ کرتے کرتے کہاں غائب ہو گئے؟"

"میں ایک چھوٹے سے کام کے لیے نکلا تھا، بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"عمار بھائی!.... آپ کو پہلے بھی عرض کیا ہے کہ پیکنگ کے لیے کوئی ایک ادھ مزدور رکھ لیں۔ خواہ مخواہ آپ کو تکلیف کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے پاس بھی اتنا وقت نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے انوار بھائی!.... میں کچھ کرتا ہوں۔" رابطہ منقطع کر کے وہ دوبارہ باہر نکل آیا۔

"بزرگو!.... آپ کا نام نہیں پوچھ سکا تھا۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "عبدالحکیم"!

"عبدالحکیم بھائی آپ کا گھر کہاں ہے؟"

"یہ ساتھ ہی میں ہے۔"اس نے قریب کی کچی آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا ایسا ہے میں یہ سامان گھر چھوڑنے جارہا ہوں آپ واپسی پر مجھے اسی جگہ ملیں، آپ کے لیے ایک آسان کام ڈھونڈ لیا ہے۔"

"کام ؟"اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"ہاں کام .... آپ کے مطلب کا ہے۔ ٹھیلے سے زیادہ آمدن ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے جی !"اس نے خوش دلی سر ہلایا۔"میں بس یہ ٹھیلا چھوڑ کر آتا ہوں۔"

"اور ہاں یاد آیا؟بیوی کو کس وقت ڈاکٹر کو دکھاو ٔ گے۔"

"اسے رقم دے دوں گا، بڑی بیٹی کے ساتھ چلی جائے گی۔ ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر کا چھوٹا سا کلینک موجود ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"عمار دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب بڑھ گیا۔

"بیٹا!.... مہینے بھر کی سبزی اٹھا لائے ہو؟"ماں نے اس کے ہاتھ میں سبزی کے بھرے تھیلے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں ناماں جی !....اب ابو جان کو تو گھر کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ شام ہونے والی ہے اور اب تک ان کا کوئی پتا نہیں ہے۔"

"اچھا آنے دو آج، پہنچادوں گی تمھاری شکایت۔"سکینہ نے ہنس کر کہا۔

”ٹھیک ہے ماں جی !.... آپ جانیں اور ابو جان مجھے اس لڑائی میں نہ گھسیٹا کریں۔“

”اب کہاں چل دیے۔“ اسے گھر سے نکلتے دیکھ کر ماں نے آواز دی۔

”امی جان !.... کام ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔“ کہہ کر وہ گھر سے نکل آیا۔

مطلوبہ جگہ پر عبدالحکیم اسے منتظر نظر آیا تھا۔ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر وہ اپنے دو کمروں پر مشتمل چھوٹے سے کارخانے میں پہنچ گیا۔

راستے میں وہ اسے کام کی تفصیل بتاتا رہا۔ کارخانے میں میں پہنچ کر اس نے اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا کام کوئی اتنا ٹیکنکل تو تھا نہیں، آسانی سے عبدالحکیم کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

شام کی نماز انھوں نے قریبی مسجد میں پڑھی تھی۔ مسجد سے واپس آتے ہوئے عبدالحکیم پریشانی سے بولا ۔”عمار صاحب !رات کو کام کرنا میرے لیے مشکل ہو جائے گا، کیونکہ گھر میں میرے علاوہ کوئی مرد نہیں ہے ۔“

”ٹھیک ہے، کل سے آپ سویرے آ جایا کرنا اور عصر کے وقت چھٹی کر لینا۔ ابھی تو آپ کو لانے کا مقصد یہ جگہ دکھانا تھا۔“

”شکریہ صاحب جی !“ عبدالحکیم سلام کہہ کر رخصت ہو گیا۔ انوار لحق کو بھی عبدالحکیم پسند آیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن اسوہ کسی موہوم امید کے سہارے اسماء کے گھر پہنچ گئی تھی۔وہاں جا کر اسے ایک خوشگوار خبر سننے کو ملی ۔مدثر اور اسماء کی منگنی ہونے والی تھی۔

"ارے چوری چوری، اتنا بڑا فیصلہ ؟" اس نے خوشگوار حیرانی سے پوچھا۔

"چوری، چوری کہاں اسوہ بہن!....مدثر صاحب، کب سے پیچھے پڑے تھے۔"

"مدثر،....صاحب کب سے ہو گیا؟" اسوہ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"مجبوری ہے۔اب تو، وہ کیا کہتے ہیں....مجازی خدا بننے والا ہے۔"

"ویسے آج کل مدثر بھائی کر کیا رہا ہے ؟"

"ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انھیں بہت اچھی جاب ملی ہے۔"

"انھیں....بہت خوب۔" اسوہ، اسماء کے انھیں پر محظوظ ہوتی ہوئی بولی۔

"یہ جب پوچھوں گی جب آپ کسی کو انھیں کہنے پر مجبور ہوں گی۔"

اسماء کی بات پر وہ ایک دم افسردہ ہو گئی۔۔

"چپ کیوں ہو گئی ہو؟" اسے خاموش پا کر اسماء نے قریب ہو کر اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ لے لیا۔

"اسماء!....پاپا مجھے شادی کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔"

"یہ انکل کی مجبوری ہے.... ہر ماں باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی جلد سے جلد اپنے گھر کی ہو جائے ۔"

"صحیح کہا، مگر میں کیا کروں۔ میں اس کے علاوہ کسی کو بھی یہ مقام نہیں دے سکتی۔"

"اس کا کوئی اتا پتا نہیں چلا؟"

"نہیں...." اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بلکہ یہاں بھی ایک موہوم امید کے سہارے آئی ہوں کہ شاید تمھارے پاس کوئی ہلکا سا سراغ مل جائے۔"

"اگر ایسا کوئی سراغ ہوتا تو میں سب سے پہلے اپنی بہن کو مطلع کرتی۔"

"شاید وہ اب کبھی نہیں ملے گا یا اس وقت ملے گا جب اس کا ملنا نہ ملنا ایک برابر ہوں جائیں گے۔"

"ایسا نہیں کہتے پگلی!.... اللہ بہتر کرے گا۔" اسماء نے اس کا سر اپنے کندھے کے ساتھ لگا لیا۔

"اسماء!.... جانتی ہو؟ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتا تھا۔ اتنا کہ جس کے بارے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اب جانے اسے کیا ہوا ہے؟ اب تو یہ حالت ہے کہ....

خواب میں بھی وہ اب نہیں آتے

نفرتیں ان دنوں عروج پر ہیں

"نہیں وہ تم سے نفرت نہیں کر سکتا۔ اس کے دل میں بس یہ غلط فہمی جڑ پکڑ گئی ہے کہ وہ تمھارے دل سے نفرت ختم نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے وہ اب بھی کہیں نہ کہیں تمھیں چھپ چھپ کر دیکھتا ہو گا۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”ایسی خوش فہمیاں کبھی کبھی میرے دل میں بھی سر اٹھانے لگتی ہیں۔“

”اچھا اگر وہ مل جائے تو کیا انکل تم دونوں کی شادی کے۔ لیے مان جائیں گے ؟“

”ہاں نا.... یہی دکھ تو کھائے جارہا ہے۔ پاپا راضی ہو گئے ہیں۔ بلکہ عمار کو ڈھونڈنے کے لیے انھوں نے مجھے ایک ماہ کی مہلت دی ہے۔ اگر میں اس دوران عمار کو تلاش نہیں کر پائی تو پھر وہ ایک ایم این اے کے بیٹے سے میری نسبت طے کر دیں گے۔“

”ان شاء اللہ وہ اس ایک ماہ میں کہیں نہ کہیں نظر آ جائے گا۔“ اسماء نے خلوص دل سے کہا۔

”اللہ پاک تمھاری زبان مبارک کرے۔“ اسوہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

”ویسے ایک نئی تبدیلی نظر آ رہی ہے۔“ اسماء نے اس کے سلیقے سے اوڑھے ہوئے دوپٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں موضوع بدلا۔

”ہاں۔“ اسوہ نے پھیکی ہنسی سے کہا۔ ” اللہ پاک کی یاد مصیبت میں آتی ہے یا محبت میں۔“

”گویا عبادت کی جا رہی ہے۔“

”عبادت کا تو پتا نہیں.... حاضری لگوانا شروع کر دی ہے۔“

”ایک بات کہوں۔“

”تمھاری سننے ہی تو آئی ہوں۔“

"عمار تمھیں کبھی بھی نہیں بھلا سکتا۔ وہ چاہے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اور یاد رکھنا محبت جوابی محبت کے مرہونِ منت نہیں ہوتی اور نہ محبوب کی نفرت کو دیکھ کر دل سے رخصت ہوا کرتی ہے۔ محبت تو بس ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔"

"اب جب کہ میرے دل کو یہ روگ لگ گیا ہے.... تو اس کی محبت کہاں جا چھپی ہے.... وہ کیوں نہیں میرے سامنے آتا....؟ کیوں نہیں مجھے یقین دلاتا کہ وہ اب بھی میرا ہے؟.... کیوں نہیں کہتا اس نے میری ساری خطاؤں کو معاف کر دیا ہے؟ کیا مجھے سزا دینا چاہتا ہے؟.... مجھے سبق سکھانا چاہتا ہے؟.... یا وہ یہ بات نہیں جانتا کہ ایک مشرقی لڑکی کتنی بے بس ہوتی ہے۔ میں کب تک انتظار کی سولی پر لٹک سکتی ہوں، جانتی ہو کہ حوصلے اور امید کا خون جتنا بھی وافر ہو، بہنے لگ جائے تو ختم ہونے میں دیر نہیں لگتی۔"

"اسوہ بہن!.... جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔"

"مگر، مجھے کوئی اچھائی کیوں نہیں نظر آ رہی۔" اسوہ روہانسی ہونے لگی تھی۔

"کیونکہ، مستقبل صرف اللہ پاک کی نظر میں ہوتا ہے۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔" اسوہ نے جانے کی اجازت چاہی۔

"نہیں، تم بغیر کھانا کھائے کیسے جا سکتی ہو۔" اسماء نے حتمی لہجے میں کہا اور اسوہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ بیٹھنا پڑ گیا تھا۔

"رباب کا نمبر نہیں مل رہا ہے۔" اسماء نے اس کی گہری سہیلی کو یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو گئی ہے۔“

”واہ، بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔“

”دو تین ماہ پہلے کی بات ہے۔ پھر یوں بھی فائنل سمسٹر کے بعد ہمارا رابطہ رہا بھی کہاں ہے۔“

”صحیح کہتی ہو اسوہ بہن!.... عملی زندگی پرانی دوستیاں بھی بھلا دیتی ہے۔“

”عملی زندگی نہیں اسماء!....نئے رشتے کہو۔ جب تمھاری اور مدثر بھائی کی بھی شادی جائے گی تو دیکھنا یہ جو تم مجھے کبھی کبھار کال کر لیتی ہو یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔“

”بھول ہے تمھاری۔“ اسماء پر عزم لہجے میں بولی۔ ”میں سب سے رشتا ختم کر سکتی ہوں تم سے نہیں۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ اسوہ نے کہا اور وہ دونوں ہنس دی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن انھوں نے سو جیکٹوں والا آرڈر پورا کر دیا تھا۔ جیکٹیں مطلوبہ سٹور پر پہنچا کر عمار نے بقیہ معاوضا وصول کیا اور واپس کارخانے میں پہنچ گیا۔ انوار نے نئے آرڈر پر کام شروع کر دیا تھا۔

عمار کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

”عمار بھائی!.... آج آپ کو ایک دوسری جگہ دکھانی ہے۔ یہاں اب اپنا گزارا نہیں ہونے والا۔

”صحیح کہہ رہے ہو....دو کمروں میں کہاں گزارہ ہو سکتا ہے۔“ عمار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اچھایوں ہے کہ آپ مکان دیکھنے چلے جائیں۔میں پراپرٹی ڈیلر سے بات کر چکا ہوں۔وہ آپ کو جگہ دکھا دے گا۔میں اپنے ایک دوست کو ملنے جاتا ہوں۔معاوضے کے معاملے میں وہ اپنے مالکان سے کچھ خفا خفا سا ہے ۔دیکھتا ہوں اگر اس کا معاوضا اپنی استطاعت میں آتا ہے تو ہمیں کافی سہولت ہو جائے گی۔“

”بہت اچھی بات ہے۔“ عمار نے فوراًاثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر چلو۔“انوار الحق کھڑا ہو گیا۔

اسے مذکورہ دوست کے گھر اتار کر عمار پراپرٹی ڈیلر سے ملنے چل پڑا۔انوار الحق، پراپرٹی ڈیلر کو عمار کے متعلق بتا چکا تھا اس لیے بغیر کسی تمہید کے وہ عمار کو فوراًمطلوبہ مکان دکھانے لے گیا۔سات کمروں پر مشتمل وہ دو منزلہ عمارت عمار کو بہت پسند آئی تھی۔اس نے فوراًکرایہ نامہ دستخط کر کے ایڈوانس رقم ادا کی اور عمارت کی چابی لے کر واپس لوٹ آیا۔

انوار الحق بھی کامیاب لوٹا تھا۔سہ پہر تک انھوں نے نئی جگہ پر اپنا سامان منتقل کر دیا تھا۔

چاے منگوا کر وہ آنے والے تین مہینوں میں اپنے کام کی تکمیل کے بارے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔اگلے دن عمار کی ذمہ داری لگی تھی کہ وہ کاریگروں کی تلاش کے لیے اخبار میں اشتہار شائع کرائے۔اس کمپنی کا سیلنگ، پرچیزنگ اور مارکیٹنگ ڈائریکٹر عمار ہی تھا۔

وہ اشتہار کا مضمون ہی ڈسکس کر رہے تھے کہ اچانک عبد الحکیم نے پوچھا۔

”عمار صاحب!....کیا لڑکیاں بھی ملازم رکھیں گے ؟“

”ہاں....اگر وہ کام جانتی ہیں تو کیوں نہیں؟“

”اگر ایسا ہے تو........“وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

”کہو کہو عبدالحکیم!....آپ بھی ہمارے بزنس کا حصہ ہو۔ہمارے ہر ساتھی کا مشورہ اتنا ہی قابل احترام ہے جتنا میرا ایاانوارالحق بھائی کا۔“

”وہ میں کہہ رہا تھا کہ....میری دونوں بیٹیاں بہت اچھی سلائی جانتی ہیں۔لڑکیوں کے لباس کے بہت اچھے ڈیزائن بناتی ہیں۔لیکن آپ جانتے ہوں گے کہ ہم جیسے غریبوں سے سلائی کرانے والی عورتیں بھی ایسی ہوتی ہیں جو بہ مشکل پچاس ساٹھ روپے ہی سوٹ کی سلائی دے پاتی ہیں۔“

”اور آپ انھیں یہاں لانا چاہتے ہیں؟“عمار نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

”ہاں،میرا خیال ہے انھیں کٹنگ کی ہوئی جیکٹوں کی سلائی میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔اور پھر میں خود یہاں موجود ہوں تو مجھے ان کے بارے کوئی فکر بھی نہیں ہوگی۔“

”بالکل ٹھیک۔“عمار سے پہلے انوارالحق نے کہا۔”ایسا کریں گے کہ اوپری منزل میں خواتین کے لیے سیٹ اپ بنادیتے ہیں۔اپ کل ہی ہماری بھتیجیوں کو لے آئیں۔“

”مہربانی صاحب!“عبدالحکیم عاجزی سے بولا۔

”مہربانی کا کیا مطلب بھائی!....ہمیں خود اچھے کارکنوں کی ضرورت ہے۔“

انوارالحق کے بیٹے سراج نے کہا۔"عمار صاحب!.... ہمارے بھی کچھ ایسے دوست ہیں جو اپنے موجودہ مالک سے تنگ ہیں۔ ہم انھیں یہاں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"درست ہے۔سب کو اجازت ہے کہ وہ سلائی والے اچھے کاریگر ڈھونڈ کرلے آئے۔بلکہ آج چھٹی کرتے ہیں، کل دوپہر تک سب کو یہاں بلالیں۔"عمار کی بات پر سب اثبات میں سرہلاتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

☆☆☆

سارا مہینا اسوہ پاگلوں کی طرح عمار کی تلاش میں سرگرداں رہی۔اس پریشانی میں وہ اسماء اور مدثر کی منگنی کی تقریب کو بھی صحیح طریقے سے وقت نہیں دے پائی تھی۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس کے باپ کی دی ہوئی مہلت اختتام پذیر ہوئی۔وہ رات اس نے مرغ بسمل کی طرح بستر پر کروٹیں لیتے گزاری۔جب کسی طور سکون نہ آیا تو رب کے حضور مصلے پر جا کھڑی ہوئی۔یوں بھی جب ایک انسان کو انتہائی طاقت، دولت اور اختیار خرچ کرنے بعد ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کا آخری سہارا اللہ پاک کی ذات ہی ہوتی ہے۔یہ علاحدہ بات کہ ہر با اختیار یا بے اختیار کا پہلا سہارا بھی وہی وحدہ لاشریک ذات ہے۔مگر یہ ایک انسان کی سمجھ میں تب آتا ہے جب اسے سارے اختیار، ساری دولت، ساری طاقت رکھتے ہوئے بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔پھر ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ رب کے سامنے حاضری دینے والے کو اپنے ضمیر کے سوالات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔اپنے رویے اور اپنے کیے کا بھی حساب دینا پڑتا۔وہ رحیم ذات ہر گناہ معاف کرنے پر تیار بیٹھی ہے لیکن یہ وعدہ بھی تو آخرت کے ساتھ مقیّد ہے۔

رب کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہوئے اس کی بے قراری کو صبر کے سلیقے سے آشنائی ہوئی اور وہ اپنے مقدر کا سامنا کرنے پر تیار ہو گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر اسلم شکور نے حتمی لہجے میں کہہ دیا۔

"آج سید فرقان علی شاہ کی اہلیہ اور بچیاں تمھیں دیکھنے آ رہی ہیں ذرا ڈھنگ سے تیار ہو جانا۔"

"جی پاپا!...." اس کے ہونٹوں سے بہ مشکل نکلا۔ اس کے والد نے ایک ماہ انتظار کر کے اپنا ظرف ثابت کر دیا تھا۔ اب اس کی بات مان کر اسوہ کو اپنی زبان کی لاج رکھنا تھی۔

دوپہر ڈھلے ملازمہ نے اسے مہمانوں کی آمد کا بتا کر نیچے ڈرائینگ روم میں اس کے بلاوے کا روح فرسا پیغام سنایا۔

اس نے کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی، مگر اس کی دلکشی اور حسن کو کسی پہناوے یا سجاوٹ کی ضرورت نہیں تھی ۔لڑکے کی ماں اور بہنوں نے فوراًاپنی پسندیدگی کی سند سے نواز دیا تھا۔ لڑکے کی تصویر بھی وہ ساتھ لائی تھیں ۔نسرین بیگم کو بھی لڑکا پسند آیا تھا۔

لڑکے کی ماں شگفتہ بیگم نے فوراً بیٹیوں کو مٹھائی کا ڈبہ کھولنے کا اشارہ کیا۔

ہونے والی ساس کے ہاتھ میں موجود قیمتی مٹھائی اسے زہر کی مانند لگی تھی۔ کسی انجان کی زندگی کا حصہ بننے پر اسے کس اذیت کا سامنا کرنا ہو گا وہ یہ بات بالکل اس طرح محسوس کر سکتی تھی جیسے خوں خوار شیر کے سامنے دوڑتا ہوا ہرن کو شیر کے دانتوں سے کٹنے والی اذیت کو بغیر تجربے کے محسوس کر سکتا ہے۔ مگر یہ زہر زندگی کا حصہ ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی تلخیوں کو اپنانا پڑتا ہے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔اس کی ماں، لڑکے کی تصویر اس کے کمرے میں چھوڑ گئی تھی۔خوب صورتی میں وہ لڑکا کسی طور پر بھی عمار سے کم نہیں تھا۔مگر دماغ کے ایسے دلائل۔دل کسی طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔اگر وہ لڑکا یوسف ثانی بھی ہوتا تو اسے عمار کے بدلے میں قبول نہیں تھا۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دل حقائق کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ تساہل برتتا ہے۔

اپنے والد سے اس کی ملاقات رات کو کھانے کی میز پر ہوئی تھی۔

"بیٹی!....مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔یاد رکھنا سراب کے پیچھے دوڑنے والے کو ناکامی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"جی پاپا!"اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"عرفان علی شاہ، ہر لحاظ سے اچھا لڑکا ہے۔خوب صورت ہے، پڑھا لکھا ہے، خاندانی رئیس ہے اور سب سے بڑھ کر اس خاندان کی سیاسی ساکھ بہت اچھی ہے۔"

"کیا خوشگوار زندگی گزرنے کے لیے یہ ساری چیزیں ضروری ہوتی ہیں؟" غیر ارادی طور پر اس کے لہجے میں تلخی شامل ہو گئی تھی۔

"نہیں۔لیکن ایک آئیڈیل داماد کی ساری خصوصیات مجھے عرفان علی شاہ میں نظر آ رہی ہیں۔"

"پاپا!....زندگی میں نے گزارنی ہے۔"

"تو کیا تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو؟"

"ہونہہ!" بے بسی اور بے چارگی کا گہرا احساس لیے اس کے ہونٹ وا ہوئے۔ "میرا جواب آپ جانتے ہیں۔"

"مجھے جواب نہیں، اس رشتے کا متبادل چاہیے.... بے شک مساوی نہ ہو۔"

"میں نے انکار تو نہیں کیا۔" اسوہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"تمھیں انکار کرنا بھی نہیں چاہیے۔ نہ تو میں تم پر ظلم کر رہا ہوں اور نہ تمھارا برا چاہتا ہوں۔"

"پاپا!.... کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی ماں باپ ایسے فیصلے کر لیتے ہیں جن سزا اولاد کو بھگتنا پڑتی ہے۔"

"بالکل صحیح کہا۔ اسی لیے تو میں نے تمھارے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے دماغ کی بات مانی ہے۔ ورنہ وقتی طور پر میں بھی تمھاری بات مان کر تمھاری شادی کو التوا میں ڈال سکتا تھا۔ اور یقیناً اس کا نتیجہ تمھارے حق میں اچھا نہ نکلتا۔" اسلم شکور کا حقائق کو مد نظر رکھ کر کیے گئے فیصلے کو اسوہ کسی طور غلط ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس لے دے کے ایک ہی دلیل تھی کہ وہ عمار سے محبت کرتی ہے۔ گو یہ دلیل اس کے ہر عقلی فیصلے پر حاوی ہو سکتی تھی، مگر والدین یا کسی دوسرے مخلص شخص سے ایسا فیصلہ منوانا ممکن نہیں تھا۔

"میں جا رہی ہوں پاپا!.... شب بخیر۔" وہاں سے چلے جانے ہی میں اس کی بھلائی تھی۔ اپنے باپ کے دلائل کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ نسرین بیگم نے اس دوران کوئی بات نہیں کی تھی۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ ایک اسلامی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ اس کے موبائل فون پر نامعلوم نمبر سے کال آنے لگی۔ پہلی ایک دو گھنٹیاں تو اس نے فون کو نظر انداز کیے رکھا مگر بار بار بجنے والی گھنٹی نے اسے کال رسیو کرنے پر مجبور کر دیا۔

"جی؟"

"اسلام علیکم!....میں سید عرفان علی شاہ بات کر رہا ہوں۔" اس کا لہجہ کافی سلجھا ہوا اور مہذب تھا۔ "آپ مس اسوہ اسلم شکور بات کر رہی ہیں نا۔"

"جی!" اس مرتبہ بھی اس کا جواب مختصر رہا تھا۔

"آج امی جان آپ کی تصویر لائی تھیں....میری تصویر بھی آپ نے دیکھ لی ہو گی؟"

"جی!" اس نے لگا بندھا جواب دیا۔

"کیا جی! کے علاوہ آپ کو کچھ بولنا نہیں آتا؟"

"بات بولنے کی نہیں، مخاطب کو اپنا مطلب واضح کرنے کی ہوتی ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ جی سے آپ کی بات کا مکمل جواب مل رہا تھا۔" اس کے لہجے میں تو نہیں انداز میں ضرور تلخی شامل تھی۔

"ہا....ہا....ہا۔" اس نے زبردستی قہقہہ لگایا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ مباحثہ کی ماہر ہیں۔"

عرفان صاحب کوئی ضروری بات کرنا تھی آپ نے؟" اسوہ کو اس کی باتیں برداشت کرنا مشکل ہو رہی تھیں۔

"بس یہی پوچھنا تھا کہ کہیں آپ کو زبردستی تو اس رشتے پر مجبور نہیں کیا جا رہا؟"

"بالفرض اگر ایسا ہی ہو تو آپ کیا کریں گے؟"

"آپ کی تصویر دیکھنے کے بعد تو یہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں اور آپ کو ہر خوشی دینے کا وعدہ کروں۔"

”چلو مبارک ہو، آپ ایسی کوشش اور ایسے وعدوں سے بچ گئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے آپ کو بھی یہ رشتا دل وجان سے قبول ہے۔“

”عرفان صاحب!....مجھے یہ رشتا قبول ہے۔باقی سابقے لاحقے رہنے دیں۔اور اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں آپ کو خدا حافظ کہنا چاہوں گی۔“

”او کے، خدا حافظ۔پھر بات ہو گی۔“اس نے اسوہ کا مطمح نظر جان کر رابطہ منقطع کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی ۔

☆☆☆

ان کے پاس سلائی کرنے والے نو کاریگر جمع ہو گئے تھے۔جن میں چار لڑکیاں اور انوار لحق کے بیٹوں کو ملا کر پانچ مرد بن رہے تھے۔لڑکیوں کے لیے عمار نے اوپر والی منزل مختص کر دی تھی۔نچلی منزل کے ایک کمرے میں اس نے اپنے لیے آفس سیٹ کر دیا۔سیکنڈ ہینڈ ٹیبل، پلاسٹک کی چند کرسیاں، کمپیوٹر وغیرہ کی آمد کے ساتھ وہ کمرہ آفس کی شکل میں ڈھل گیا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر اس نے دس اور سلائی مشینیں خرید لیں۔عبدالحکیم کی بیٹیاں اپنی چند اور سہلیوں کو بھی وہاں لے آئی تھیں۔اور کاریگروں کی تعداد نو سے بڑھ کر پندرہ تک پہنچ گئی تھی۔وہ ڈیمانڈ جس کا پورا کرنا انھیں ناممکن لگ رہا تھا، اب وہ ناممکن نہیں رہا تھا۔عمار کا اخلاق دیکھتے ہوئے تمام کاریگر جی جان سے کام کر رہے تھے ۔سب سے زیادہ بوجھ خود انوار الحق اور اس کے ساتھی قمر الدین پر تھا۔

سات ہفتوں میں انھوں نے پانچ ہزار جیکٹس تیار کر لی تھیں۔ پیکنگ کے لیے عمار نے دو اور لڑکے رکھ لیے تھے۔ عبدالحکیم اب چپڑاسی وچوکیدار وغیرہ کی ڈیوٹی کرتا۔ چائے وغیرہ کا سامان وہاں موجود تھا۔ جس کو چائے کی طلب ہوتی عبدالحکیم کو بتادیتا۔

پانچ ہزار جیکٹس عمار نے اس غیر ملکی فرم کے حوالے کر دی تھیں۔ اور اگلے پانچ ہفتوں میں بقیہ جیکٹس کی سلائی کے لیے انھوں نے کام کا دورانیہ بڑھا دیا تھا۔ خواتین کے لیے رات گئے گھر جانے میں مسئلہ بن رہا تھا اس کا حل عمار نے ایک وین خرید کر نکال لیا تھا۔ چند دن تو وہ خود انھیں ڈراپ کرتا رہا، بعد میں یہ کام انوار الحق کے چھوٹے بیٹے منیر نے سنبھال لیا تھا۔

پانچ ہفتوں میں جاں فشانی سے محنت کر کے انھوں نے بقیہ جیکٹس بھی سلائی کر لی تھیں۔ آرڈر کی تکمیل کی خوشی میں عمار نے تمام کاریگروں کو ایک اچھی سی دعوت کھلا کر تین دن کی چھٹی بھی بہ طورِ انعام دے دی تھی ۔البتہ اس دوران وہ اور انوار الحق آفس آتے رہے تھے۔

وہ اس وقت آفس میں بیٹھے محو گفتگو تھے۔ عبدالحکیم نے ان کے سامنے چائے کے دو کپ رکھے اور اپنا کپ لے کر وہیں ان کے ہمراہ ہی بیٹھ گیا۔ عمار کی عادت تھی کہ وہ دفتر میں کام کرنے والے تمام افراد کو اتنی ہی عزت اور احترام دیتا تھا جتنا کہ وہ اس کا احترام کرتے تھے۔ اس وقت باقی لوگ چھٹی پر تھے۔ عبدالحکیم کو انوار الحق کے کہنے پر عمار نے بلوایا تھا۔

”جی انوار بھائی!....اب کہیں کہ آپ نے چچا عبدالحکیم کو کیا کہنا تھا۔“

انوار الحق کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر گویا ہوا۔

”عمار صاحب!....میں چچا عبدالحکیم کی دو قیمتی چیزوں کا طلب گار ہوں۔اس ضمن میں مجھے آپ کی سفارش بھی درکار ہو گی۔“

چائے کا گھونٹ بھرتے عبدالحکیم نے اس کی بات سن کر چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

”مم....میرے پاس بھلا کون سی قیمتی چیز ہے انوار صاحب!“اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ تو خیر آپ کی کسرِ نفسی ہے۔بہ ہر حال میں بتائے دیتا ہوں؟....میں شمائلہ اور ثوبیہ کو اپنی بیٹیاں بنانا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“ اس کی بات سن کر عمار بھی حیران رہ گیا تھا۔

”جی بالکل اور میری اس خواہش میں میرے بیٹوں کی رضامندی شامل ہے۔سراج شمائلہ کو اپنانا چاہتا ہے جبکہ منیر ثوبیہ کو۔“

عبدالحکیم کی آنکھوں میں نمی ابھری اور وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔”انوار صاحب!.... آپ ہماری غربت سے تو واقف ہیں نا۔“

”مجھے جہیز میں دلہن کا پہلی رات کا جوڑا بھی نہیں چاہیے بس دونوں بیٹیاں میری جھولی میں ڈال دو۔‘

”اس سے بڑھ کر ایک باپ اپنے رب سے کچھ مانگ بھی نہیں سکتا۔“عبدالحکیم رقت آمیز لہجے میں بولا۔

"اب اس مٹھائی کا معمّا حل ہو گیا عمار صاحب!" انوار الحق نے ہنستے ہوئے میز کی دراز سے مٹھائی کا ڈبا نکال کر عمار سے پوچھا۔ جس دن سے وہ اس مکان میں منتقل ہوئے تھے اور عمار کا آفس بنا تھا وہ سب کے لیے عمار بھائی سے عمار صاحب ہو گیا تھا۔

مٹھائی کھاتے ہوئے عمار نے کہا۔ "ایک بات آپ دونوں حضرات دھیان سے سن لیں۔ یہ نہیں ہو گا کہ شادی کے بعد میری بہنوں کو گھر بٹھا دیا جائے؟ وہ صرف ایک ہفتے کی چھٹی لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد کام پر آنا پڑے گا۔"

"ویسے ایک ہفتہ کم نہیں ہے سر!؟" انوار الحق نے مسکرا کر احتجاج کیا۔

بالکل نہیں۔ البتہ وہ یہ ہفتہ کراچی سے باہر گزارنا چاہیں تو اس کا خرچ "یو اے" کمپنی برداشت کر سکتی ہے۔"

"عمار صاحب!.... یہ یو اے سے بنتا کیا ہے؟" انوار الحق نے دلچسپی سے پوچھا۔ "آپ نے جیکٹس پر بھی یہ مونو گرام بڑے اشتیاق سے لگوایا تھا۔"

"انوار بھائی جب بھی کوئی پراڈکٹ مارکیٹ میں آتی ہے اسے کوئی نہ کوئی مونو گرام تو چاہیے ہوتا ہے نا.... تو ہمارا مونو گرام "یو اے" سہی۔"

"کوئی وجہ تسمیہ بھی ہو گی؟"

"ہاں وجہ تو ہے.... 'عمار گہری سوچ میں کھو گیا اسوہ کا ملیح چہرہ اس کی نگاہوں میں لہرانے لگا تھا۔ "خیر رہنے دو پھر کبھی سہی۔"

"چچاعبدالحکیم !اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔یہ مٹھائی کاڈبا بھی لیتے جائیں اور میری دونوں بیٹیوں سے ان کی مرضی ضرور معلوم کرلینا۔"

"ٹھیک ہے انوار صاحب!"عبدالحکیم کے لہجے میں شامل خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"صاحب صرف عمار صاحب ہیں چچا!....باقی ورکرز برابر ہیں؟"انوارالحق،عبدالحکیم کورخصت کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"انوار بھائی یہ ظلم نہ کریں؟میں کہاں کا صاحب ہوں؟"عمار نے فوراًاس کی بات کی تردید کی۔

"یہ تو آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے عمار صاحب!"چچاعبدالحکیم نے کہا۔

عمار منمنایا۔"مجھے عمار بھائی ہی رہنے دویار"!

"نہیں کمپنی میں ایک صاحب کی موجودی ضروری ہوتی ہے،ورنہ ورکرز بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔"انوارالحق نے نہایت سنجیدگی سے کہااور عمار نے خاموشی سے سرجھکالیا۔

عبدالحکیم کے رخصت ہوتے ہی انوارالحق نے ایک نیا منصوبہ عمار کے سامنے رکھ دیا۔

"عمار صاحب!....اب ہمیں جیکٹس کے ساتھ زنانہ ومردانہ کپڑوں کی سلائی بھی شروع کر دینا چاہیے۔زنانہ کپڑوں کی ڈیزائننگ کے لیے ہم شائلہ بیٹی کو کسی اچھے سے انسٹیٹوٹ میں دو تین ماہ کے لیے بھیج دیں گے۔میرا مشاہدہ ہے کہ شائلہ بیٹی کادماغ اس معاملے میں کافی زرخیز ہے۔جیکٹس کی ڈیزائننگ میں بھی اس نے کئی بار مجھے ایسے مشورے دیے کہ مجھے اس کی صلاحیتوں کا معترف ہونا پڑا۔"

"ٹھیک ہے۔" عمار نے فوراً اس سے اتفاق کر لیا تھا۔

"دوسرے نمبر پر ہمیں اب باقاعدہ یوا ے کمپنی کی تشکیل کر دینا چاہیے۔ سیلنگ، پرچیزنگ اور مارکیٹنگ کے شعبے کے لیے ایمان دار اور مخلص کارکنوں کی ضرورت پڑے گی۔ سٹاف کی تنخواہ کے لیے اکاوٹنیٹ اور کیشئر وغیرہ بھی مطلوب ہوں گے.........." انوارالحق بڑی تفصیل سے ساری ضروریات بتاتا گیا۔ اس میدان میں نو آموز ہونے کے باوجود عمار کے پاس کتابی علم موجود تھا۔ ایم بی اے سیکنڈ سمسٹر کا امتحان اس نے نمایاں نمبروں سے پاس کیا تھا۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے، مگر ایماندار اور مخلص افراد، جو کام کے بھی ماہر ہوں ملیں گے کہاں سے؟"

انوارالحق نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "مل جائیں گے سر!....بس تھوڑی تلاش، تھوڑی جستجو اور تھوڑی کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اگر اخبار میں اشتہار دے دیں؟"

"ایسا کر کے بھی دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے عمار کی تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

سارے معاملات طے پاتے ہی اسلم شکور نے پہلے مرحلے میں اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی کا سودا کیا تھا۔ اور پھر دو تین ماہ کے اندر اس نے اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کا بھی سودا کر لیا تھا۔ "خان ٹاو□ ن" کی جگہ اسے ملک طاہر نے دکھا دی تھی۔ اخبار میں اور ٹی وی پر بھی اس کے کمرشل وغیرہ دکھائے جانے لگ گئے تھے ۔ایڈوانس بکنگ کے لیے ایک ایک خوب صورت آفس سیٹ کر دیا گیا تھا۔ اسلم شکور وہاں طاہر ملک کے مشور

ے پر روزانہ جاتا۔ملک طاہر نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا تھا کہ ہر آنے والے گاہک کو اسلم شکور سے تھوڑی بہت بات چیت کا موقع ملے۔اور اسلم شکور خان بڑی خوشی سے ہر گاہک کے سامنے خان ٹاو ئن کی خصوصیات گنوانے کے ساتھ خان ٹاو ئن کی وجہ تسمیہ بھی بیان کرتا۔

پلاٹوں اور فلیٹس کی بکنگ بڑے پیمانے پر جاری تھی۔ملک طاہر نے اسلم شکور کو ہر جگہ ہی سامنے رکھا تھا کمرشل میں بھی خان ٹاو ئن کے ماڈل کے سامنے اسے چلتے ہوئے دکھایا جاتا۔اسلم شکور خان بہت خوش تھا۔

اس دن ملک طاہر اس کے پاس آیا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے گہرے اثرات ثبت تھے۔

خیریت تو ہے ملک صاحب!"اسلم شکور خان نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

"خان صاحب!.... ہمیں کام کی رفتار کو بڑھانے کے لیے ایک بڑی رقم درکار ہو گی۔پلاٹوں کی پیشگی کی مد میں ملنے والی رقم اتنی نہیں ہے کہ ہم کام کو تیزی سے آگے بڑھا سکیں۔اس ضمن میں فیروز خان رئیسانی سے اس کے پینتیس فیصد حصے کی رقم تو میں وصول کر لوں گا آپ کے ساٹھ فیصد حصے کی رقم کچھ زیادہ بنے گی اور ....؟"ملک طاہر خاموشی سے اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔

اسلم شکور جواباً بولا۔"مگر میرا اکاو ئنٹ تو خالی ہے۔جو رقم بھی روزانہ کی بنیاد پر وصول ہوتی ہے وہ آپ کے حوالے ہو جاتی ہے۔"

"میں بھی تو فوراً وہ رقم میٹریل کے خریدنے کی مد میں ادا کر دیتا ہوں۔رسیدیں باقاعدگی سے آپ کو پیش کی جاتی ہیں۔"

”میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی کہ آپ صفائیاں دینے لگ جائیں۔“

”خان صاحب!.... آپ نے تمام کام میرے ناتواں کندھوں پر ڈالا ہوا ہے۔ ڈر تو لگتا ہے نا۔“ ملک طاہر نے چاپلوسی سے کہا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں مجھے آپ پر مکمل اعتبار ہے۔“

”شکریہ خان صاحب!.... بس آپ کے اسی اندھے اعتبار سے ڈر لگتا ہے۔“

”ویسے اتنی جلدی بینک سے بھی قرض نہیں مل سکتا۔“ اسلم شکور نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نا رئیسانی سے قرض مانگ لیں؟“

”نہیں خان صاحب!.... یہ کاروبار ہے۔ وہ اپنا حصہ بڑھانے پر اصرار کرے گا۔ اور پکی ہوئی فصل میں میں اسے مزید حصہ دار نہیں بنا سکتا۔ ہم دونوں کی بات الگ ہے۔“

”تو پھر؟“

”ویسے ایک حل ہے تو سہی۔“

”وہ کیا؟“

”اگر آپ اپنی کوٹھی رہن رکھ کر کسی سے رقم لے لیں۔ بلکہ کوئی کیا اس طرح تو رئیسانی بھی راضی ہو جائے گا ۔“

”مگر کوٹھی“........

”خان صاحب!.... کوٹھی آپ بیچ تھوڑی رہے ہیں۔بس چار پانچ ماہ کی مہلت پر قرض لے لیں....اس عرصے میں ہم ضرور رقم واپس لوٹا دیں گے۔اصل میں فلیٹس کی بکنگ میں اس وقت تیزی آئے گی جب فلیٹس پر تیز رفتاری سے کام شروع ہو جائے گا۔اور کام میں تیزی لانے کے لیے ہمیں کروڑوں کی رقم درکار ہے۔ہزاروں لاکھوں سے کام نہیں چلنے والا۔“

اسلم شکور خان چند لمحے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔پھر کہنے لگا....

”اچھا میں آج اپنے وکیل سے مشورہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔اس طرح ہمیں اطمینان بھی رہے گا۔“ملک طاہر نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

تھوڑی دیر مزید وہاں بیٹھ کر ملک طاہر اس سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔اس کی کار کارخ اسلم شکور کے وکیل کے دفتر کی طرف تھا۔اس کا وکیل خورشید علی شاہ مکمل طور پر ملک طاہر کی مٹھی میں تھا۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے اندر سید عرفان علی شاہ اور اسوہ اسلم شکور خان کی منگنی کی تقریب بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے ہو گئی تھی۔تصویر میں خوب صورت دکھائی دینے والا حقیقت میں بھی اچھا خاصا پرکشش تھا۔اگر عمار اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو اس رشتے کو ضرور دل سے قبول کر لیتی۔مگر اب تو عرفان اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔انگوٹھی پہناتے وقت اپنے ہاتھ پر اس کا ہاتھ کا لمس بھی اسے اتنا ناگوار گزرا تھا کہ بعد میں کافی دیر وہ اپنے سیدھے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے صاف کرنے کے انداز میں ملتی رہی۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے منگنی کی انگوٹھی اتار کر تپائی پر رکھ دی۔ تکیے پر سر رکھتے ہی بے ساختہ عمار کی یادوں کا ریلا آیا اور آنکھیں پچھتاوے کا ثبوت دینے لگیں۔ اگر بیتا وقت واپس لانا ممکن ہوتا تو وہ ہر قیمت بھرنے کو تیار ہو جاتی۔

اسے رباب کے ساتھ ہونے والی وہ گفتگو یاد تھی....

"رباب! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں اس سے بہت نفرت کرتی ہوں۔" یہ کہتے وقت وہ اس بات سے انجان تھی کہ وہ ان کی باتیں سن رہا ہے۔ جب اچانک اس نے پوچھا تھا.... "کیا اس وجہ سے کہ میں غریب ہوں؟" تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ مگر اس نے ایک دم اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے زہر اگلا تھا۔ "نہیں.... بلکہ تم ہو ہی نفرت کے قابل۔"

"وجہ؟" کتنے کرب ناک اور دکھ بھرے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

اور اس نے اطمینان سے جواب دیا تھا "محبت اور نفرت کے لیے وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا؟"

اس نے حیرانی بھرے لہجے میں ایک اور دلیل دی تھی۔ "یہ بات صرف محبت کے بارے سنی تھی۔"

اور اس نے "ہاں، کچھ بے وقوف ایسا ہی سمجھتے ہیں۔" کہہ کر اسے خاموش کرا دیا تھا۔

اور پھر یہ کہہ کر تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ "اور ہاں.... اگر کسی دن محسوس کرو کہ تم معاشی لحاظ سے میرے ہم پلہ ہو گئے ہو، تب اپنے والدین کو میرے گھر رشتا لینے بھیج دینا۔ یقیناً پاپا کو اپنے برابر کے لوگوں کو ہاں کرنے میں تامّل نہیں ہو گا۔"

اس کی بات سن کر اس نے کس اعتماد سے کہا تھا۔"اگر ایسی بات ہے تو آپ بھی سن لیں، میں شادی کروں گا تو آپ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔"

اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے چڑ کالگایا تھا۔"اور جب میری شادی کسی دوسرے کے ساتھ ہو جائے گی پھر؟"

"پھر بھی نہیں کروں گا.... پھر بھی نہیں کروں گا.... پھر بھی نہیں کروں گا"....

"ہاں عمار!.... مجھے یقین ہے تم کسی سے شادی نہیں کروگے.... اپنی اسوہ کے علاوہ کسی کو بھی نہیں اپناو ٔ گے.... مگر اسوہ ہار گئی ہے عمار!.... اسوہ تمھارا انتظار نہیں کر پائی۔ اپنی دیوانی، اپنی پگلی، اپنی مجرم اسوہ کو معاف کر دینا۔ الوداع عمار.... الوداع"....

اچانک موبائل کی بجنے والی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس کا دل کال اٹینڈ کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر بار بار بجنے والی گھنٹی سے تنگ آکر اس نے موبائل سکرین پر نگاہ ڈالی۔ اس کے منگیتر کی کال تھی۔

گہرا سانس لے کر اس نے اپنی حالت کو سنبھالا اور پھر کال رسیو کر لی۔

"جی؟"

"کال تو ریسیو کر لیا کریں جی!" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"عرفان صاحب! پلیز آپ مجھے کال نہ کیا کریں۔"

"کیوں جی!.... کیا ہو گیا.... اب تو ہم نے جناب کی زیارت بھی کر لی ہے اب کیسے خود کو روک پائیں گے۔"

”عرفان صاحب!.... میں فون پر گفتگو کی عادی نہیں ہوں اور میرا خیال ہے میرے کال ریسیو نہ کرنے پر آپ کو توہین وغیرہ محسوس ہو گی۔ اور میں ایسا نہیں چاہتی۔ کیوں کہ ہم جس رشتے میں بندھنے جا رہے ہیں اس میں اس طرح کی تلخیاں مناسب معلوم نہیں ہوتیں۔“

”اجی!.... میں آپ کا منگیتر ہوں کوئی غیر تو نہیں۔“

”میں بھی کہیں بھاگی نہیں جا رہی چند ماہ صبر کر لیں، پلیز یہ میری درخواست ہے۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ مگر آپ کو میری مجبوری سے سمجھوتا کرنا ہو گا۔“

”اچھا.... چلو ایسا ہے کہ میں کبھی کبھار کال کر لیا کروں گا۔ مطلب ہفتے میں ایک ادھ بار۔“

”ٹھیک ہے۔ شکریہ۔“ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

چند منٹ کی گفتگو ہی نے اسے ماضی کے سپنوں سے نکال کر مستقبل کی اذیت ناک سوچوں کے حوالے کر دیا تھا ۔ جس مرد سے چند منٹ کی گفتگو اس کے لیے اتنی سوہان روح بنی ہوئی تھی اس کے ساتھ ہمیشہ رہنا کتنا اذیت ناک ہوتا۔

”کسی کی پر خلوص محبت کو ٹھوکر مارنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے؟“ ایک تلخ سوچ اس کے دماغ میں ابھری اور اس کی آنکھوں میں دوبارہ پانی جمع ہونے لگا۔

☆☆☆

”ہم چار پانچ ماہ میں اتنی رقم اکٹھی کر لیں گے خان صاحب!“ ملک طاہر نے اسلم شکور کو تسلی دی۔

"اس رقم کی میرے نزدیک اتنی اہمیت نہیں ہے ملک صاحب!.... مگر اب ہم ایک نئے کام کی شروعات میں ہیں تو یہ چھوٹی سی رقم بھی بڑی دکھائی دے رہی ہے۔"

"خان صاحب!.... ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر کوٹھی رہن رکھنا آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہے تو میں آپ کی حصہ داری کا پانچ دس فیصد رئیسانی کو بیچ کر آج ہی یہ رقم وصول کر سکتا ہوں۔" ملک طاہر کے لہجے میں شامل اعتماد نے اسلم شکور کو تذبذب سے نکال دیا تھا۔

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے؟" اسلم شکور نے جلدی سے انکار میں سر ہلا دیا۔ ملک طاہر کے ہونٹوں پر بہ ظاہر خوشگوار تبسم جھلکا۔ اس تبسم کے پس پردہ جو مکاری تھی اگر وہ اسلم شکور کو نظر آجاتی تو اسے پتا چلتا کہ وہ ایک نادیدہ دلدل میں گردن تک دھنس گیا ہے۔

"ویسے اب بکنگ کی شرح میں کافی اضافہ ہوا ہے۔"

اسلم شکور نے کہا۔ "ہاں.... اضافہ تو ہوا ہے مگر توقع سے تھوڑا کم۔"

ملک طاہر مسکرا کر بولا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

اسلم شکور بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر ثبات میں سر ہلانے لگا۔

"اچھا مجھے اجازت دیں خان صاحب!" ملک طاہر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا سائیٹ کا چکر لگا لوں۔ یوں بھی باہر کی ساری ذمہ داری تو میری ہے نا۔ آپ دفتر سنبھال لیتے ہیں یہی کافی ہے۔"

"کل میں بھی چلوں گا۔" اسلم شکور نے اسے مطلع کرتے ہوئے کہا۔

"جب آپ کی مرضی ہو تشریف لائیں۔" یہ کہہ کر ملک طاہر دفتر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

انھوں بڑی کوششوں سے ساتھ والے کرائے دار کی منت سماجت کر کے وہ مکان بھی کرائے پر لے لیا تھا ۔شمائلہ تین مہینے ایک اچھے ادارے میں زنانہ ملبوسات کی ڈیزائننگ سیکھ کر آگئی تھی۔چونکہ وہ پہلے سے اس کام کو بہتر طریقے سے جانتی تھی اس لیے تین مہینے کا عرصہ اس کے لیے کافی رہا تھا۔اس کی واپسی تک وہ مردانہ ملبوسات پر کام شروع کر چکے تھے۔کپڑوں کی سلائی مشینوں کی خریداری کے ساتھ عمار نے لوڈ شیڈنگ کے حل کے لیے ایک جنریٹر بھی خرید لیا تھا۔شمائلہ کے آمد کے ساتھ زنانہ ملبوسات پر بھی کام شروع ہو گیا۔کام کا معیار اور کسٹمرز کے ساتھ عمار کے پر اخلاق رویے کی وجہ سے ان کا کام دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

اپنے کام میں تھوڑا وقفہ کر کے انوار الحق اس کے پاس چائے پینے آ بیٹھا تھا۔

"عمار صاحب!.... آپ سے ایک کام پڑ گیا ہے۔" چائے کی چسکی لیتے ہوئے انوار الحق نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ کی محبت ہے عمار صاحب!.... بہ ہر حال میں بات کرنا چاہ رہا تھا اپنے چچازاد بھائی آفتاب احمد کی۔وہ قریباً دس بارہ سالوں سے ایک کنسٹریکشن کمپنی سے منسلک ہے۔پرسوں مجھے ملنے آیا تھا اسے کچھ ادھار رقم درکار ہے ۔سال بھر میں لوٹانے کا وعدہ کر رہا ہے۔اس بات کی یقین دہانی تو میں کرا سکتا ہوں کہ ایمان دار آدمی ہے وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔لیکن وہ جتنی رقم کا مطالبہ کر رہا ہے وہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی رقم ہے۔"

”جب آپ جانتے ہیں کہ اتنی بڑی رقم ہم ایک سال کے لیے نہیں پھنسا سکتے تو پھر مجھ سے بات کرنے کا مقصد
....“

”کیونکہ اس کے مجھ پر احسان ہیں۔اور میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اپنی سی کوشش کروں گا۔“

عمار نے پوچھا۔”اسے کتنی رقم درکار ہے ؟“

کم از کم ڈیڑھ کروڑ۔“

”اتنی رقم کا وہ کرے گا کیا؟“عمار کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”ایک ٹھیکا اس کے ہاتھ لگا ہے وہ اسے خود پورا کرنا چاہتا ہے۔بہ قول اس کے اس میں کافی منافع کی امید ہے۔“

”ایسا ہے اسے کال کر ابھی بلالو۔“اچانک عمار کو اس کام میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

”کیا مطلب ؟....“انوار لحق حیران رہ گیا تھا۔

”آپ جانتے ہیں انوار بھائی !“عمار پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

”شاید وہ سانجھے داری قبول نہ کرے۔“انوار الحق نے اس کا مطمع نظر جانتے ہوئے کہا۔

”تو کیا۔چاے پانی پی کر رخصت ہو جائے گا۔ہم نے لڑنا تھوڑی ہے ؟“

”کیا آپ ایک ساتھ دونوں طرف توجہ دے سکیں گے ؟“

"کچھ پانے کے لیے آرام قربان کرنا پڑتا ہے.... باقی ابو جان کی ریٹائرمنٹ میں چند دن بقایا ہیں امید ہے وہ گارمنٹس فیکٹری کو سنبھال لیں گے۔"

"شاید یہ اتنا بھی آسان نہ ہو۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ اسے ایک اسسٹنٹ فراہم کر دیں گے۔"

"مگر ہم اتنی زیادہ تنخواہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔" انوار الحق اس سے متفق نہیں تھا۔

"ابو جان کا بھی یہی دفتر ہو گا اور میں انھیں ساتھ ساتھ سمجھاتا رہوں گا۔" عمار کسی صورت یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد اتنا تجربہ تو اسے بھی ہو گیا تھا کہ کنسٹرکشن کمپنی، گارمنٹس فیکٹری سے کہیں بڑھ کر منافع بخش ہو سکتی تھی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد انوار الحق موبائل فون نکال کر اپنے چچازاد آفتاب احمد کو کال کرنے لگا۔

گھنٹا بھر بعد آفتاب احمد عمار کے سامنے موجود تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک باشرع آدمی تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد عمار مطلب کی بات پر آ گیا۔

"آفتاب صاحب!.... انوار بھائی کی زبانی مجھ تک آپ کا مطالبہ پہنچ گیا ہے۔ اور معذرت خواہ ہوں کہ میں کسی کے لیے اتنی زیادہ رقم اپنے نئے کاروبار سے نکالنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

آفتاب احمد نے پھیکی مسکراہٹ سے پوچھا۔ "تو آپ نے مجھے یہی بتانے کے لیے بلایا تھا۔"

"نہیں۔" عمار نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کسی کے لیے کہا ہے.... اپنی ذات کی نفی تو نہیں کی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" آفتاب احمد نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

عمار معنی خیز لہجے میں بولا۔ "آفتاب صاحب! شاید آپ کو میرے ساتھ کام کر کے اچھا لگے۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں میں ایک مالک سے جان چھڑا کر دوسرے کے زیر کمان آجاؤں۔" آفتاب احمد کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"نہیں، بلکہ میں چاہتا ہوں ہم اچھے ساتھی بن کر ایک نئی کنسٹرکشن کمپنی کھڑی کر دیں۔ آپ اکیلے شاید صحیح طریقے سے اس کام نہ سنبھال سکیں۔"

آفتاب احمد گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ انوار الحق نے ان کی گفتگو کے درمیان دخل دینے کے بجائے خاموش بیٹھنا پسند کیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد آفتاب نے پوچھا۔

"حصہ داری کس نسبت سے طے ہوں گی۔"

"سرمائے کا بندوبست اور دفتری کام میری ذمہ داری عملی کام آپ سنبھال لیں اور حصے داری کا تعین بھی میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔"

آفتاب احمد مسکراہٹ سے بولا۔ "مطلب آپ مجھے پچاس فیصد بھی نہیں دینا چاہتے۔"

"آپ خود سمجھ دار ہیں؟" عمار نے گیند اسی کے کورٹ میں رہنے دی تھی۔

”میں چالیس فیصد سے کم نہیں لوں گا۔“ آفتاب احمد نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

عمار نے بے پرواہی سے کہا۔”اس کا تعین میں نے آپ پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ مجھے قبول ہو گا۔“

”مطلب میں مٹھائی کا ڈبا منگوالوں۔“ خاموش بیٹھا انوار الحق پہلی بار ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔

”نہیں۔“ عمار نے کہا۔”بہتر ہو گا کہ پورے سٹاف کے لیے چھوٹی سی چائے پارٹی کا بندوبست کر دو۔“

اور انوار الحق مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

”برخوردار!....اب تو میری ریٹائرمنٹ میں بس چند دن رہ گئے ہیں۔ اور مجھے بیس پچیس لاکھ کے قریب یک مشت رقم مل جائے گی۔ اگر اتنی ہی رقم کا بندوبست تم کر سکو تو یقیناً ایک مناسب گھر ہم خرید لیں گے۔“

"میں نے کرائے کا ایک گھر ڈھونڈ لیا ہے اور آپ کو یک مشت ملنے والی رقم کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بھی میرے پاس موجود ہے۔" عمار نے اطمینان بھرے انداز میں جواب دیا۔ دونوں باپ بیٹا اس وقت ناشتا کر رہے تھے۔

"ذرا وضاحت کرنا پسند کرو گے؟" بشیر احمد نے اس کی طرف غور سے دیکھا

"دیکھیں ابو جان!.... میں آپ کو گھر میں بٹھا کر مفت نہیں کھلا سکتا۔ یہ رقم میں یو اے کمپنی کے چیئر مین کو بہ طور رشوت پیش کر کے آپ کے لیے اس کمپنی میں ایم ڈی کا عہدہ حاصل کروں گا۔"

"نہیں بھئی.... پیشگی معذرت اب تو بس آرام کرنے کا ارادہ ہے۔ پیسے چاہیے ہوں تو بے شک لے لینا، مگر کام کرنے کی بات کی تو عاق کرنے سے بھی نہیں چوکوں گا۔"

"مگر ابو جان".... !

"کوئی وضاحت نہیں۔" بشیر احمد حتمی لہجے میں بولا۔

اسی وقت سکینہ نے آ کر پوچھا پھر کیا بحث شروع ہے۔"

"امی جان!....میں چاہتا ہوں ابو جان گارمنٹس فیکٹری میں آ کر میرا ہاتھ بٹا دیا کریں اور ابو جان سو کھا انکار کر دیا۔

"ابھی تک تو تم اکیلے ہی سنبھال رہے تھے پھر اب تمھیں باپ کی ضرورت کیوں محسوس ہونے لگی۔"

"امی جان!....میں ایک نئے کام میں ہاتھ ڈالنے لگا ہوں تو"....

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے بیٹا!....اتنا اچھا تو کما رہے ہو اور پھر اتنے پیسے کا ہم کیا کریں گے۔"

"اپنا گھر تو ہے نہیں اور اتنا پیسا۔" عمار نے منہ بنایا۔

سکینہ بیگم شوہر کی طرف متوجہ ہوئی۔"آپ کو کتنی بار کہا ہے کہ اس کی شادی کا کچھ سوچیں۔ورنہ یہ اسی طرح پیسا کمانے کی مشین بنا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے ابو جان!....میں چلتا ہوں۔" ہاتھ میں پکڑی چائے کی ادھ بھری پیالی میز پر رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا ۔شادی کا ذکر اس کی سب سے بڑی کمزوری تھا۔

بشیر احمد ہنسا۔"واہ بیگم واہ!....ایک ہلکے سے وار ہی سے برخوردار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

"ہنسو مت؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔"جو کہا ہے اس بارے کچھ سوچو۔"

"ٹھیک ہے جی!....سوچ لیتے ہیں کچھ۔" بشیر احمد بھی بیٹے کی تقلید میں وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔

☆☆☆

سڑک سے اتر کر وہ ایک میدان کے کنارے پہنچے جہاں ایک بڑا سا گیٹ لگانے کے لیے سیمنٹ کے ستون بنائے گئے تھے۔ ستونوں کے اوپر خوب صورت سا بینر لگا ہوا تھا جس پر خان ٹاؤن لکھ کر اس کے ساتھ اسلم شکور خان کی ایک تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔ گیٹ سے ہٹ کر اندر کی جانب ریت، بجری اور اینٹوں کے چند ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔

"تعمیراتی کام تو ابھی تک شروع ہی نہیں ہوا؟" ستونوں پر ٹنگے خوب صورت بینر کو خوش کن نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ بجری کے ایک ڈھیر کے قریب جا کر رک گئے تھے۔

طاہر نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ "پندرہ دن بعد آ کر دیکھنا خان صاحب"!

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ ساری رقم مٹیریل کی خریداری میں صرف ہو رہی ہے؟" اسلم شکور وہاں کی حالت دیکھ کر کافی مایوس نظر آ رہا تھا۔

"ادائی کر دی ہوئی ہے خان صاحب!.... لیکن ٹھیکیداروں کو میں نے خود مٹیریل کی ترسیل سے منع کیا ہے۔ کہ جب تک کام کا باقاعدہ آغاز نہ ہو جائے مٹیریل یہاں اکٹھا نہ کریں۔ اصل میں پہلے پیسوں کا مسئلہ آ رہا تھا ابھی حل ہو گیا ہے اور اب کل یا پرسوں سے کام کی رفتار ایک دم تیز کر دی جائے گی۔ دیکھنا ہم کیسے یہاں جنگل سے منگل بناتے ہیں اور کیسے خان ٹاؤن کا نام چہار دانگ میں گونجتا ہے۔" اس کی چکنی چپڑی باتوں نے اسلم شکور خان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر ملک طاہر نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"چلیں خان صاحب! آپ کو خان ٹاؤن کی مارکنگ دکھاؤں۔"

اسلم شکور سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔ ملک طاہر جواد اسے میدان میں مختلف جگہوں پر پھرانے لگا جہاں چونے کو گیلا کر کے مختلف قسم کی مارکنگ کی گئی تھی۔ چوڑی سڑکیں، پارک، سوئمنگ پول، کلب، جمنازیم ،باسکٹ بال، والی بال کورٹ اور مارکیٹ وغیرہ کی جگہوں کو ظاہر کیا گیا تھا۔

"سارا کچھ پہلے سے مارک کر لیا گیا ہے ؟" اسلم شکور نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ناخان صاحب!.... بس ایک دو دن میں اکٹھا کام شروع کریں گے۔ میں نے ایک ٹھیکیدار پر انحصار کرنے کے بجائے ہر عمارت کا ٹھیکا علاحدہ علاحدہ ٹھیکیدار کو دیا ہے۔ اس طرح ایک تو کام جلدی ختم ہو گا دوسرا مقابلے کی فضا قائم رہے گی اور مزید ٹھیکا لینے کی امید میں ہر ٹھیکیدار اپنا کام عمدگی اور ایمان داری سے کرنے کی کوشش کرے گا۔"

" صحیح کہا۔" اسلم شکور نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ گھنٹا ڈیڑھ اس ویران میدان میں گھومنے کے بعد جہاں ان دونوں کے علاوہ صرف ایک چوکیدار نظر آرہا تھا وہ واپس چل پڑے۔ چونے سے ظاہر کی گئی ان عمارتوں کی جگہ اسلم شکور کے تصورات میں شاندار اور سجی ہوئی خوب صورت عمارتیں لہرا رہی تھیں۔ پارک میں جھولا جھولتے بچے، سوئمنگ پول میں نہاتے لڑکے ،مارکیٹ میں خریداری کرتی خواتین اور کھیل کے میدان میں دوڑتے کھلاڑیوں کی شبیہیں حقیقت بن کر اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔

☆☆☆

اسلم شکور کو اس کے آفس میں اتار کر طاہر جواد آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بیٹے ارشد کے ساتھ بیٹھا بلند بانگ قہقہے لگا رہا تھا۔

”سٹھیا گیا ہے سالا!.... کہا تھا نا کہ تھوڑا صبر کر لو، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اسلم شکور خان کو اس کی حیثیت یاد دلا دیں۔“

” صحیح کہا ڈیڈی!.... آپ نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ اپنا بدلہ بھی لے لیا ہے اور اس کی دولت بھی ہتھیا لی ہے۔“

”کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا ہے میں نے اسے۔ اپنا گھر بھی اب اس کا نہیں رہا۔ وہ محل نما کوٹھی گروی رکھا دی ہے۔ اور کروڑوں روپے تو وہ پلاٹ لینے والوں سے ایڈوانس لے چکا ہے۔ اب بس جیل کی سلاخیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔“

ویسے ڈیڈی!.... آپ بھی تو اس کے بزنس پارٹنر ہیں؟“

” فکر نہ کرو، ہر جگہ ہی میں نے اسے سامنے رکھا ہے۔ اس کا وکیل یوں بھی میری مٹھی میں ہے۔ اور ساری زمین جو ہم نے خریدی ہے وہ سرکاری زمین ہے بیچنے والے غائب ہو چکے ہیں۔ اور اسلم شکور کی ساری دولت اپنے اپنے حصہ داروں کو پہنچ جائے گی اب بس اس کی کوٹھی کا سودا کرنا رہ گیا ہے۔“

ارشد زہریلے لہجے میں بولا۔ ”ڈیڈی میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب اس کی بیٹی کی اکڑی ہوئی گردن میرے سامنے جھکے گی اور وہ گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگے گی؟“

”کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک تیار رہنا۔ آج اس کا وکیل منظر عام سے غائب ہو رہا ہے، میں بھی اپنے پارٹنرز سے مشورہ کر کے اسلم شکور کو اصلیت بتانے والا ہوں۔ اسے بھی پتا چل جائے گا کہ اس نے کس سے پنگا لیا تھا۔“

اور باپ کی بات پر ارشد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔اس کے باپ نے تھوڑی دیر لگائی تھی مگر بدلہ پورے کا پورا لیا تھا۔اسے تھانے میں گزارنے والی رات بھولی نہیں تھی۔بس اسے یہ افسوس تھا کہ وہ اپنے کلاس فیلوز کو اسوہ اسلم شکور کا انجام نہیں دکھا سکتا تھا۔"خیر کچھ بھی ہے آہستہ آہستہ سارے کلاس فیلوز کو بھی پتا چل جائے گا کہ اس بگڑی ہوئی رئیس زادی سے میں نے کیسے بدلہ لیا ہے۔"وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔"ہاں البتہ اپنی منگنی توڑ کر مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو گئی تو پھر سے وہی سب کچھ حاصل کر لے گی۔اور میں اسے معاف بھی کر دوں گا،آخر میری محبت جو ٹھہری۔"

☆☆☆

آفتاب کی ساری زندگی مختلف کنسٹریکشن کمپنیوں میں کام کرتے گزری تھی۔پچیس تیس سال ایک ہی فیلڈ میں کام کرنے کی وجہ سے اس کے تعلقات کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ڈیڑھ کروڑ تک کی رقم عمار نے گارمنٹس فیکٹری سے نکال لی تھی۔اپنے والد کو ملنے والے پچیس لاکھ بھی اس میں شامل کر کے وہ پونے دو کروڑ تک کی رقم کنسٹریکشن کمپنی کے لیے پوری کر چکا تھا۔شروع کے دنوں میں اس نے پوری توجہ کنسٹریکشن کمپنی پر مرکوز کر دی جبکہ گارمنٹس کمپنی کا کام وقتی طور پر انوار الحق نے سنبھال لیا۔یوں بھی گارمنٹس فیکٹری پٹڑی پر چل پڑی تھی۔انھیں پہلا ٹھیکا ایک پل بنانے کا ملا تھا اور پھر پل کی تعمیر سے پہلے چار پانچ پولٹری فارم بنانے کا ٹھیکا مل گیا تھا۔

عمار اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔رات گئے ہی وہ آفس کا کام نمٹا کر لوٹتا ۔بستر پر لیٹتے ہوئے وہ اتنا تھکا ہوتا کہ اسے سوائے سونے کے کسی چیز کا ہوش نہ ہوتا لیکن ایسی حالت میں بھی سونے سے پہلے وہ دشمن جاں کی تصویر کی زیارت لازماً کرتا۔اسوہ کی محبت سے دست برداری اس کے لیے ممکن

نہیں تھی۔ وہ آج بھی اسے اتنی ہی پیاری تھی جتنا پہلی نظر میں لگی تھی۔ اسوہ کا حقارت بھرا رویہ اسے بھولا نہیں تھا لیکن وہ اسے دل سے معاف کر چکا تھا۔ اور اب وہ جلد از جلد اس کوشش میں تھا کہ اس کے ہم پلہ ہو کر اس کا سامنا کر سکے۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر وہ دل مسوس ہو کر رہ جاتا کہ شاید اسوہ نے شادی کر لی ہو۔ مگر پھر یہ سوچ اس کی ڈھارس بندھا جاتی کہ محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے۔ اگر وہ کسی اور کی بیوی بھی بن جاتی ہے تب بھی یہ بات عمار کے دل سے اس کی محبت کم نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے کافی کوشش کی تھی کہ باپ کو اپنے ساتھ آفس لے جائے مگر بشیر احمد مکمل آرام کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس نے دفتر جانے سے کھلا انکار کر دیا تھا۔

"بیٹا!.... میرے اور تمھاری ماں کے لیے ماہانہ ملنے والی پنشن ہی کافی ہے۔ اگر کوئی احسان کر سکتے ہو تو ہم بوڑھوں کو ایک بہو لا دو۔"

اور والد کی یہ بات اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سوچتا کہ آخر وہ کب تک اپنے والدین کی التجائیں ٹالے گا آخر ایک دن تو سے شادی کرنا پڑے گی۔ اسے اسوہ کے سامنے کیا ہوا دعوا بھولا نہیں تھا کہ جب اس نے کہا تھا وہ اسوہ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔ اب اگر وہ شادی شدہ حالت میں اس کے سامنے پہنچتا تو وہ اس کا کتنا مذاق آتی۔

"کر لوں گا، مگر کسی مقام پر پہنچنے کے بعد۔" وہ خود کو ہمیشہ یہ کہہ کر تسلی دیتا۔

☆☆☆

اس دن اسلم شکور دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ملازم نے اسے طاہر جواد کے آنے کی اطلاع دی۔

”طاہر جواد، اس وقت؟“ وہ حیران رہ گیا تھا۔ ”خیر اسے بٹھاؤ اور چائے وغیرہ پیش کرو میں آتا ہوں۔

ملازم سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ تیار ہو کر باہر نکلا ڈرائنگ روم میں طاہر جواد اور اس کا بیٹا بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اسلم شکور کو آتا دیکھ کر انھوں نے کھڑے ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

اسلم شکور کو ان کا رویہ دیکھ کر خاصی حیرانی ہوئی تھی۔ کہاں تو طاہر جواد اسے دور سے آے ادیکھ کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا اور ابھی قریب آنے پر بھی ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا رہا۔ اسے لگا شاید وہ اسے دیکھ نہیں پایا ہے۔ اس نے زور سے گلا کھنکار کر انھیں اپنی آمد سے مطلع کیا۔

”ارے اسلم شکور میاں!.... آؤ بیٹھو۔“ طاہر جواد کے لہجے میں طنز، بدتمیزی اور جانے کیا کیا شامل تھا۔

”یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟“ اسلم شکور کو شدید غصہ آیا تھا۔

”تو کس لہجے میں بولیں بڈھے؟“ اس مرتبہ ارشد نے بدتمیزی کی ہر حد پار کر دی تھی۔

”شت آپ، واہیات انسان!“ اسلم شکور غصے میں کانپنے لگ گیا تھا۔

”اوے تمیز سے بات کرو۔“ ارشد نے کھڑے ہو کر اس کی جانب شہادت کی انگلی سیدھی کی۔

”تم دونوں دفع ہو جاؤ یہاں سے.... آؤٹ، گیٹ آؤٹ۔“ اسلم شکور کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

”ہم یا تم؟“ طاہر جواد نے اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا۔

”اشرف!.... سرور!.... سہیل!....“ اسلم شکور نے اپنے ملازموں کو آواز دی۔

"جی صاحب جی!" اشرف اور سہیل ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

"ان دونوں بدبختوں کو دھکے دے کر یہاں سے نکال دو۔"

"وہیں ٹھہرو۔" انھیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر طاہر جواد دبنگ لہجے میں بولا۔ اور پھر اسلم شکور کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے تمھیں یہ بات بھول گئی ہے کہ تم اس کوٹھی کے مالک نہیں ہو اور یہ کوٹھی تم گروی رکھ چکے ہو۔ اور جو پیسے تم نے وصول کیے ہیں وہ غلطی سے ضائع ہو گئے ہیں؟"

طاہر جواد کا انداز ایسا نہیں تھا کہ اسلم شکور نہ چونکتا۔

اس نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "ضائع ہونے سے تمھاری کیا مراد ہے مسٹر طاہر"!

وہ ہنسا۔ "ضائع کا مطلب ضائع ہوتا ہے۔"

اسی وقت اسوہ اپنے کمرے کے دروازے سے نکلی۔ وہ سو رہی تھی۔ باپ کے چیخنے کی آواز نے اسے باہر نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی ماں نسرین بھی اپنے کمرے باہر آ گئی تھی۔

"تم شاید اس کا انجام نہیں جانتے؟" اسلم شکور کے لہجے میں چھپا غضب بھی طاہر جواد کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی بھی نہیں لایا تھا۔

"تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے نام نہاد سیٹھ صاحب کہ اب تمھارا دیوالیہ نکل گیا ہے، تم قلاش ہو گئے ہو۔ پائی پائی کے محتاج۔ بلکہ صحیح کہوں تو اس وقت سڑک کے کنارے ریڑھی لگانے والے کی مالی حالت بھی تم سے بہتر ہو گی۔"

"تمھاری بکواس کا مطلب؟" اسلم شکور کا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا تھا۔

"صرف اتنا کہ جو زمین تم نے خریدی ہے وہ سرکاری اراضی ہے۔ اپنی کوٹھی اور اس میں موجود تمام سامان بہ شمول گاڑیوں کے تم گروی رکھ چکے ہو اور پلاٹس کے خریداروں سے وصول ہونے والے کروڑوں روپے تم پر واجب الادا ہیں۔ قانونی لحاظ سے تم نے میرا اور فیروز خان رئیسانی کا روپیا بھی ہڑپ کر لیا ہے۔ بس یا کچھ اور بتاو□ ں؟" طاہر جواد کا اطمینان بھرے لہجے نے اسلم شکور کو لرزا دیا تھا۔ ایک دم اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں سے سانس نکل گیا ہے۔ وہ پاس پڑے ہوئے صوفے پر دھپ سے بیٹھ گیا۔

"میرے بیٹے کو سلاخوں کے پیچھے بھجوایا تھا نا؟.... اب خود تیاری کر لو میں دیکھتا ہوں تمھیں کون رہا کرا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ارشد کو مخاطب ہوا۔ "چلو بیٹا!.... اب اس فراڈیے سے عدالت میں ملاقات ہو گی۔"

"ہائے اسوہ اسلم شکور خان!" ارشد نے خاموش کھڑی اسوہ کو آنکھ مارتے ہوئے شوخ لہجے میں پکارا۔ جو اس سارے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چھوڑو ارشد!.... اس نے تمھارے پاس ہی سفارش کے لیے آنا ہے۔ اس وقت گپ شپ کر لینا، اب چلو۔" طاہر جواد نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور ارشد اس کے ہمراہ چل پڑا۔

"پاپا!.... خیریت تو ہے؟" ان کے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی اسوہ اپنے باپ کی طرف بڑھی جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھیں۔ اس کی بیوی نسرین بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

اس نے بیٹی کی بات کا جواب دیے بغیر موبائل فون نکالا اور اپنے وکیل کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

دوسری گھنٹی پر اس نے کال رسیو کر لی تھی۔

"جی خان صاحب!" اس کے لہجے میں ادب کا عنصر عنقا تھا یا شاید اسلم شکور ہی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ بغیر تمہید باندھے سیدھا اصل بات کر آ گیا۔ "خورشید علی شاہ!.... طاہر جواد ابھی میرے پاس آ کر یہ بکواس کر گیا ہے کہ جو زمین ہم نے خان ٹاؤن کے لیے خریدی ہے اس کے کاغذات درست نہیں ہیں؟"

"جی خان صاحب!.... وہ صحیح کہہ رہا ہے، اپنی اسی غلطی کی وجہ سے میں نے استعفا دے دیا ہے۔ کیا فائدہ ایسی وکالت کا کہ بندہ زمین کے جعلی کاغذات ہی نہ پہچان سکے۔" جعفر خان نے یوں بات کی گویا اس کے استعفا دینے سے اسلم شکور کا سارا نقصان ہی پورا ہو رہا ہو۔

"خورشید علی شاہ!.... تت.... تت.... تم........" اسلم شکور اپنی بات پوری نہیں کر سکا تھا۔ موبائل فون اس کے ہاتھ سے گرا اور اپنے بائیں پہلو پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ منہ کے بل زمین پر گرنے لگا۔

"پاپا!...." اسوہ نے گھبرا کر اسے تھاما۔ نسرین نے بھی ایک جانب سے اسے پکڑ لیا تھا۔

"سہیل چاچا!.... گاڑی نکالو۔" اسوہ نے چیخ کر ڈرائیور کو آواز دی اور وہ بھاگتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اشرف آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنے لگا۔

اسلم شکور کے چہرے پر تو جیسے اذیت کے اثرات ثبت ہو گئے تھے۔ وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ ماں، بیٹی اور اشرف اسے مل کر اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے سہیل گاڑی لے آیا تھا۔ گاڑی روک کر اس نے اسلم شکور کو عقبی نشست پر منتقل کرنے کے لیے ان کی مدد کی۔ اس وقت تک اسلم شکور نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ اسوہ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"سہیل چچا!.... جلدی چلو۔" اس کا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی تھی ۔ نسرین بیگم ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور سہیل نے گاڑی بھگا دی۔ نسرین بیگم نے ہسپتال فون کر کے ڈاکٹر کو اطلاع دینے لگی۔

بہت زیادہ تیزی کرنے کے باوجود وہ آدھ گھنٹے بعد ہی ہسپتال پہنچ پائے تھے۔ وہ اعلا درجے کا سول ہسپتال ان کا خاندانی ہسپتال تھا۔ پارکنگ میں گاڑی رکتے ہی دو میل نرسوں نے بجلی کی سی سرعت سے اسلم شکور کے جسم کو سٹریچر پر منتقل کیا اور آئی سی یو کی طرف بھاگے۔ اسوہ اور نسرین بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی تھیں۔ ڈاکٹر رشید احمد ہمدانی ان کا منتظر تھا۔ آئی سی یو میں داخل ہوتے ہی انھوں نے دروازہ بند کر دیا۔ دروازے پر کھڑی ایک خوب صورت سی نرس انھیں باہر رکنے کا اشارہ کیا۔

دونوں ماں بیٹی زیر لب قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے دروازے کے سامنے بے چینی سے ٹہلنے لگیں۔ ایسی حالت میں انتظار کرنے والا سولی ہی پر ٹنگا رہتا ہے۔ ماں، بیٹی بھی گویا ڈوبتے دل سے کسی اچھی خبر کی امیدوار تھیں۔

انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ آئی سی یو کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر ہمدانی باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر چھائے تاثرات اسوہ کا دل دہلانے لگے۔ اور پھر ڈاکٹر ہمدانی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔ "بیٹی!.... جو اللہ کی رضا۔" اور سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔

"نہیں......." وہ زور سے چیختے ہوئے ماں سے لپٹ گئی تھی۔ نسرین کو بھی اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ بیٹی کو ساتھ لپٹائے وہ بوجھل قدموں سے آئی سی یو کی طرف بڑھی۔ اسلم شکور کا جسم ہسپتال والوں نے

سفید چادر سے ڈھک دیا تھا۔اسوہ ماں کو چھوڑ کر باپ کی لاش سے لپٹ گئی۔نسرین بھی آنسو بہاتے اپنے سر کے سائیں کو دیکھنے لگی۔اس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ساری زندگی ساتھ نبھانے والے نے یوں ایک دم بچھڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے سنبھلنے اور کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔

"پاپا!.... آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے،میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی،اگر جانا ہی ہے تو مجھے بھی تو لیتے جاو□ ؤ نا۔پاپا!.... دیکھو تمھاری گڑیا رو رہی ہے۔پاپا...پاپا...پا........" اسوہ باپ کی لاش سے لپٹے جانے کیا کیا کہے جا رہی تھی۔

نسرین اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دینے لگی۔حالانکہ خود اس کی اپنی حالت قابل رحم تھی۔کئی بھیانک سوال منہ کھولے اس کا دل لرزا رہے تھے۔جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔اس کا شوہر اتنے کمزور اعصاب کا تو نہیں تھا کہ ذرا سی بات پر اسے ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔یقیناً طاہر جواد نامی شخص کی بکواس مبنی بر حقیقت تھی اور اگر وہ سچ تھا تو صرف اس کے سر کا سائیں فوت نہیں ہوا تھا اس کے سر کا سائبان بھی جانے والا تھا۔

☆☆☆

جلد ہی عمار نے گارمنٹس فیکٹری کے لیے دو ملے ہوئے پرانے مکان خرید کر وہاں تعمیر شروع کر دی ۔کنسٹریکشن کمپنی ان کی اپنی ہی تھی۔اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اچھا سا آفس بھی بنا لیا تھا۔اب وہ ایک اچھے خاصے بزنس مین کے طور پر ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔شناسائی کا حلقہ وسیع ہوا،نئے نئے تعلقات بنے اور اس کی ترقی کو مزید تحریک ملی۔جیکٹس کے ساتھ یوں زنانہ و مردانہ ملبوسات کی مانگ میں بھی اضافہ ہوا ۔فیکٹری میں کام کرنے والے افراد کی تعداد سیکڑوں ہو گئی تھی۔آفس کا سٹاف بھی اس نے مکمل رکھ لیا تھا۔یو

اے کمپنی کا چیرمین اور اونر وہ خود تھا۔وائس چیرمین انوار الحق تھا۔اس کے ماتحت دو ڈائریکٹر تھے۔ایک کنسٹریکشن کمپنی سے متعلق معاملات دیکھتا اور دوسرا گارمنٹس فیکٹری کو سنبھالتا۔اکاوئنٹس،مارکیٹنگ ،پرچیزنگ کے بھی اس نے ایم ڈی مقرر کر دیے تھے۔گارمنٹس فیکٹری میں زنانہ ملبوسات کے شعبے کو ہینڈل کرنے کے لیے اس نے عبدالحکیم کی بیٹی شمائلہ ہی کو ایم ڈی بنا دیا تھا۔عبدالحکیم کی دونون بیٹیوں کی اچھی خاصی آمدن ہو جاتی تھی وہ مالی لحاظ سے کافی آسودہ تھیں اس کے باوجود عبدالحکیم وہاں سے جانے پر خود کو راضی نہیں کر سکا تھا۔اس کا کام بس عمار کی ذاتی خدمت تک محدود تھا۔کمپنی کی میٹنگ میں بھی عمار اسے خصوصی طور پر شمولیت کی دعوت دیتا تھا۔ظاہری علم نہ ہونے کے باوجود عمار اس کے مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا ۔وہ ایسا باس تھا جس سے اس کے ماتحت دلی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔اپنے ماتحتین کی بڑی بڑی غلطیاں وہ خندہ پیشانی سے معاف کر دیا کرتا۔

لیکن انسان بہت ناشکرا ہے۔وہ جب اپنے کریم رب کی دی ہوئی لا محدود نعمتوں کو جھٹلا سکتا ہے تو پھر ایک انسان کے خلاف بہکتے ہوئے اسے کون سی دیر لگتی ہے۔رمضان کا مہینا تھا۔چھوٹی عید کی آمد آمد تھی۔لیدر جیکٹس کی ایک بہت بڑی ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے انھیں دن رات ایک کرنا پڑ رہا تھا کہ اچانک پچاس ساٹھ ورکرز نے ہڑتال کر دی۔ان کا سرغنہ اسجد رشید نام کا ایک شخص تھا جو گارمنٹس فیکٹری میں سپروائزر تھا۔ان کا مطالبہ تنخواہ میں اضافہ اور عید پر بونس کے حصول کا تھا۔ان میں سلائی کرنے والے چونکہ فی سوٹ اور فی جیکٹ سلائی کرنے کے پیسے لیتے تھے اس لیے ان کا مطالبہ فی سوٹ سلائی کی رقم بڑھانے کا تھا۔اس سے پہلے عمار ہر بقر عید پر ایک تنخواہ کا بونس دیا کرتا۔ورکرز اس کے ساتھ عید الفطر پر بھی بونس کے متقاضی تھے

۔عمار اس دن جب آفس پہنچا اور انوار الحق نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا کہ پچاس ساٹھ کے قریب ورکرز ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اور اپنے مطالبے کے پورا ہونے سے پہلے کام کو ہاتھ لگانے کو تیار نہیں۔

یہ خبر اسے پریشان کر گئی تھی، ایسے موقع پر جب وہ دن رات کام کر کے ہی غیر ملکی کمپنی کی ڈیمانڈ پوری کر سکتے تھے، یوں پچاس ساٹھ ورکرز کا ہڑتال کر دینا بہت بڑا مسئلہ تھا۔

"آپ نے ورکرز کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟" اس نے انوار الحق سے پوچھا۔

"ایک گھنٹا تقریر جھاڑ تا رہا ہوں، لیکن انھیں اس طرح ورغلایا گیا ہے کہ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں، اس سارے معاملے میں اسجد رشید اور کرامت حسین کا ہاتھ ہے۔ دونوں سپر وائزر ہیں اور دونوں کو فیکٹری میں آئے چند ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ایسی ہی کالی بھیڑیں ہوتی ہیں جو فیکٹری کا ماحول گندہ کرتی ہیں ۔" انوار الحق کافی غصے میں تھا۔

"دونوں کی چھٹی کر دو؟" عمار نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

"اب یہ اتنا آسان نہیں رہا۔ پچاس ساٹھ ورکرز دونوں کے ساتھ کندھا سے کندھا ملائے کھڑے ہیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ جیکٹس کی ڈیمانڈ پوری کرنے کا ہے۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ عید کا موقع ہے زنانہ ، مردانہ اور بچوں کے ملبوسات کی بھی بہت زیادہ ڈیمانڈز ہیں۔"

"ہونہہ!...." کہہ کر عمار گہری سوچ میں ڈوب گیا چند لمحے بعد بولا۔ "ہنگامی میٹنگ بلا لو۔"

"جی سر!" انوار الحق مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ عمار ہمیشہ اس سے برابری کی سطح پر رہ کر گفتگو کرتا تھا لیکن اس نے ایک فاماں بردار ماتحت کی جگہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔ یوا ے کمپنی کے کلیدی عہدہ دار

،عمار کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے اور اس کی وجہ عمار کی وہ توجہ اور محبت تھی جو وہ اپنے ورکرز کے ساتھ رکھتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تمام متعلقہ عہدہ دار عمار کے آفس میں اکٹھے ہو گئے تھے۔اپنے آفس ہی کو وہ میٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔

انوار الحق نے مختصراً صورت حال پر روشنی ڈال کر تمام کو میٹنگ کے ایجنڈے سے آگاہ کیا۔

"سر!....یہ دونوں ہفتہ بھر پہلے اپنی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ لے کر میرے پاس آئے تھے۔" فیکٹری کے ڈائریکٹر عمر فاروق نے اسجد رشید اور کرامت حسین کے بارے انکشاف کیا۔

"آپ نے کیا جواب دیا تھا؟"عمار اس کی جان متوجہ ہوا۔

عمر فاروق عمار سے تین چار سال ہی بڑا تھا اور کافی سلجھا ہوا شخص تھا۔گلا کھنکار کر وہ وضاحت کرنے لگا۔"سر !....میرا خیال ہے باقی کمپنیوں کے مقابلے میں یوائے کمپنی پہلے ہی اپنے ورکرز کو بہتر تنخواہ دے رہی ہے۔اور یہی بات میں نے ان دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔"

عمار نے پوچھا۔"تو کیا جواب تھا ان کا؟"

"ان کا کہنا تھا کہ ہماری کمپنی کی کھپت بھی تو دوسری کمپنیوں سے زیادہ ہے اور یہ سارا کریڈٹ اس کے ورکرز کو جاتا ہے۔بلکہ اس ضمن میں سب سے اہم کام سپر وائزرز کا ہے جو ان ورکرز سے کام لیتے ہیں۔اور وہ بھی تمام ورکرز کی بات نہیں کرتے صرف سپر وائزر کی تنخواہ میں اضافے کے متمنی ہیں۔چاہے یہ اضافہ ہم انھیں ٹیبل کے نیچے سے دیں چاہے تنخواہ کے ساتھ ہی ادا کریں۔"(ٹیبل کے نیچے ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے باقی

ورکرز سے چھپ کر کسی مخصوص ورکر کو لگی بندھی رقم ادا کرنا)عمر فاروق ایک لمحہ سانس لینے کے لیے رکا اور پھر اس کی بات جاری رہی۔"میں نے ان کے مطالے کو نرمی سے مسترد کر دیا۔لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا اور وہ باقیوں کو ورغلا لیں گے۔"

"ہونہہ!...."عمار اثبات میں سر ہلا کر اکاو￼ نٹ آفیسر کی طرف متوجہ ہوا۔"ویسے کیا ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ ورکرز کی مطالبہ مان سکیں؟"

اکاو￼ نٹ آفیسر نے جواب دیا۔"ہم پہلے ہی کافی مراعات دے رہے ہیں سر!....یہ مطالبہ ہم پر کافی بوجھ ڈال دے گا۔"

انوار لحق بولا۔"سر!....ورکرز کا مطالبہ ناجائز ہے اور ایک دفعہ ہم جھک گئے تو وہ ہر ایسے موقع پر ہڑتال کرنا شروع کر دیں گے۔"

میٹنگ کے باقی ممبر بھی اپنی اپنی رائے دینا شروع ہو گئے تھے۔اور پھر ان کی گفتگو کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچی تھی جب چاچا عبدالحکیم نے عمار سے مشورہ دینے کی اجازت مانگی۔وہ عموماََ خاموش بیٹھا رہتا تھا۔اور اس کا میٹنگ میں شمولیت اختیار کرنا فقط عمار کو خوش کرنے کی خاطر ہوتا تھا۔

"ہاں ہاں چچا جان!....بولیں۔"عمار جلدی سے بولا،باقی بھی اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

عبدالحکیم نے کہا۔"سر جی!....ایک بات تو کنفرم ہے نا کہ یہ ساری شرارت دو آدمیوں کی ہے۔شاید کوئی تیسرا ،چوتھا بھی ان کے ساتھ شامل ہو مگر اصل سرغنہ یہی دونوں ہیں۔"

"صحیح۔"عمار نے اثبات میں سر ہلایا۔"مگر ہم انھیں نوکری سے نکالنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں نا؟"

عبدالحکیم نے کہا۔" جانتا ہوں سر!.... لیکن اگر ہم ان دونوں کو قابو کر لیں تو یہ باقی کو سنبھال لیں گے۔"

"گویا ان سے بلیک میل ہو جائیں۔اور اب تو انھوں نے کافی سخت مطالبات پیش کرنے ہیں۔"

"فی الحال ان کا مطالبہ مان لیں گے، حالات ٹھیک ہوتے ہی مکر جائیں گے ؟" پرچیزنگ ایم ڈی شیخ نواز احمد نے مشورہ دیا۔

"نہیں۔" عمار نے نفی میں سر ہلایا۔" میں اپنے کہے سے نہیں پھر سکتا۔"

"سر!.... میری بات پوری نہیں ہوئی۔" عبدالحکیم نے عمار کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

"جی چچا جان!.... آپ کہیں۔"

عبدالحکیم گویا ہوا۔" آپ دونوں کو علاحدہ بلا کر ان کے مطالبات پوچھیں، یقیناوہ اکیلے میں کھل کر بات کریں گے اور اگر ہم ان کی گفتگو باقی ورکرز کو سنوا دیں تو کوئی شک کہ نہیں تمام کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔"

عمار کی آنکھوں میں چمک ابھری اور اس نے پوچھا۔" مگر لوگوں کو سنوائیں گے کیسے ؟"

"اس کا بندوبست ہو جائے گا۔" انوار الحق اطمینان سے بولا اور پھر وہ منصوبے کی تفصیلات طے کرنے لگے۔

میٹنگ برخواست ہوئی اور تمام اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔اس دن عمار نے ہڑتال والے کسی بھی فرد سے بات نہیں کی تھی۔یہ کام انھوں نے اگلے دن تک ملتوی کر دیا تھا۔

"بہت بزدل نکلا یہ سیٹھ بھی ؟" طاہر جواد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔اس وقت وہ تمام اس کے آفس میں جمع تھے ۔طاہر جواد کے علاوہ اسلم شکور خان کو دیوالیہ کرنے والے سارے کردار وہاں پر موجود تھے۔

رئیس الدین نے کہا۔ ”اس کے علاوہ اس کے پاس چارہ ہی کوئی نہیں تھا۔ میں تو کہتا ہوں خوش قسمت تھا جو اتنی آسانی چھوٹ گیا۔“

”مگر اسے سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی میری خواہش تو پوری نہیں ہوئی نا؟“ طاہر جواد نے منہ بنایا۔

تبریز شاہ نے کہا۔ ”چھوڑو یار!.... اس کی ہر چیز پر تو اپنا قبضہ ہو گیا ہے اور انتقام لینا کس کو کہتے ہیں؟“

”پاپا!.... میں نے اسوہ کا مطالبہ کیا تھا۔“ ارشد نے اپنی راگنی الاپی۔

”یار!.... صبر کرو، وہ کہاں بھاگی جا رہی ہے؟“ طاہر نے بیٹے کو جھڑکا۔

”پہلے تھوڑا صبر کیا ہے؟“ ارشد نے احتجاج کیا۔

”تو چند دن اور کر لو بیٹا۔“

”چند دن اور بھی صبر کر لوں گا، لیکن اس کے بعد بھی مجھے اسوہ نہ ملی نا؟“ اس کا انداز دھمکی دینے والا تھا۔

”کوئی اسے مجبور تو نہیں کر سکتا کہ آپ سے شادی کر لے۔“ اس مرتبہ شیخ رئیس الدین نے تیکھے لہجے میں کہا ۔اور غالباََ اس کی منگنی بھی ہو چکی۔“

”ہو جائے گا یار!....“ رئیس الدین کی بات کے جواب میں تبریز شاہ نے اسے تسلی دی۔ ”اب وہ پہلے والی سیٹھ زادی نہیں بلکہ اسے خانہ بدوش حسینہ سمجھو اور ملک ارشد سے اچھا رشتا اسے کہاں ملے گا؟ اور جہاں تک اس کی منگنی کا تعلق ہے تو وہ ایم این اے اسلم شکور کی دولت دیکھ کر اس طرف متوجہ ہوا تھا اب جب اسے معلوم ہو گا

کہ اسلم شکور کا دیوالیہ نکل گیا ہے تو وہ بیٹے کی منگنی بغیر کسی تردّد کے ختم کر دے گا۔ اور تمھاری اسوہ نے زیادہ گڑبڑ کی تو اسے اٹھوا لیں گے، جتنا عرصہ چاہنا جی بھر کے عیاشی کر لینا۔“

”شکریہ انکل!“ شیخ رئیس الدین کی بات سن کر اس کے چہرے پر چھانے والے اداسی کے تاثرات خوشی میں تبدیل ہو گئے تھے۔

”اب کام کی بات ہو جائے۔“ فیروز خان نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”جی بالکل۔“ ملک طاہر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔ ”کام کی بات تو یہ ہے کہ اب کس دن ماں بیٹی سے کوٹھی خالی کرانا ہے۔ کیوں کہ تحریر شدہ معاہدے کی رو سے اسلم شکور نے چھے ماہ بعد قرض کی پہلی قسط ادا کرنا تھی اور ابھی تک اس تاریخ میں پانچ ماہ بقایا ہیں۔ ہم فی الحال انھیں گھر خالی کرنے کا نوٹس نہیں دے سکتے۔“

تبریز شاہ نے کہا۔ ”اس کے لیے چند ماہ انتظار کر لیں گے وہ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہیں؟“

”ٹھیک ہے۔“ طاہر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم پلاٹس کے خریداروں سے پیشگی قریباً پچیس کروڑ کے لگ بھگ رقم وصول کر چکے ہیں۔ اور اب اگر اسی طرح مزید وصولیاں جاری رکھیں تو خود ہمارے پھنسنے کا امکان ہے۔ کیونکہ پہلے تو ہم نے اسلم شکور کو سامنے رکھا تھا۔“

”اب دفع کرو اس سلسلے کو، اسلم شکور جانے اور اس کے ورثائ۔“ فیروز خان نے مشورہ دیا۔

”آپ اور میں بھی حصہ دار تھے۔“ طاہر جواد نے اسے یاد دہانی کرائی۔

فیروز خان جواباََ بولا۔ ”ٹھیک ہے اگر کوئی کیس وغیرہ کو عدالت میں لے گیا تو ہم اپنے چالیس فیصد حصے کی ادائی کر دیں گے۔ ویسے پاکستان میں ایسا ہوا نہیں کرتا۔ یوں بھی ہر جگہ پر مرحوم اسلم شکور ہی سامنے تھا، ہمیں کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔“

”ویسے ایک بات ہے، اگر لوگوں نے شور مچایا اور یہ کیس ہائی لیول تک اجاگر ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں ؟“ تبریز شاہ نے تشویش ظاہر کی۔

فیروز خان رئیسانی بے پرواہی سے بولا۔ ”کچھ بھی نہیں ہوتا شاہ جی۔ کیس کی پیروی کی لیے رقم درکار ہوتی ہے ۔ اگر کوئی مسئلہ شروع ہو بھی گیا تو چند لاکھ خرچ کرنے سے حل ہو جائے گا۔“

رئیس الدین نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فیروز خان کی تائید کی تھی۔

”اچھا تیس کروڑ روپے اسلم شکور کے وکیل خورشید علی شاہ کو ادا کر دیئے ہیں۔ اور اس نے آج یا کل تک منظر سے غائب ہو جانا تھا۔ لیکن امید ہے اسلم شکور کی موت کی خبر سن کر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہو گا۔“

تبریز شاہ نے منہ بنایا۔ ”بھاڑ میں جائے اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ؟“

”بس یہ بتانا تھا کہ اسے ہم نے تیس کروڑ کی خطیر رقم ادا کر دی ہے، باقی کی رقم میں چالیس فیصد میرے اور بیس بیس فیصد آپ تمام کے حوالے آج ہی کر دی جائے گی۔ اب آپ اس بلیک منی کو کیسے سفید کرتے ہیں یہ آپ کی اپنی صوابدید ہے۔ اس کے بعد اسلم شکور کی کوٹھی باقی رہ جاتی ہے وقت آنے پر وہ بھی اس کی تقسیم بھی اسی طریقے پر کر دی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے اب کچھ کھانے پینے کا بھی سوچو ؟“ شیخ رئیس الدین نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بس پانچ منٹ میں کھانا لگ جاتا ہے۔" ملک طاہر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد تمام خوش گپیوں میں کھانا کھا رہے تھے۔

☆☆☆

اسوہ کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ والد کی وفات کے بعد جینے میں اس کی دل چسپی ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ جانے کتنے دن گم سم رہی۔ اس کی ماں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ اسلم شکور تو ان کے گھر کی رونقیں ہی لے گیا تھا۔ چند دن تو تعزیت کرنے والوں کی چہل پہل رہی اور پھر ماں بیٹی اکیلی رہ گئی تھیں۔ اور پھر اسلم شکور کو فوت ہوئے دو ہفتے ہونے والے تھے جب گھر کا انتظام سنبھالنے والے ادھیڑ عمر اشرف نے نسرین بیگم سے اخراجات مانگے اور اس کے ساتھ ہی نسرین بیگم کی سوچ میں اس دن اسلم شکور اور طاہر جواد کے مابین ہونے والی گفتگو تازہ ہوئی۔ وہ تو شوہر کی موت کے غم میں وہ بات بھول ہی چکی تھی۔

"اشرف چچا!.... آپ ذرا وکیل سے مل کر اسوہ کے باپ کے ترکے کی بابت معلوم کریں تا کہ مجھے واضح تو ہو کہ اس وقت ہماری پوزیشن کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیگم صاحب!.... میں ابھی اس کے پاس جا کر ساری معلومات لاتا ہوں، بلکہ وکیل ہی کو یہیں بلا لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اور پھر وہ ابھی تک اپنی جگہ سے اٹھی نہیں تھی کہ اشرف تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بدحواسی میں وہ اجازت بھی نہیں مانگ سکا تھا۔

"ب.... بب.... بیگم صاحب!" وہ ہکلا کر فقط اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"چچا اشرف خیر تو ہے؟" نسرین گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"خیر بالکل نہیں ہے بیگم صاحب!....بہت بری خبر لایا ہوں؟"

"جلدی بولو میرا دل گھبرا رہا ہے؟.... کیا گڑیا تو ٹھیک ہے نا؟"

"چھوٹی بی بی بالکل ٹھیک ہے بیگم صاحب!....وہ اصل میں میری وکیل صاحب سے فون پر بات ہوئی وہ تو بہت بری خبر سنا رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہا ہے وہ؟" نسرین اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

اشرف نے تفصیل بتلاتے ہو کہا۔"اس کے کہنے کے مطابق سیٹھ صاحب نے جس زمین کو خریدنے کے لیے اپنا سارا اثاثہ خرچ کر دیا تھا وہ زمین سرکاری نکلی، فراڈ کرنے والے کہیں بھاگ گئے۔ یہ کوٹھی بھی سیٹھ صاحب نے رہن رکھی ہوئی ہے اور اس سے ملنے والی رقم بھی زمین کی خریداری کے سلسلے میں وہ فراڈیوں کو ادا کر دی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ سیٹھ صاحب نے پلاٹ بیچنے کے لیے لوگوں سے کروڑوں روپے ایڈوانس لیے تھے وہ بھی انھی فراڈیوں کے حوالے کر دیے تھے۔"

وہ ہکلائی۔"مم.... مگر انھوں نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا؟"

"وہ کاروبار کی باتیں گھر میں کرتے کہاں تھے؟ اور یاد ہے بیگم صاحب!....اس دن وہ کمینہ شخص یہی باتیں تو کر رہا تھا صاحب کو اور اسی وجہ سے انھیں دل کا دورہ پڑا تھا۔"

نسرین کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے بینک منیجر کو فون کر کے اپنے شوہر کے اکاونٹ کے بارے معلوم کرنے لگی۔

"پچاس ہزار چار سو تیس روپے ہیں بیگم صاحب!" چند منٹ بعد بینک منیجر نے خوش اخلاقی سے اسے اسلم شکور کے اکاونٹ میں جمع رقم کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

اور رابطہ منقطع کرتے ہوئے وہ شکریہ کا لفظ بھی ادا نہ کر سکی۔اس کی تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ محبوب شوہر کے بعد اب سب کچھ ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔اتنا تو اسے پہلے سے پتا چل گیا تھا کہ اس کے شوہر کے خلاف سازش ہوئی ہے، مگر وہ اس حد تک کنگال ہو گئے ہیں یہ اسے ابھی معلوم ہو رہا تھا۔اسلم شکور کی موت کا غم اس کے دماغ سے محو ہو گیا اور مستقبل بھیانک دیو کی طرح منہ کھولے اس کی سوچوں میں آن گھسا۔وہ محل نما کوٹھی اب ان کی نہیں رہی تھی۔کوٹھی میں موجود گاڑیاں بھی پرائی تھیں۔کمائی کا کوئی ذریعہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

کافی دیر انھی سوچوں میں سر گرداں رہنے کے بعد اس کا رخ اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف ہو گیا۔اسوہ بیڈ پر لیٹی جانے کن خیالوں میں کھوئی تھی۔ماں کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

"آئیں امی جان"!

نسرین خاموشی سے اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"امی جان!.... کیا بات ہے آج آپ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہی ہیں؟" ماں کے چہرے پر چھائے تاثرات دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

اور کچھ کہے بنا نسرین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"امی جان!" اسوہ آگے بڑھ کر ماں سے لپٹ گئی۔"کیا ہوا؟.... پاپا یاد آ رہے ہیں؟"

”وہ کبھی بھول بھی سکتے ہیں بیٹی“!

”ایک دن تو سب نے جانا ہے نا امی جان!“ وہ ماں کو تسلی دینے لگی۔ حالانکہ روزانہ اسے ماں تسلیاں دیا کرتی ۔ آج ماں کو روتے دیکھ کر وہ خود کو بڑا سمجھنے لگ گئی تھی۔

”بیٹی!.... وہ تو جو ہونا تھا سو ہو گیا.... اب مستقبل کا سوچو، کیا بنے گا ہم دونوں کا؟“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ماں جی! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ اسوہ الجھنے لگی۔

جواباً نسرین نے کرب بھرے لہجے میں تمام تفصیل اس کے سامنے دہرا دی۔

”اسی لیے وہ کمینے باپ بیٹا، ابو جان کے سامنے بڑھکیں مار رہے تھے؟“ اسوہ نے کہا اور نسرین اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”ویسے مجھے اسی دن اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ جب وہ دونوں اس دیدہ دلیری سے ہمارے گھر گھس آئے تھے ۔ اور یقیناً اسی وجہ سے ابو جان کو دل کا دورہ پڑا۔“

”ہاں بیٹی!.... تمھارے ابو کو بھی جانے کس نے آخری عمر میں یہ مشورہ دیا کہ وہ ان کمینوں کے جھانسے میں آ گئے۔“

”ماں جی!.... کیوں نا میں عرفان سے اس سلسلے میں بات کروں وہ ضرور کوئی حل نکال لے گا، اب اتنی آسانی سے تو میں انھیں سب کچھ ہضم کرنے نہیں دے سکتی۔“

”کر لو بیٹی!“ نسرین کے مایوس لہجے میں امید کی ہلکی سی کرن جھلکی۔

اسوہ نے کہا۔ "اس وقت تو شاید وہ مصروف ہوں میں رات کو بات کرلوں گی۔"

اور نسرین اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"ملازموں کا کیا کریں؟"

"کیا مطلب امی جان؟" اسوہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"بیٹی!.... اب ہم اتنے ملازموں کا بوجھ نہیں سہار سکتے۔ یہ معاملہ جانے کون سا رخ اختیار کرے گا، لیکن ملازموں کو تو فارغ کر دینا چاہیے نا۔ میرے اکاو□ٔ نٹ میں کچھ رقم پڑی ہے تمام کو تنخواہ دے کر رخصت کر دیتے ہیں سوائے کھانا بنانے والی ماسی اور چوکیدار کے۔"

"ٹھیک ہے ماں جی!" اسوہ ماں کے ساتھ متفق ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن جب عمار دفتر پہنچا تو ہڑتال والے اسے اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ تمام اسی بڑے ہال میں بیٹھے تھے جہاں سلائی کی مشینیں ایک ترتیب سے لگی تھیں۔ عمار، انوار الحق کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ تمام اسے دیکھتے ہی مستعد ہو گئے تھے۔ قریباً آدھے اپنی اپنی جگہ پر ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔ جبکہ باقی خاموشی سے کام میں لگے تھے۔

"کیا مجھے بتا سکتے ہو کہ آپ لوگ کیوں کام نہیں کر رہے؟" عمار نے آرام سے بیٹھنے والے ورکرز سے پوچھا۔

"جب تک ہمیں ہمارا حق نہیں مل جاتا ہم کام کو ہاتھ نہیں لگائیں گے؟" اسجد رشید نے آگے بڑھ کر پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"ہمیں انصاف چاہیے؟" کرامت حسین نے لقمہ دے کر باقی ورکرز سے تصدیق چاہی۔ "کیوں بھائیو؟"

"ہاں ہمیں انصاف چاہیے۔" پچاس ساٹھ ورکرز کی آواز سے ہال گونج اٹھا تھا۔ تمام ہڑتال کرنے والے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں مختصر سی بات پوچھوں گا، آپ میں سے کون کون میری بات مان کر ہڑتال چھوڑ سکتے ہیں؟"

عمار کی بات پر چند لمحے بھنبھناہٹ سی ابھری اور پھر دس بارہ کے قریب ورکرز نے بے ساختہ اپنے ہاتھ بلند کر لیے۔

"شکریہ۔" عمار نے خوشی کا ظہار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں بیٹھو کام کرو۔"

"غدار.... غدار...." کرامت حسین کی ایما پر چند لوگوں نے ان پر آوازہ کسا تھا مگر وہ سر جھکائے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کیونکہ ان میں زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی تھی جنھیں عمار خود تلاش کر کے لے آیا تھا۔ اور اب عمار کو سامنے دیکھ کر وہ خفت سے واپس کام پر لوٹ گئے تھے۔ ساٹھ کے قریب ورکرز اب بھی ہڑتال پر تیار تھے۔

"باقیوں کے کیا مطالبات ہیں؟" عمار نے کرامت حسین کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔ اس کی شکل سے بالکل ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ اپنے جذبات پر اسے بہت کنٹرول حاصل تھا۔ اور یہی ایک بڑے آدمی کی خوبی ہونا چاہیے کہ وہ ماحول کا اثر قبول کرنے کے بجائے ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

”میں بتاتا ہوں۔“ اسجد رشید نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”یہاں نہیں دفتر میں مذاکرات ہوں گے۔ جو لیڈر ہیں وہ آجائیں۔“ یہ کہہ کر عمار واپس مڑ گیا۔ انوار الحق بھی اس کے ساتھ تھا۔

اسجد رشید نے اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے اپنا مکا ہوا میں لہرایا اور پھر کرامت حسین کو ساتھ لے کر عمار کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

بڑے ہال سے نکل کر وہ گیلری میں پہنچے۔ اور پھر عمار کے دفتر کے سامنے پہنچ گئے۔ دفتر کے سامنے ایک کیبن بنا تھا جس سے گزر کر ہی عمار کے آفس میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ اس کیبن میں عمار کی لیڈی سیکرٹری مہ جبین اور اس کے ساتھ عبدالحکیم بیٹھا تھا۔ انھیں دفتر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر مہ جبین نے کہا۔

”سر!.... پلیز اپنے موبائل فون یہاں چھوڑتے جائیں۔“

دونوں نے منہ بناتے ہوئے اپنے موبائل فون نکال کر ٹیبل پر رکھے اور دفتر میں داخل ہو گئے۔

وہاں عمار اور انوار الحق کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ انھیں اندر داخل ہوتا دیکھ کر انوار الحق نے میز کے پائے کے ساتھ لگا ایک بٹن آن کر دیا تھا۔

”آئیں بیٹھیں کرامت صاحب اور اسجد صاحب۔“ عمار کے لہجے میں طنز کا عنصر موجود نہیں تھا، ان دونوں کو عمار کا صاحب کہنا کافی عجیب سا لگا تھا۔

وہ خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

"جی بولیں؟" عمار نے اسجد رشید کو اشارہ کیا۔

اسجد رشید جوش سے اپنے موقف کی وضاحت کرنے لگا۔ "سر!.... دیکھیں مہنگاہی کافی بڑھ گئی ہے اور ہم مزدوروں کا اس تنخواہ میں گزارا نہیں ہو سکتا اس لیے آپ مہربانی فرما کر ایک تو سال میں ایک کے بجائے دو بونس دیا کریں دوسرا حالیہ تنخواہ پر بھی نظر ثانی فرمائیں اور سلائی کرنے والے ورکرز کی فی سوٹ سلائی میں اضافہ کریں؟"

"اسجد صاحب!.... آپ جانتے ہیں کہ اس وقت ہم پر کام کا کتنا بوجھ ہے۔ کیا اخلاقی طور پر اس حالت میں آپ کا اپنے کسی بھی مطالبے کے حصول کے لیے ہڑتال کرنے کا کوئی جواز بنتا ہے؟"

اسجد رشید مکاری سے ہنسا۔ "سر!.... ساری اخلاقیات ہمارے لیے ہی رہ گئی ہیں۔ امرا کے لیے تو اخلاق قدر نہیں ہوتی۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں کوئی امیر نہیں ہوں۔ اور دوسرا ذرا یہ لسٹ ملاحظہ فرمائیں۔" عمار نے اپنے سامنے پڑی فائل سے ایک کاغذ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ "اس میں کراچی میں موجود تمام گارمنٹس فیکٹریوں کی تنخواہ کا خلاصہ درج ہے۔ اور یہ کہ سلائی کرنے والے فی جیکٹ اور سوٹ کیا معاوضا لیتے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی کی تنخواہ ہماری فیکٹری سے زیادہ ہے؟"

"ہم ان سے زیادہ کما رہے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں باقی فیکٹریوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور اس کی وجہ یو اے کمپنی کے ورکرز کی ان تھک محنت ہے۔" کرامت حسین نے گفتگو میں حصہ لیا۔

عمار کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔"آپ دونوں اصل بات کی طرف آو ٔ یہ ورکرز وغیرہ کا نام جپنا چھوڑ دو۔"

"کیا مطلب ؟"اسجد رشید نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم دونوں ہفتہ بھر پہلے عمر فاروق صاحب کے پاس اپنی تنخواہ میں اضافے کی درخواست لے کر گئے تھے۔"

"تو کیا ایسا کرنا منع ہے ؟"

"وقت کم ہے اسجد صاحب !....اپنا مطالبہ پیش کرو؟"انوار الحق مطلب کی بات پر آیا۔

"مطالبہ تو ہم نے پیش کر دیا ہے۔"کرامت حسین معنی خیز لہجے میں بولا۔

"آپ دونوں جانتے ہو کہ یہ مطالبہ نا قابل عمل ہے۔نہ تو ہم ڈیڑھ دو سو کے قریب ورکرز کی تنخواہ بڑھا سکتے ہیں اور نہ سالانہ ایک بونس دینے کی پوزیشن میں ہیں۔یوں بھی آپ دونوں اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ ابھی تک ہم اچھی طرح اپنے قدموں پر کھڑے نہیں ہو سکے پھر بھی ہم اپنے ورکرز کو اتنی مراعات دے رہے ہیں ۔"

"عمار صاحب !....ہم نے بھی پہلے تمام کی بات نہیں کی تھی صرف اپنی بات کی تھی اور عمر فاروق صاحب نے ہماری بے عزتی کر دی۔"اسجد رشید کا انداز گلہ دینے والا تھا۔

"پرانی باتوں کو جانے دو اسجد صاحب !....ابھی اپنا مطالبہ پیش کرو؟"

"ہمیں دس دس لاکھ روپے روپے دے کر آپ یہ ہڑتال ختم کرواسکتے ہو؟" اسجد رشید اطمینان سے بولا۔

"کوئی اور حل؟" عمار نے انھیں مزید ٹٹولہ۔ "میرا مطلب اگر میں صرف آپ دونوں کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کر دوں؟"

"پھر پانچ پانچ لاکھ نقد اور باقی تنخواہ میں اضافہ کر دیں۔"

"اگر بالفرض میں ایسا کر بھی دوں تو آپ باقی ورکرز کو کیسے راضی کرو گے؟....وہ تمام کیسے اپنے مطالبے سے دست بردار ہوں گے؟"

"وہ آپ ہم پر چھوڑ دیں؟" وہ دونوں معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

"پھر بھی؟" عمار مصر ہوا۔

اسجد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم انھیں کہیں گے کہ فی الحال مالک اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ ہمارا مطالبہ پورا کر سکے اور ہم مالک کو تین ماہ کی مہلت دی ہے اگر اس کے بعد بھی تنخواہ نہ بڑھائی تو پھر پکا بائیکاٹ ہو گا۔"

"اور تین ماہ بعد کیا ہو گا؟"

کرامت ہنسا۔ "لوگ ہفتے بعد اس بات کو بھول چکے ہوں گے۔"

"اور اگر میں آپ لوگوں کا یہ مطالبہ نہ مانوں تو؟" عمار کا استفسار جاری رہا۔

"تو پھر ہماری ہڑتال جاری رہے گی۔ یوں بھی اس موقع پر باقی فیکٹریاں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار ہوں گی۔"

”جبکہ وہاں آپ لوگوں کو نہ تو یہاں سے بہتر ماحول ملے گا اور نہ اتنی مراعات۔“انوار الحق نے لقمہ دیا۔

”یہ ورکرز کا درد سر ہے۔ویسے بھی اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں ؟“

”ورکرز کا درد سر کیسے ہوا؟....آپ دونوں بھی تو اسی زمرے میں آتے ہیں ؟“عمار نے معنی خیز لہجے میں پوچھا
۔

”سر!....آپ ہمارے مسئلے کو اپنا درد سر نہ بنائیں۔بس یہ بتائیں کہ ہمارا مطالبہ پورا کرنا ہے کہ نہیں ؟“

”ہونہہ!....“عمار نے گہرا سانس لیا۔”گویا آپ لوگ کسی اور کے لیے کام کر رہے ہو؟“ عمار نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے ؟“کرامت مکاری سے بولا۔

”خیر آپ دونوں نے نہایت گھٹیا پن اور نمک حرامی کا ثبوت دیا ہے۔یوں کسی کا آلہ کار بن کر معصوم ورکرز کو ورغلانا ایک غیر اخلاقی حرکت اور قابل تعزیر جرم ہے۔“

”سیٹھ صاحب!....ہم آپ کا وعظ سننے نہیں آئے؟....آپ ہمارا مطالبہ پورا کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں ؟“

”نہیں....“عمار نے نفی میں سر ہلایا۔” بلیک میل ہونے سے بہتر ہے میں حالیہ معاہدہ ہی کینسل کر دوں۔اس لیے میں آپ دونوں کو اسی وقت یہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیتا ہوں،اس کے بعد اگر آپ دونوں مجھے اپنی فیکٹری کے دائیں بائیں بھی گھومتے نظر آئے تو یقیناً اس کا نتیجہ آپ دونوں کے حق میں بہتر نہیں نکلے گا؟انتہائی غصے میں ہونے کے باوجود وہ انھیں آپ کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔

”صرف ہم دونوں نہیں جائیں گے سیٹھ صاحب!....ہمارے ساتھ ستر کے قریب ورکرز بھی جائیں گے ۔“اسجد رشید بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

عمار نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔”جو جانا چاہتا ہے ساتھ لے جاو ....ز اور ہاں اپنا حساب کتاب کیشئر سے بے باق کر کے جانا کیونکہ دوبارہ آپ لوگوں کو کسی نے یہاں نہیں گھسنے دینا۔“

”چلو کرامت!....“اسجد رشید غصیلے لہجے میں کرامت کو کہا۔اور دونوں غصے سے طنطناتے وہاں سے باہر نکل گئے۔

انوار الحق نے میز کے کنارے لگا ہوا بٹن آف کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔”اب؟“

عمار نے پوچھا۔”آپ نے ہڑتال کرنے والوں کی لسٹیں تو بنا دی تھیں نا؟“

”ہاں لسٹیں کل ہی مکمل کر لی تھیں،ابھی سراج بیٹے کو کہہ دیا تھا کہ صبح جن ورکرز نے آپ کی بات پر کام شروع کر دیا تھا ان کے نام حذف کر دے۔“

”چلو اب تمام سے بات کرتے ہیں۔“عمار اٹھ کھڑا ہوا۔مگر اس کے دفتر میں نکلنے سے پہلے اس کی سیکرٹری مہ جبین گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئی۔

”سر!....ورکرز نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔تمام اسجد رشید اور کرامت حسین کی پٹائی کر رہے ہیں۔“

”اوہ یہ کہیں انھیں قتل ہی نہ کر دیں۔“عمار گھبرائے ہوئے انداز میں کہتا ہوا بڑے ہال کی جانب بھاگا۔انوار الحق بھی اس کے ہمراہ ہی بھاگ پڑا تھا۔

دفتر سے نکلتے ہی انھیں ورکرز کی غصیلی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی۔ وہ جونھی بڑے ہال میں داخل ہوئے انھوں نے دیکھا کہ دس بارہ ورکرز اسجد رشید اور کرامت حسین کو گھیرے میں لے کر ان کی مرمت میں مصروف تھے۔

"رکو۔" عمار با آواز بلند بولا۔ تمام ورکرز اس کی آواز سنتے ہی رک گئے تھے۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے؟.... اگر آپ لوگوں نے لڑائی جھگڑا کرنا ہے تو براہ مہربانی یہاں سے باہر جا کر کریں۔" یہ کہہ کر وہ اسجد رشید اور کرامت حسین کو مخاطب ہوا۔ "میں آپ دونوں کو کہا تھا کہ یہاں سے غائب ہو جاو□ ٔ اور آپ لوگوں نے یہاں جھگڑا شروع کر دیا؟"

"جھگڑا ہم نے نہیں انھوں نے شروع کیا ہے۔" وہ دونوں اپنی باچھوں اور ناک سے رسنے والا خون پونچھتے ہوئے بولے۔

"بہ ہر حال یہ تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں مزید کسی کو جھگڑا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ دونوں فی الفور یہاں سے نکل جاو□ ٔ۔" انھیں کہہ کر وہ ساتھ کھڑے انوار الحق کو مخاطب ہوا۔ "کیشئر کو کہو ان کا حساب کتاب بے باق کر دے۔"

"جی سر!" کہہ کر انوار الحق نے ان دونوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی وہاں سے نکلنے کے بہانے تلاش کر رہے تھے فوراً اس کے پیچھے چل پڑے۔

"اگر کوئی اور جانا چاہتا ہے تو اسے اجازت ہے اپنا حساب کتاب کرا کے جا سکتا ہے۔" عمار کے لہجے میں غصے یا طنز کی آمیزش بالکل نہیں تھی۔

مگر تمام سر جھکائے اپنے سیٹوں کی طرف بڑھ گئے۔

"یہ تمام نزدیک آجائیں میں نے چند باتیں کرنا ہیں۔" عمار نے تمام کو نزدیک بلایا۔ تمام اپنی کرسیاں چھوڑ کر اکٹھے ہو گئے تھے۔

عمار نے ایک سلائی مشین کو ایک سائیڈ پر کر کے میز پر چڑھ گیا تاکہ تمام اسے نظر آئیں۔

چند لمحے ذہن میں الفاظ کو ترتیب دینے کے بعد وہ گویا ہوا۔ اصل واقعے سے آپ تمام واقف ہیں۔ گو مجھے ان دونوں یا ان کے ساتھ شامل باقی افراد کو نکالنے کے لیے کوئی ڈراما ترتیب دینے کی ضرورت نہیں تھی، مگر میں نے یہ سوچ کر یہ پروگرام بنایا تاکہ آپ لوگوں کو پتا چلے کہ اس طرح کے لیڈرز کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے ورکرز کو حتی الوسع آرام دینے کی کوشش کی، اچھی تنخواہ دی، عزت دی اور کسی کو بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوا تو اس کی مدد کی۔ اور میری اچھائیوں کا یہ صلہ ملا کہ دو بے ایمان لٹیروں کے ساتھ مل کر میری کمپنی کے آدھے سے زیادہ ورکرز نے ایسے حالات میں ہڑتال کر دی جب مجھے ان کی سخت ضرورت تھی گویا مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی۔ کیا ایسے لوگوں پر میں آئندہ بھروسا کر سکتا ہوں؟" اس نے بات کرتے کرتے ایک دم سوال داغا۔

کافی لوگوں نے زوردار آواز میں جواب دیا۔ "نہیں سر"!

عمار جانتا تھا کہ جواب دینے والے وہ ورکرز تھے جو اس ہڑتال میں شامل نہیں تھے۔

"بالکل صحیح جواب دیا۔ اب میں ان لوگوں پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ اس فیکٹری کی داغ بیل ڈالتے وقت میں نے اور انوار بھائی نے عہد کیا تھا کہ ایمان داری ہمارا نصب العین ہو گا اور ہم اپنے ہاں کام کرنے والوں کو ایک گھر

کے افراد کی طرح سمجھیں گے۔ اس وقت جو ورکرز ہمارے پاس موجود تھے وہ آج بھی تن من دھن سے یو اے کمپنی کے لیے کام کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کمپنی کو اپنی کمپنی سمجھتے ہیں۔ میں کسی کی محنت کو ضائع نہیں جانے دیتا اس کی زندہ مثال چچا عبدالحکیم کی بیٹی شائلہ بہن ہے۔ وہ ایک ورکر کے طور پر آئی تھی بہ مشکل سلائی کرنا جانتی تھی آج وہ خواتین کے شعبے کی منیجمنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ اور زنانہ ملبوسات کے ڈیزائینگ شعبے کی بھی ڈائریکٹر وہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک ورکرز ایسے ہیں جو نہایت معمولی ورکر کے طور پر کمپنی میں آئے اور آج اہم شعبوں پر براجمان ہیں۔ خیر بات دور نکل گئی میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے ورکرز کا یہ رویہ دیکھ کر دکھ پہنچا۔ اور میں اللہ پاک کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج میرے پاس ان لوگوں کے ناموں کی لسٹ آگئی ہے جو اس کمپنی کو اپنی کمپنی سمجھتے ہیں اور ان کی بھی جنھیں صرف اپنی ذات سے غرض ہے۔ اب مجھے مخلص ورکرز کو ڈھونڈنے کی تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی۔ اسی طرح چونکہ ہڑتال کرنے والوں نے انصاف مانگا تھا تو میں نے انوار صاحب کو کہہ کر باقی فیکٹریوں کے ورکرز کی تنخواہ لسٹ منگوالی ہے، اس لسٹ کے مطابق جو فیکٹری اپنے ورکرز کو سب سے زیادہ تنخواہ دیتی ہے ان کے اور ہمارے ورکرز کی تنخواہ کے درمیان قریباََ ہزار روپے کا فرق ہے جو زیادہ ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح فی سوٹ سلائی بھی ہماری کمپنی زیادہ ادا کرتی ہے، یہاں تک کہ اوور ٹائم لگانے والوں کے لیے فی گھنٹا معاوضا بھی ہم دوسری فیکٹریوں سے زیادہ ادا کرتے ہیں۔ اب انصاف کے طلب گاروں کو میں اتنی ہی تنخواہ دوں گا جتنی دوسری کمپنی دے رہی ہے، اسی طرح فی سوٹ یا جیکٹ سلائی کا معاوضا اور اوور ٹائم وغیرہ بھی دوسری کمپنی کے حساب سے ہوگا۔ البتہ ہڑتال میں حصہ نہ لینے والوں کی گزشتا تنخواہ یا سلائی کا معاوضا برقرار رہے گا۔ اب ہڑتال کرنے والے ورکرز کو میری کمپنی میں عارضی ورکرز اور میرا ساتھ دینے والوں کو مستقل ورکرز کی تقسیم سے درج کیا جائے گا۔ اس بات پر کسی کو کوئی اعتراض ہے تو وہ نوکری چھوڑ کر جا سکتا ہے۔"

ادھیڑ عمر سعید نے زبان کھولنے کی جرا￼ت کی۔"سر!....ہم شرمندہ ہیں، معذرت خواہ ہیں۔ ہمیں ایک موقع عنایت کر دیجئے؟"

عمار نے اطمینان سے کہا۔"میں نے سب کو معاف کر دیا ہے، لیکن چونکہ آپ لوگوں نے انصاف مانگا تھا اس لیے تنخواہ اور معاوضے والی جو بات میں نے طے کر دی وہی رہے گی۔"

دو تین اور بندوں نے ہمت کر کے معذرت کی آواز بلند کی مگر عمار نے ہاتھ اٹھا کر انھیں بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"جب کہہ دیا کہ معافی تلافی کی کوئی ضرورت نہیں تو اس بارے ہر آدمی کو زبان کھولنے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً آپ لوگوں کو شرمندہ ہونا چاہیے کیونکہ جن کی اقتداء آپ کر رہے تھے ان کا کردار کھل کر سامنے آچکا ہے۔ اب براہ مہربانی تمام اپنے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جائیں اس کے ساتھ میں کمپنی کے مستقل ورکرز کے لیے عید الفطر پر آدھی تنخواہ کا بونس کا اعلان کرتا ہوں۔"

ہڑتال نہ کرنے والوں نے زوردار انداز میں تالیاں بجا کر عمار کے اعلان کا خیر مقدم کیا اور عمار میز سے اتر کر اپنے دفتر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

"ارے واہ، آج تو ہماری عید ہو گئی۔" اسوہ کی کال اٹینڈ کرتے ہی عرفان خوش دلی سے بولا۔

"وہ اصل میں مجھے آپ سے ایک کام تھا۔" اس کا رومنٹک لہجہ اسوہ کو پریشان کر دیتا تھا۔ ایک دم اس کی سوچوں میں عمار آن گھستا۔

"چلو، کسی غرض ہی سے سہی۔ منگیتر کو ہماری یاد تو آئی۔"

"کیا آپ کے پاس وقت تو ہے نا، مصروف تو نہیں ہیں آپ؟" اسوہ کوشش کے باوجود اس سے بے تکلف نہیں ہو پا رہی تھی۔

"ارے مصروفیت گئی بھاڑ میں، تم کام بتاو ٔ؟"

جواباً اسوہ دھیمے لہجے میں اسے ساری تفصیل بتانے لگی۔ اس نے ارشد کی بدتمیزی سے لے کر اپنے والد کے دیوالیے اور ہارٹ اٹیک تک کی تمام تفصیل دہرا دی۔

اس کی بات ختم ہونے کے چند لمحے بعد تک ارشد کچھ نہیں بولا پایا تھا۔ اور پھر جب اس کی محبت سے عاری آواز رسیور سے برآمد ہوئی۔

"اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اسوہ اس کی بات سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ پیار و محبت کے دعوے دار کے روکھے الفاظ اسے حیران ہی نہیں پریشان بھی کر گئے تھے۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا آپ کو پتا نہیں چلا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟"

عرفان نے لاتعلقی سے کہا۔ "نہیں۔"

"ان فراڈیوں نے میرے ابو جان کو لوٹ لیا، سب کچھ چھین لیا ہم عرش سے فرش پر آ گرے اور آپ پوچھ رہے ہیں میں کیا چاہتی ہوں؟" وہ دکھ سے گویا پھٹ پڑی تھی۔

"ایسے فراڈ کرنے والوں نے مکمل انتظام کیا ہوتا ہے۔ یہ کوئی ثبوت پیچھے نہیں چھوڑتے ان کے ساتھ عدالتی کارروائی میں الجھنا صرف وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ اور یہی مشورہ میں آپ کو دوں گا۔ جو ہوا اسے بھول جاو□ ں۔ آپ کے والد صاحب کو خود احتیاط کرنا چاہیے تھی۔ ایک ایسے بندے پر انھوں نے اتنا اعتبار کیوں کیا کہ جو ماضی میں ان کے ہاتھوں نقصان بھی اٹھا چکا تھا۔"

"آپ کے بہ قول ساری غلطی ابو جان کی تھی۔"

"میرا ایسانہ سمجھنے سے اگر کوئی فرق پڑتا تو شاید میں اپنی سوچ کو تبدیل بھی کر دیتا۔"

"بڑی مہربانی عرفان صاحب جو آپ نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ ویسے میں نے مدد کے حصول کے لیے کال کی تھی؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گفتگو میں طنز کے زمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں میں اس معاملے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" کہہ کر عرفان نے رابطہ منقطع کر دیا تھا ۔وہ حیرانی سے فون کو تکتے رہ گئی۔

"کیا یہ وہی عرفان ہے جو اس سے پہلے مجھ سے باتیں کیا کرتا تھا؟" ایک تلخ سوچ اس کے دماغ میں گونجی۔ یقینی طور پر باپ کی وفات اور پھر دولت کے چھن جانے سے وہ ایک دم بے آسرا ہو گئی تھی۔ عرفان کا لہجہ سن کر تو اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ اس سے منگنی ہی توڑ دے۔ جو شخص ان حالات میں اس کی مدد کے لیے تیار نہیں تھا وہ مستقبل میں اس کا کیا ساتھ دیتا۔ اور پھر اب تو اس کی پشت پناہی کرنے والا باپ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ بہانے کی تلاش میں سرگرداں آنسوؤں کو ایک بار پھر موقع مل گیا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھیں جل تھل ہونے لگیں۔

بیٹی سے گفتگو کرتے ہی نسرین نے اشرف چچا کو بلا کر ساری صورت حال اس کے سامنے رکھتے ہوئے۔ اسے ملازموں کو فارغ کر دینے کا کہا اور ان کی تنخواہ کے ضمن میں مطلوبہ رقم کا چیک اس کے حوالے کر دیا تا کہ وہ تمام ملازموں کو ان کی تنخواہ دے کر انھیں رخصت کر دے۔

سہ پہر تک تمام ملازم سوائے چوکیدار اور ماسی تابندہ کے رخصت ہو گئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ نسرین سے مل کر گئے تھے۔ تمام جانے پر خوش نہیں تھے لیکن نسرین کی مجبوری بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں تھی۔ خود نسرین انھیں نم آنکھوں سے رخصت ہوتا دیکھتی رہی۔ اسوہ اور اسلم شکور کے برعکس وہ ایک سادہ سی گھریلو خاتون تھی۔ اس نے ہمیشہ ملازموں کو گھر کے فرد کی طرح سمجھا تھا۔ مگر اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ ملازموں کی ضرورت پہلے سے شدید ہونے کے باوجود وہ اس عیاشی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ چوکیدار اور ماسی کو بھی اس نے بہ حالت مجبوری ہی پاس رکھا تھا۔

اگلے دن وہ ناشتا کر رہی تھی کہ اس کمرے میں پڑے فون کی گھنٹی بجی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ ابھی تک اس نے فون کے کنکشن کاٹنے کی درخواست نہیں دی تھی۔ گھر میں پی ٹی سی ایل کے تین چار نمبر لگے ہوئے تھے اور یقیناً اب تو وہ ایک فون کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

رسیور اٹھا کر اس نے کال رسیو کی۔

"اسلام علیکم نسرین بہن!...." دوسری جانب اس کی سمدھن اور فرقان علی شاہ کی بیوی شگفتہ بات کر رہی تھی۔

"وعلیکم اسلام!" وہ خوش دلی سے بولی۔ "کیسے یاد کیا بہن؟"

"وہ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا تھا تو میں نے سوچا آپ سے مشورہ کر لوں؟" شگفتہ نے عام سے لہجے میں کہا۔ مگر نسرین کا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا۔

"جی بہن!.... ضرور۔" وہ اپنے اندیشوں کو جھٹلا کر شگفتہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"بہن!.... بات ذرا معیوب سی ہے مگر آپ محسوس نہ کرنا بس ہماری مجبوری ہے۔"

"جی جی آپ بولیں۔" اس کی غیر ضروری تمہید نسرین کو پریشان کیے دے رہی تھی۔

"وہ اصل میں ہم نے اسوہ بیٹی کا رشتا بہت محبت سے مانگا تھا، عرفان بھی بہت خوش تھا۔ لیکن اب فرقان کی بھتیجی رخشندہ جو لندن کی ایک یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی وہ ہفتہ ہوا واپس لوٹی ہے اور آتے ساتھ عرفان بیٹے کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس کا والد ذیشان بھی اپنے بھائی پر عرفان اور رخشندہ کا نکاح کرنے پر زور دے رہا ہے۔ تو میں نے کہا آپ سے مشورہ کر لوں کہ اب ہم کیا کریں؟"

"ای.... اس میں مشورے کی کیا بات ہے؟.... آپ انھیں بتائیں نا کہ عرفان کی منگنی تو ہو چکی ہے؟" وہ ہکلا گئی تھی۔

"یہی تو مصیبت ہے بہن!.... وہ رخشندہ تو بالکل پاگل ہوئی ہے عرفان بیٹے کے پیچھے اور عرفان کی دوسری بیوی بننے پر بھی تیار ہے۔ جبکہ مرحوم اسلم بھائی نے یہ شرط پیش کی تھی کہ اسوہ بیٹی کی اجازت کے بغیر عرفان دوسری شادی کا مجاز نہیں ہو گا۔"

"آپ جو کہنا چاہتی ہیں صاف صاف کہیں شگفتہ بیگم!" نسرین نے ایک دم ہمت مجتمع کر کے اصل بات جاننا چاہی۔ خواہ مخواہ کڑھنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

وہ مکاری سے بولی۔ ”سیدھی بات یہ ہے بہن جی!.... کہ آگے آنے والے الیکشن کے لیے فرقان صاحب کو ایک بڑے سرمائے کی ضرورت ہے اور ان کی یہ ضرورت اس کا بھائی ذیشان ہی پوری کر سکتا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ عرفان پہلے رخشندہ سے شادی کر لے اور بعد میں اسوہ سے، آگے جیسے آپ کی مرضی؟“

”گھما پھرا کر بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے شگفتہ بیگم!.... اسوہ اور عرفان کی منگنی ہی ہوئی تھی شادی تو نہیں کہ آپ کو اتنی صفائیوں کی ضرورت پڑے۔ آپ عرفان کی ایک نہیں چار چار شادیاں کریں ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے۔ بس کسی کو بھیج کر اپنی انگوٹھی واپس لے جایئے گا اب کہاں رخشندہ بی بی کے لیے نئی انگوٹھی خریدتی پھریں گی۔“

”آپ تو خفا ہونے لگیں؟“ شگفتہ بیگم نے چاپلوسی سے کہا، ورنہ اس کے لہجے سے ظاہر ہونے والی خوشی نسرین محسوس کر سکتی تھی۔

”میں خفا اپنے مقدر سے ہوں مسز فرقان!.... اور یقیناً گزشتہ ارات اسوہ بیٹی نے عرفان کو اپنی بپتا سنا دی ہے تبھی آپ کی شفقت کا دھارا رخشندہ بی بی کی جانب مڑا ہے۔ خیر مجھے کوئی گلہ نہیں۔ بس ہماری انگوٹھی واپس بھیج کر اپنی انگوٹھی لے جایئے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے شگفتہ کا جواب سنے بغیر رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک بیٹی کی ماں کے لیے بیٹی کی منگنی ٹوٹنے خبر جتنی دل خراش اور صدمے کا باعث بن سکتی ہے اس سے ہر حساس دل واقف ہو گا۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اپنی بیٹی کو جا کر یہ خبر بتائے۔ اور پھر وہ اسی سوچ میں سر گرداں تھی کہ اسوہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جانے کتنے دنوں بعد وہ اس کی خواب گاہ میں آئی تھی۔

"امی جان!....ناشتا کر لیا؟"

"ہاں بیٹی!" اس نے اپنا لہجہ خوش گوار بنانے کی کوشش کی مگر لہجے میں شامل دکھ وہ کوشش کے باوجود نہیں چھپا پائی تھی۔

مگر اسوہ اس کے دکھی لہجے پر اس لیے بھی دھیان نہیں دے سکی تھی کہ ان دونوں یوں بھی گھر میں دکھوں کی آمدورفت تھی اور وہ ماں کے لہجے میں شامل دکھ کو کسی پرانے دکھ کے ساتھ نتھی کر رہی تھی

"امی جان!....رات میری عرفان سے بات ہوئی تھی، لیکن اس نے کوئی امید افزا جواب نہیں دیا۔"

"جانتی ہوں بیٹی!....یوں بھی مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ مصیبت کی مثال تو اس حاملہ مادہ کی سی ہوتی ہے جو ہر لمحے نیا بچہ جنتی رہے۔"

"ماں جی!.... آپ تو کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہی ہیں۔" ماں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

نسرین کی آنکھوں میں نمی ظاہر ہوئی اور وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "تمھاری ساس کا فون آیا تھا تھوڑی دیر پہلے ۔انھوں نے رشتا ختم کر دیا ہے بیٹی"!

اسوہ چند لمحے تو ماں کی بات پر غور کرتی رہی اور پھر جب بات اس کے پلے پڑی تو اچانک ہی اس کا دل خوشی کے مارے دھڑکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک دم اتنی خوش کیوں ہو گئی ہے۔

"اب تو تم اپنے عمار کا انتظار کر سکتی ہو؟" اس کے کانوں میں جیسے کسی نے سرگوشی کی اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"بیٹی!.... کیا ہوا خیر تو ہے؟" نسرین بیگم گھبرا گئی تھی۔

"ہاں ماں جی!.... اس دکھ بھرے ماحول میں آپ نے اتنی اچھی خبر جو سنائی ہے۔" وہ خوشی سے چہکی۔

"اسوہ بیٹی!.... ایسی باتوں کو دل پر نہیں لیتے...." نسرین ابھی تک اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ پائی تھی۔

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ "ماں جی!.... آپ جانتی تو ہیں کہ میں یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابو جان کے جانے کے بعد میں خود یہ منگنی توڑ دیتی مگر ہمت نہ کر سکی، جو رشتا ابو جان جوڑ گئے تھے وہ کیسے توڑتی۔ اب انھوں نے خود پہل کر دی ہے تو خوشی تو ملے گی نا؟"

اور بیٹی کے لہجے میں چھلکنے والی سچی خوشی نسرین کو بھی نہال کر گئی تھی۔ وہ بے ساختہ اس سے لپٹتے ہوئے مسکرا دی۔

"اللہ کرے میری بچی سدا یونھی مسکراتی رہے۔" اس کے دل سے دعا نکلی تھی۔

"آمین۔" اسوہ نے جواباً کہا۔

اسوہ کی خواب گاہ ایک بار پھر عمار کی یادوں سے سج گئی تھی۔ اپنی منگنی ہونے کے بعد وہ عمار کی یادوں سے جان چھڑانے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتی رہتی مگر اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ اور پھر والد کی وفات نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی سلب کر لی تھیں۔ لیکن یہ صورت حال بھی زیادہ دن برقرار نہ رہی

اور مستقبل کے مسائل نے اسے ماضی کے گرداب سے نکال کر حال میں لا پھینکا۔اور اب منگنی ٹوٹنے کی خبر نے ایک بار پھر اس کے دل میں امید کی شمع روشن کر دی تھی۔

"اب تو میں مرتے دم تک تمھارا انتظار کروں گی۔" وہ تصور میں عمار کی صورت لا کر مسکرا دی۔ "اور اگر تم نے بھی میرے علاوہ کسی سے شادی کرنے کی کوشش کی تو جان لے لوں گی تمھاری۔ وعدہ نبھانے پڑے گا اپنا۔ یاد ہے نا کیا کہا تھا کہ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرو گے؟" ہنسی اس کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔ سارے دکھ اور غم جیسے کہیں رفوچکر ہو گئے تھے۔ بہت دنوں بعد اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔اس کی ماں بھی بیٹی کو اتنا زیادہ خوش دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

موبائل فون کی گھنٹی نے اسے خیالات کی خوش گوار دنیا سے باہر کھینچا۔ موبائل فون کی سکرین پر عرفان کا نام دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔ پہلے تو اس کا ارادہ کال کاٹنے کا ہوا مگر پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کال اٹینڈ کر لی۔

"جی فرمائیں؟" اس نے سلام و دعا کے بغیر گفتگو شروع کر دی۔ ناپسند تو وہ اسے پہلے سے تھا اب ان کی طرف سے رشتے کا انکار سن کر ان کا ظرف بھی سامنے آ گیا تھا۔

"آپ سے ایک بات کرنا تھی؟" اس کی روکھا لہجہ سن کر وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

"تو یہی تو پوچھا ہے فرمائیں؟"

"دیکھو اسوہ!.... امی جان نے آج آپ کی ماں سے بات کی ہے، یقیناً آپ تک وہ بات پہنچ گئی ہو گی۔ امی ابو میری شادی میری کزن رخشندہ سے کرنا چاہ رہے ہیں، لیکن وہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"تو اس سلسلے میں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مم.... میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ہم چھپ کر شادی کر سکتے ہیں، میں آپ کو علاحدہ مکان لے کر دوں گا اور آپ کے لیے عیش و آرام کا مکمل خیال رکھوں گا۔ بے شک آپ اپنی امی جان کو بھی ساتھ رکھ لینا........؟"

اسوہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مسٹر عرفان!.... افسوس اس بات کا ہے کہ میرے دماغ میں جو گالیاں اور بکو اس باہر نکلنے کے لیے مچل رہی ہیں، لڑکی ہونے کے ناتے میں انھیں الفاظ کی شکل میں اپنی زبان سے ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ ورنہ یقیناً میں تمھیں وہ کھری کھری سناتی کہ اپنی بقیہ زندگی کسی لڑکی کو ایسی آفر کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتے۔ اور ایک دوسری بات بھی ذہن میں رہے تم سے منگنی میں نے پاپا کے مجبور کرنے پر کی تھی ورنہ تم جیسوں سے بات کرنا بھی میرے لیے کارِ دار ہے اور یقیناً تمھیں اس بات کا اندازہ منگنی ہونے کے بعد ہی ہو گیا ہو گا۔" یہ کہتے ہی اس نے عرفان کی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ موبائل فون آف کر کے اس نے تپائی پر رکھا کہ وہ عمار سے مکالمے کے وقت کسی دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔ آنکھیں بند کر کے وہ ایک بار پھر اپنے محبوب کے روبرو پہنچ گئی جو اس کے کال اٹینڈ کرنے پر شکوہ کناں تھا۔

☆☆☆

آفتاب احمد ایک ایمان دار اور محنتی شخص تھا۔ دو سال کے اندر اندر یوا ے کنسٹر یکشن کمپنی ایک جانا پہچانا نام ہو گیا تھا۔ ایمان داری اور اپنے کام کو بہترین طریقے سے سر انجام دینے کی صلاحیت کی وجہ سے انھیں دھڑا دھڑا ٹھیکے مل رہے تھے۔ سرکاری کام کے ٹھیکے انھیں نہ ہونے کے برابر ملے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ رشوت

اور ٹھیکا دلانے والے کا حصہ نکالنے پر راضی نہیں ہوئے تھے۔البتہ پرائیوٹ کام کرانے والے کافی گاہک ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔انھیں فیلڈ کے عملے میں مسلسل اضافہ کرنا پڑ رہا تھا۔اور پھر کراچی کے علاوہ انھیں لاہور،فیصل آباد،ملتان وغیرہ میں بھی مختلف تعمیراتی کاموں کے ٹھیکے مل گئے۔مجبوراًعمار کو لاہور،فیصل آباد اور ملتان میں بھی کمپنی آفس قائم کرنا پڑے۔کنسٹرکشن کمپنی اور گارمنٹس فیکٹری کے ساتھ اس نے پراپرٹی کی خرید و فروخت میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔دولت نے اس کے گھر کا رستا یوں دیکھا تھا کہ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتا تو وہ سونا بن جاتی۔

ایک چھوٹا سا مکان خرید کر وہ اپنے والدین کے ساتھ وہاں رہائش پذیر ہو گیا تھا۔مالی حال میں آسودہ ہونے کے باوجود جانے کیوں وہ خود کو ابھی تک اس مقام پر نہیں پاتا تھا کہ اسوہ کو متاثر کر سکے۔وہ اپنی محنت اور جستجو میں مصروف رہا۔انوارالحق نے اس کے مشورے پر ٹیکسٹائل مل کی بھی بنیاد ڈال دی تھی۔اس میں بھی ستر فیصد حصہ عمار کا تھا۔یو اے گروپ آف کمپنیز کا نام اب شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔اتنی شہرت اور دولت کے باوجود اس نے امراء کے گھٹیا شوق نہیں پالے تھے۔جوا،شباب،شراب وغیرہ سے وہ کوسوں دور بھاگتا تھا۔ شراب کی ایک دو محفلوں میں اسے بہ حالت مجبوری شامل ہونے کا اتفاق ہوا تھا مگر اس نے ام الخبائث کو ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔جس سوسائٹی تک اس کی پہنچ ہو گئی تھی وہاں مخلوط سسٹم رائج تھا اور ایسی محفلوں میں اکثر وہ آزاد خیال اور بے باک لڑکیوں کا مرکز نگاہ بنا رہتا۔صورت اللہ پاک نے اچھی دی تھی اور دولت مندی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔یوں بھی اس کے غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے لڑکیاں کچھ زیادہ ہی اس میں دلچسپی لیتی تھیں مگر اس کے دل میں تو ایک ہی موجود تھی۔وہی اسوہ جس نے ہمیشہ اسے تضحیک کا نشانہ

بنایا، حقارت سے نوازا اور نخوت سے پیش آئی۔ وہی آج بھی اس کے دل کے سنگھاسن پر براجمان تھی اور دور دور تک اس کے اٹھنے کا امکان نظر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

والد کی موت کے بعد وہ پہلی بار گھر سے نکلی تھی۔ اس کا ارادہ اسماء اور مدثر کو ملنے کا تھا۔ وہ دونوں اس کے والد کی وفات پر دو تین دن مسلسل تعزیت کے لیے آتے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اپنی کار ان کے گھر کے سامنے روک کر وہ اطلاعی گھنٹی بجا رہی تھی۔ دروازہ مدثر ہی نے کھولا تھا کہ وہ اتوار کا دن تھا۔ اسوہ کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا تھا۔

"ارے میری بہن آئی ہے۔" اس نے زوردار طریقے سے پکار کر اسماء تک اپنی آواز پہنچائی۔

"کیا...." اسماء باورچی خانے میں تھی مدثر کی آواز سنتے ہی بھاگ کر باہر نکلی اور اسوہ کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔

"کیسی ہو اسوہ بہن؟" اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"الحمد للہ، بالکل ٹھیک۔"

اس کے لہجے میں شامل خوشی اسماء اور مدثر کے لیے خوشگوار حیرت کا باعث بنی تھی۔

"چلو آؤ نا.... تم تو یہیں رک گئی ہو؟" اسماء نے اسے ڈرائینگ روم کی جانب کھینچا۔ اور اسوہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی۔

اسماء مدثر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "آپ بازار سے کچھ لاتے ہیں، امی جان کو کہتے ہیں یا خود چائے بناتے ہیں ۔میری طرف سے کھلا انکار سمجھو۔میں فی الحال اپنی بہن کے ساتھ گپ شپ کروں گی؟"

"پتا نہیں کس بے وقوف کے کہنے پر میں نے شادی کی تھی؟" مدثر افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتا ہوا باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا اور وہ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

"چھوڑا نھیں، شوہر ہوتے ہی ایسے ناشکرے ہیں۔" اسماء نے مسکرا کر کہا۔"تم سناو کیسے بھول پڑیں؟"

"بس دل کر رہا تھا اپنی بہن سے ملنے کو؟"

"روزانہ کیوں نہیں کرتا یہ دل۔" اسماء نے اس کی پسلیوں میں انگلی چبھوئی۔

"کرتا تو روزانہ ہی ہے مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ روز کا آنا جانا قدر کم کر دیتا ہے تو میں اپنی قدر تو کم نہیں ہونے دے سکتی نا؟"

"ویسے آج بہت خوش دکھائی دے رہی ہو؟" اسماء قریب ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

"خبر ہی ایسی ہے تم بھی سن کر خوش ہو جاو گی۔"

"تو جلدی بتاو نا؟" اسماء نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"عرفان نے منگنی توڑ دی ہے۔" اسوہ نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا۔

"کیا....؟" اسماء حیران رہ گئی تھی۔"مگر کیوں؟"

”کیوں کہ اس نے ایک سیٹھ زادی سے شادی کی تھی اور جب اسے معلوم ہوا کہ ہمارے پاس دولت نہیں رہی تو اس کے والدین نے یہ رشتا ختم کرنے میں دیر نہیں لگائی۔“

”کیا مطلب دولت نہیں رہی؟“ اسماء ہنوز بات کی تہہ تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

جواباً اسوہ کو تمام کہانی سنانا پڑی۔ اس دوران مدثر بھی چاے اور کھانے پینے کے لوازمات کے ساتھ آ گیا تھا۔ وہ بھی بغیر کوئی سوال کیے اسوہ کی بات سننے لگا۔

اسوہ کی بات ختم ہوتے ہی وہ دونوں پریشان ہو گئے تھے۔ ”اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور تم ہمیں ابھی بتا رہی ہو۔“

"حادثہ کیسا؟....پاپا کی موت سے بڑا کوئی حادثہ نہیں۔یوں بھی دولت آنی جانی چیز ہے، آج میرے پاس تو کل کسی اور کے پاس۔"

"مگر اب تم کیا کرو گی اور کہاں جاو گی؟....وہ پنچ ذہنیت کے باپ بیٹا تو دن گن رہے ہوں گے مہلت ختم ہونے کے؟"

"اللہ پاک کی زمین بڑی وسیع ہے اسماء بہن"!

"میں تو تمھیں خوش دیکھ کر نہال ہو گئی تھی، تم نے پریشان کر دیا۔"

"خوش تو میں ہوں، آخر عرفان سے جان جو چھوٹ گئی میری۔عمار کا حصول میرے لیے مال و دولت، کوٹھی بنگلہ اور جائیداد سے کہیں بڑھ کر خوشی اور سکون کا باعث ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس نے بھی کہیں شادی کر لی ہو؟" خاموش بیٹھے مدثر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

اسوہ اعتماد سے بولی۔"اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔"

"روزگار کا غم بڑے بڑے وعدے بھلا دیتا ہے۔" مدثر نے حقائق اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

"اور یہ بھی تو دیکھو کہ کتنا عرصہ ہوا اس نے تمھاری خبر نہیں لی؟" اسماء نے مدثر کا ساتھ دیا تھا۔

"یہ اندیشے مجھے عمار کے انتظار سے نہیں روک سکتے۔ میں چاہتی ہوں کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس سے ملاقات ہو تو میں اسے بتا سکوں کہ بہت کچھ گنوا کے محبت کرنا میں نے بھی سیکھ لیا۔ اور یہ بھی کہ میں اس کے دعوے کے آسرے پر آج بھی اس کی منتظر ہوں۔"

مدثر مسکرایا۔ "اور جب وہ اپنی انگلی تھامے بچے کو کہے گا کہ۔ "ان سے ملو یہ ہیں تمھاری پھوپھو اسوہ۔"

"ان شاء اللہ ایسا نہیں ہو گا۔" اسوہ اعتماد سے بولی۔ "اور بالفرض ہو بھی گیا تو مجھے عمار سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہو گا کیونکہ ایسا ہونے کی وجہ میرا وہ ناروا رویہ ہے جس کی وجہ سے عمار کو یونیورسٹی چھوڑ کر جانا پڑا۔ میں نے اگر اس کے انتظار کو امید کی راہ دکھائی ہوتی تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ جب تک مجھے اس کی شادی کنفرم نہیں ہو جاتی میں شادی نہیں کروں گی۔"

"ہم بھی کن باتوں میں الجھ گئے بہن!...." اسماء نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ بتاو □ ﺯ کہ ان مردود باپ بیٹے کا فراڈ نہیں پکڑا جا سکتا؟"

"ایک تو میں ان قانونی پیچیدگیوں سے واقف نہیں ہوں۔ دوسرا اگر کچھ ہو سکتا تو ابو جان کو صدمے سے ہارٹ اٹیک نہ ہوتا، یقیناً انھیں حالات کی سنگینی کا احساس تھا اسی لیے وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔"

"اسوہ بہن!.... میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آپ اتنی مطمئن کیوں ہیں؟" مدثر نے حیرانی ظاہر کی۔

"بھائی میں مطمئن نہیں ہوں بس خود کو مطمئن ظاہر کر رہی ہوں۔ اور میں نے رب کی رضا پر راضی ہونا سیکھ لیا ہے۔ اپنی منگنی پر بھی میں پریشان تھی اور سمجھ رہی تھی کہ میں نے عمار کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا لیکن دیکھ لو کہاں گئی میری منگنی۔ اصل بات یہ ہے بھائی کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے پاک پروردگار کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ میں

نے اپنی سی کوشش کی ہے۔امی جان نے بھی ہاتھ پاوں مارے ہیں مگر نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات۔اب ہر وقت رونے دھونے سے بس دشمن ہی خوش ہو گا اور میں دشمنوں سے کم از کم یہ خوشی چھیننا چاہتی ہوں۔یہ باپ بیٹا وہی ہیں جو ایک دن منتیں کر کے میرے آگے ہاتھ باندھ رہے تھے اور میرے پاوں میں گر رہے تھے ،آج اگر اپنی مکاری سے وہ ہمیں نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو میں رو دھو کر ان کی خوشی کو دوبالا نہیں کر سکتی۔وہ کیا خوب کہا ہے کسی مفکر نے کہ اگر آپ اپنی شکست پر مسکرا دیں تو جیتنے والے کی جیت کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔“

”بہن!....اگر ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ضرور حکم کرنا۔“

”یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بھائی!....اگر آپ کو اور اسماء کو نہیں بتاو ں گی تو اور کسے بتاو ں گی۔“اسوہ کے لیے ان کے پر خلوص رویے کو پہچاننا مشکل نہیں تھا۔مزید گھنٹا ڈیڑھ وہیں گزار کر وہ ان سے اجازت لے کر واپس چل پڑی۔

☆☆☆

ارشد سے پانچ ماہ انتظار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔مہینے بھر بعد ہی وہ اپنے والد کو راضی کر کے اسوہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔اسے یہ بھی خوف لاحق تھا کہ کہیں اسوہ کی شادی نہ ہو جائے۔گو اسے والد نے تسلی دی تھی کہ وہ فرقان شاہ کی لالچی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہے وہ ان حالات میں کبھی بھی اسوہ کو بہو نہیں بنائے گا۔مگر ارشد تو اسوہ کے حسن سے واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مرد ذات کے لیے اسوہ کس قدر پر کشش تھی ۔سب سے بڑھ کر خود طاہر جواد بھی ایک بار ان ماں بیٹی سے مل لینا چاہتا تھا۔

نسرین بیگم انھیں گھر میں دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہو گئی تھی۔

"جی کیسے آنا ہوا؟" اسے مجبوراً پوچھنا پڑا تھا۔

"ہم کوٹھی خالی کرنے کی بابت پوچھنے آئے تھے۔" طاہر جواد نے مکاری سے گفتگو کا آغاز کیا۔

مگر اس کے لیے تو ہمارے پاس چھے ماہ کا وقت تو موجود ہے نا؟" نسرین کو چونکہ ساری تفصیل معلوم ہو گئی تھی اس لیے اس نے بغیر لگی لپٹی رکھے کہنا مناسب سمجھا۔

"ان چھے ماہ میں سے دو ماہ گزر چکے ہیں؟" طاہر جواد نے بات آگے بڑھائی۔

"تو تم یہی بتانے کے لیے تشریف لائے تھے؟" وہ کوشش کے باوجود اس کے لیے آپ کا لفظ منہ سے نہیں نکال سکی تھی۔

"نہیں، میں یہ بتانے آیا تھا کہ اس کوٹھی کے ساتھ یہاں موجود تمام اشیاء یہاں تک کہ گاڑیاں بھی سیٹھ صاحب مرحوم نے گروی رکھوائی تھیں، آپ معاہدے کے کاغذات اور اسٹام پیپر دیکھ سکتی ہیں؟" اس نے ہاتھ پکڑی فائل نسرین بیگم کی طرف۔ مگر نسرین بیگم نے فائل پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

اس کے ہاتھ سے فائل لے کر اسوہ طنزیہ لہجے میں پوچھنے لگی۔ "ان گروی اشیاء میں ہم بیٹی بھی شامل تو نہیں ہیں ۔"

"اگر آپ چاہیں تو ایسا ہونا ممکن ہے۔" موقع غنیمت جان کر ارشد نے اپنا مطمح نظر واضح کرنے لگا۔

"ویسے آپ کو تھانے میں گزری رات تو یاد ہو گی؟" اسوہ نے اسے غصیلی نظروں سے گھورا۔

"وہ وقت بھول جاؤ مس اسوہ اسلم شکور خان!.... اور تمھارے والد کو اسی کیے کی سزا تو بھگتنا پڑی ہے۔ اب اگر تم اس سزا سے بچنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔"

"میں تمھارے گندے تھوبڑے پر تھوکنا پسند کروں گی۔ اور بہتر ہو گا کہ تم ابھی یہاں سے دفع ہو جاؤ، اور چار ماہ بعد اگر ہم مطلوبہ رقم ادا نہ کر سکے تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ بس یا کچھ اور؟"

"لڑکی!.... جذبات سے کام لینے کے بجائے ہماری آفر پر غور کرو۔ یہ گھر اسی طرح تمھاری تحویل میں رہے گا، تمھاری امی بھی تمھارے ساتھ ہی رہے گی۔"

"کون سی آفر؟" اسوہ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھنے لگی۔

"میری بہو بن جاؤ، زندگی آسان ہو جاؤ گی۔"

وہ اطمینان سے بولی۔ "اس آسانی سے مشکل بدرجہا بہتر ہے۔"

"شاید تمھیں اندازہ نہیں کہ تم ماں بیٹی کتنی بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہو؟"

"مسٹر طاہر جواد!.... مصیبت میں ڈالنے والی اور مصیبت ٹالنے والی اللہ پاک ہی کی ذات بابرکات ہے۔ تم جیسے لوگ اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ "یقیناً تمھیں جیل جانا پسند نہیں ہو گا؟"

اسوہ نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ "کسی کی جرات کہ ہمیں بغیر کسی جرم کے جیل بھیج سکے؟"

”پرانے وقت کو بھول جاؤ بے بی!.... اب تم امرء اور شرفاء تو چھوڑو، سفید پوش طبقے میں بھی شامل نہیں رہیں۔ بلکہ اب تو تم کروڑوں کی مقروض بھی ہو۔ اسلم شکور خان نے پچیس تیس کروڑ روپیا لوگوں سے ایڈوانس کے سلسلے میں لیا ہوا ہے اور اس کے وارث آپ دونوں ہو، یقیناً اس ضمن میں لوگ تمھیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔“

اس کی بات سن کر ماں بیٹی گھبرا گئی تھیں لیکن جب اسوہ نے زبان کھولی تو اس کے لہجے میں اس گھبراہٹ کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا۔ ”جہاں اتنے نقصانات برداشت کیے ہیں وہاں یہ بھی گوارا کر لیں گے۔“

”آپ غلط کر رہی ہیں مس اسوہ!.... “ارشد جو اپنے والد اور اس کی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا اضطراب بھرے انداز میں بولا۔ ”ہمیں صلح کر لینا چاہیے۔ یقیناً میں آپ کو خوش رکھوں گا۔“

اس نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے شعر پڑھا....

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

”آپ پچھتائیں گی۔“ ارشد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اس کو راضی کرے۔ کہاں تو وہ اس کا سر جھکانے اور اسے نتائج سے ڈرانے آیا تھا۔ اور اب اس کی منت زاری پر شروع ہو گیا تھا۔

”پچھتاوں گی تو تب جب اپنے والد کے قاتل سے رشتا جوڑوں گی۔ اور مسٹر ارشد یاد رکھنا میری پسپائی کو شکست نہ سمجھنا، یہ بس تھوڑی سی مہلت کے حصول کے لیے ہے۔ میں تم باپ بیٹے کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یہ دولت تم اتنی آسانی سے ہضم نہیں کر سکو گے۔“

”یہ میرا تعارفی کارڈ ہے۔“ طاہر جواد نے جیب سے ایک خوب صورت کارڈ نکال کر اپنے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”جب بھی تم ماں بیٹی کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ تمھاری بھلائی ہم سے صلح کر لینے میں ہے مجھے کال کر لینا۔“ یہ کہہ کر وہ ارشد کو مخاطب ہوا۔ ”چلو بیٹے“!

ارشد، اسوہ کو امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر وہ بے پرواہی کے گہرے تاثرات لیے خاموش بیٹھی رہی۔ اگر وہ شاکی تھی تو اپنی تقدیر پر جس کی وجہ سے اسے یہ دن بھی دیکھنا پڑے تھے کہ ارشد جیسا تھرڈ کلاس انسان نہ صرف اسے دھمکا رہا تھا بلکہ پرپوز بھی کر رہا تھا۔

ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ اسوہ نے انھیں پکارا۔ ”بات سنو؟“

وہ امید بھرے انداز میں پیچھے مڑے۔

”آج کے بعد اگر تم دونوں میں سے کسی نے بھی چار ماہ سے پہلے یہاں آنے کی کوشش کی تو میں تم دونوں پر اکیلی عورتوں کو ہراساں کرنے کی ایف آئی آر کٹوا دوں گی۔“

ان دونوں کے مسکراتے چہروں پر نفرت بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔ طاہر جواد نخوت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اپنا یہ شوق بھی پورا کر لینا۔“

ان کے جاتے ہی نسرین نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ ”اب کیا ہو گا بیٹی“!

”کچھ بھی نہیں ہو گا ماں جی!.... اب ہم اتنی بھی بے دست و پا نہیں ہوئیں کہ پاپا کے قاتلوں سے صلح کرتی پھریں۔“

"میرا تو دل چاہ رہا تھا منہ نوچ لوں ان کمینوں کا؟" نسرین غصے سے بولی۔

"ماں جی یہ وقت وقت کی بات ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہ باپ بیٹا بھیک منگوں کی طرح میرے سامنے گڑ گڑاتے رہے ہیں۔ لیکن ان شاءاللہ میں ان سے کسی رعایت کی بھیک نہیں مانگوں گی۔" اسوہ ایک عزم سے بولی۔ اور نسرین سر ہلا کر بیٹی کی تائید کرنے لگی۔

☆☆☆

"پاپا!.... دیکھ لیا، رسی جل گئی پر بل نہیں نکلے؟" کار میں بیٹھتے ہی ارشد شکوہ کناں ہوا۔ اسوہ کو ہر طرف سے بے دست و پا کرنے کے بعد وہ اسے اپنی آغوش میں سمجھنے لگا تھا، مگر اسوہ کے رویے میں اسے سر مو فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ نہ تو اس نے ارشد یا اس کے والد سے کوئی رعایت مانگی تھی اور نہ وہ روئی گڑگڑائی تھی۔ ماں بیٹی کو جیسے دولت اور کوٹھی چھن جانے کا کوئی دکھ ہی نہیں ہوا تھا۔

"تھوڑا صبر کرو میں ان کے کس بل بھی نکال لیتا ہوں۔" طاہر جواد بھی ان کے رویے پر جلا بھنا ہوا تھا۔

"مجھے بھی بتاو نا پاپا!.... آپ کیا کریں گے؟"

"اسلم شکور کو ایڈوانس دینے والے سارا سارا دن اس کے دفتر کے سامنے ڈیرہ جمائے رکھتے ہیں، میں انھیں اس کوٹھی کی راہ دکھانے لگا ہوں۔ اور یقیناً یہ ماں بیٹی ان کے مطالبے کا سامنا نہیں کر پائیں گی۔"

"یہ ہوئی نہ بات۔" ارشد جوش سے بولا اور طاہر جواد مسکرانے لگا۔

☆☆☆

اگلے دن اسوہ پھر اسماء کے ہاں پہنچ گئی تھی۔انھیں تازہ صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا بھی انھی کے ساتھ کھایا اور پھر واپسی کی راہ لی۔ مگر اپنے گھر کے سامنے تیس چالیس افراد کا اکٹھ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

اس نے جونھی کار گیٹ کے سامنے روکی گیٹ کے سامنے اکٹھے ہوئے تمام لوگوں نے اس کی گاڑی کو گھیر لیا تھا

۔

"جی کیا بات ہے؟" اپنے جانب کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"ہمیں اپنی رقم واپس چاہیے بیگم صاحب!" کھڑکی کے سامنے جھک کر ایک شخص نے واویلا کیا۔

"کون سی رقم؟" وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

"وہی رقم جو آپ کے والد نے ہم سے پلاٹ بیچنے کے نام پر ایڈوانس میں ہتھیالی تھی۔" اس مرتبہ بھی جواب اسی ادھیڑ عمر شخص نے دیا تھا جو پہلی مرتبہ اسے مخاطب ہوا تھا۔

ایک دم اسوہ کو خطرے کا احساس ہوا وہ ان لوگوں میں پھنس گئی تھی جو اس کے والد کی طرح ارشد اور اس کے فراڈی باپ کا شکار بنے ہوئے تھے۔ اور اسی بارے تو انھیں طاہر جواد دھمکی دے گیا تھا۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ ادھیڑ عمر شخص اور اس کے ساتھ موجود ایک جوان سال آدمی نے پیچھے ہو کر دروازہ کھلنے کے لیے جگہ بنائی۔

باہر نکل کر وہ بولی۔ ”انکل !.... میں نہیں جانتی ابو جان نے آپ سے کتنی رقم لی تھی اور اس رقم کا کیا کیا۔ ابو جان اب نہیں رہے۔ ہم خود کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے ہیں۔ البتہ آپ چاہیں تو میں اس شخص تک آپ کی رہنمائی کر سکتی ہوں جو اس سب کا ذمہ دار ہے۔“

”کوڑی کوڑی کا محتاج ہو کر اس گاڑی میں گھوم رہی ہو ؟“ ایک جوان سال آدمی نے اس کی کار کی جانب اشارہ کیا۔

”دیکھیں آپ سب کو اصل بات کا علم نہیں .... میں آپ سب سے زیادہ اس فراڈ کا شکار ہوئی ہوں ؟“ اس کی آواز میں شامل دکھ کو پہچاننا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

”بیٹی !.... ہم سب غریب لوگ ہیں اور یقین کرو ہم نے پائی پائی کر کے جو رقم اکٹھی کی تھی وہ ساری آپ کے والد کے حوالے کر دی۔ اب اتنا بڑا نقصان ہم کیسے برداشت کریں گے ؟“ اس مرتبہ وہی ادھیڑ عمر آدمی بولا تھا جو سب سے پہلے اسے مخاطب ہوا تھا۔

”اچھا آپ کے علاوہ بھی تو لوگ ہوں گے جنھوں نے پلاٹس کی ایڈوانس بکنگ کروائی ہو گی ؟“

”ہاں بیٹی !.... اور بھی کافی ہیں۔“ ادھیڑ عمر شخص ہی باقی تمام کی نمائندگی کرنے لگ گیا تھا۔

”ٹھیک ہے، ایسا ہے کہ آپ تمام کل بارہ بجے یہیں آ جائیں، باقیوں کو بھی ساتھ لے آنا۔ تفصیل سے گفتگو ہو گی اور اس مسئلے کے حل کے بارے سوچیں گے۔“

”آپ ہمیں ٹال رہی ہیں ؟“ ایک سفید داڑھی والے بڑے میاں نے واویلا کیا۔

"نہیں چچا جان!.... یہ میری کوٹھی ہے اور میرا خیال ہے میں اسے اٹھا کر کہیں نہیں لے جا سکتی۔" اتنی دیر ان سے گفتگو کر کے اسوہ کے لہجے میں اعتماد در آیا تھا۔

"تو ابھی کیوں نہیں؟" اسی بڑے میاں نے اعتراض جڑا۔

"کیونکہ میں چاہتی ہوں اکٹھے ہی تمام سے بات کروں اور ہم مل کر اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں۔"

"بیگم صاحب ٹھیک کہہ رہی ہیں چچا!...." ادھیڑ عمر شخص نے اسوہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔"یوں بھی ایک دن کی بات ہے۔ایک دن میں یہ کہاں بھاگ جائے گی۔"

اس مرتبہ تمام سر ہلاتے ہوئے اس کی کار کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔وہ کار میں بیٹھ گئی۔چوکیدار سارا منظر دیکھ رہا تھا۔اور اس نے اپنی رائفل اضطراری حالت میں ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔لوگوں کے ایک طرف ہوتے ہی اس نے اسوہ کے لیے گیٹ کھول دیا۔اور وہ کار اندر لے گئی۔ڈرائینگ روم میں اس کی ماں پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھی اسے دیکھتے ہی وہ اٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم کیسے اندر آئیں، کیا تمام لوگ چلے گئے ہیں؟" اسے شاید چوکیدار نے لوگوں کے اکٹھ کے بارے بتایا تھا ۔لیکن نسرین بیگم باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

"چلے گئے ہیں ماں جی!.... میں نے انھیں کل پھر بلایا ہے؟"

"کیوں؟"

اسوہ اطمینان سے بولی۔"کیوں کہ اس کا کوئی حل بھی تو نکالنا ہے نا؟"

"حل....؟ مگر کیا حل نکالو گی؟" نسرین سخت پریشان نظر آ رہی تھی۔

"ماں جی!.... آپ پریشان نہ ہوں کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ اور ہم تو یوں بھی تہی دست ہیں، ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دنیا والے ہم سے اور کیا چھین سکتے ہیں؟"

"بیٹی!.... مجھے تو بس تمھاری فکر کھائے جا رہی ہے؟"

"کیوں ماں؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

نسرین نے دکھی ہوتے ہوئے کہا۔ "جوان بیٹی کی ماں سے پوچھ رہی ہو اسے کیوں فکر ہے۔"

"میں بیٹی نہیں، آپ کا بیٹا ہوں ماں جی!" اسوہ ماں سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"کاش ایسا ہی ہوتا۔" نسرین نے حسرت سے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا ماں جی!.... آپ کی بیٹی، بیٹا بن کر دکھائے گی۔"

"اللہ پاک میری گڑیا کی حفاظت کرے۔" نسرین نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"اچھا امی!.... میں ذرا ایک ضروری کال کر لوں؟" اسوہ سیل فون نکال کر انسپکٹر راحیل کو کال کرنے لگی۔

پہلی ہی گھنٹی پر کال رسیو کر لی گئی تھی۔ "اسلام علیکم بیگم صاحب!...." یقیناً اس کے پاس ابھی تک اسوہ کا نمبر سیو تھا۔

"انسپکٹر صاحب!.... مجھے پہچان تو لیا ہے نا؟"

"کیوں نہیں بیگم صاحب!.... آپ اسوہ اسلم شکور صاحب ہیں نا؟"

"جی بالکل.... آپ سے ایک ضروری کام تھا کیا آپ میرے گھر آسکتے ہیں؟"

"جی میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"میں منتظر ہوں۔" کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر اس نے انٹر کام پر چوکیدار کو انسپکٹر راحیل کے آنے کی بابت ہدایات دی اور ماسی تابندہ کو چاے وغیرہ کا بتانے لگی۔ نسرین بیگم اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

آدھ پون گھنٹا بعد ہی انسپکٹر راحیل وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ اس وقت وردی ہی میں تھا۔ اس نے آتے ہی اسوہ کو سیلوٹ کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں انسپکٹر صاحب!.... آئیں بیٹھیں۔" اسوہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔

"اس کی ضرورت کیوں نہیں ہے بیگم صاحب!" صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیونکہ اب آپ ایک سیٹھ زادی، نہیں لٹی پٹی لڑکی کے سامنے ہیں، جس کا باپ کسی کے فراڈ کی وجہ سے انتقال کر گیا اور جس سے اس کے رہنے کا ٹھکانہ بھی چھینا جا رہا ہے۔"

"میں تفصیل جاننا چاہوں گا؟" انسپکٹر راحیل نے حیرانی سے پوچھا۔ اور جواباً اسوہ نے ساری تفصیل اس کے سامنے دہرا دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں نمی ظاہر ہو گئی تھی۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی انسپکٹر راحیل اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "بیٹی!.... کاش میں آپ کو آپ کا حق واپس دلا سکتا۔"

اس کا مشفقانہ لہجہ سنتے ہی اسوہ کی آنکھیں بہنے لگ گئی تھیں۔ "چچا جان!.... میں جانتی ہوں آپ کے بس سے باہر ہے۔ یہ ایک منظم سازش تھی اور ابو جان کے وکیل تک کو اس میں شامل کیا گیا۔ ابو جان بھی جانے کیسے ان چاپلوسوں کے جھانسے میں آ گئے۔ بہ ہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب میں نے آپ کو کسی اور مقصد سے تکلیف دی تھی۔"

راحیل مسکرایا۔ "بیٹاں زحمت نہیں دیا کرتیں۔"

"اللہ پاک آپ کو اجر دے چچا جان!.... آپ نے میری ایک بہت بڑی غلط فہمی دور کی ورنہ میں آج تک یہی سمجھتی تھی کہ شاید پولیس والوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔"

اسی وقت ملازمانے ان کے سامنے چائے اور دوسرے لوازمات ان کے سامنے لا کر رکھ دیے تھے۔ اسوہ خود انسپکٹر راحیل کے لیے چائے بنانے لگی۔

انسپکٹر راحیل کہنے لگا۔ "بیٹی!.... ہماری مجبوریوں کی داستان بہت طویل ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ سارے پولیس والے مجبور اور بے بس ہوتے ہیں۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ ہمیشہ صاحبِ اقتدار طبقہ ہمیں استعمال کرتا رہا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق جس کے پاس اقتدار، اختیار اور تعلقات ہوں ہم ان کے خادم ہوتے ہیں اور جو پولیس والا اس بات سے انحراف کرنے کی کوشش کرے اس کی جگہ کم از کم پولیس کے محکمہ میں نہیں بنتی۔ ورنہ دل تو ہمارے سینہ میں بھی دھڑکتا ہے اور مختلف رشتوں کی زنجیر سے ہم بھی بندھے ہوتے ہیں۔"

"صحیح فرمایا چچا جان!....یہ ہر حال میں بتا یہ رہی تھی کہ ہم ایک نئی مصیبت میں پھنس گئے ہیں اور اسی سلسلے میں میں نے سوچا کہ آپ سے مشورہ کر لوں۔"

"بولو بیٹی!.... کیا مسئلہ ہے؟"

اس مرتبہ اسوہ نے ارشد اور اس کے والد کی آمد اور اس کے بعد تھوڑی دیر پہلے اکٹھے ہونے والے لوگوں کے متعلق ساری تفصیل دہرا دی۔

"ہونہہ!...." کہہ کر انسپکٹر راحیل گہری سوچ میں کھو گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ گویا ہوا۔

"بیٹی!....یقیناً یہ طاہر جواد کا اوچھا وار ہے، مگر وہ بے وقوف اس طرح خود پھنس رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟" اسوہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ یوں کہ اس پراجیکٹ میں وہ بھی سیٹھ مرحوم کا حصہ دار تھا۔ اور اب یہ گھر بھی اس نے آپ لوگوں سے ہتھیایا ہوا ہے تو نقصان کا خطرہ اسے ہونا چاہیے نہ کہ آپ لوگوں کو۔"

"میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔" اسوہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

"دیکھو بہ قول آپ کے یہ گھر، گاڑیاں اور گھر کا سارا سامان آپ کے والد نے گروی رکھ دیا تھا۔"

"جی چچا جان!" اسوہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو ٹھیک ہے۔ ایسے کرو کل جیسے ہی لوگ پہنچتے ہیں آپ مسٹر طاہر جواد کو بھی کال کر کے ضروری کام کے بہانے بلوا لیں اور پھر اس کے پہنچتے ہی لوگوں کو کہہ دیں کہ یہ ہے اصل مجرم۔ اگر یہ رقم لوٹانے سے انکار کرتا

ہے تو تم اسے دھمکی دو کہ تمام لوگ اس پر مقدمہ کریں گے اور سب سے ضروری بات یہ کہ چار پانچ جو شیلے جوانوں کو پہلے سے تیار کر لینا کہ وہ طاہر جواد کو اور اس کے بیٹے کو قتل کرنے کی دھمکی دیں ایسے لوگ بہت بزدل ہوتے ہیں جان کے خوف سے شاید وہ لوگوں کی لوٹی ہوئی رقم واپس کرنے پر تیار ہو جائے۔"

"شکریہ چچا جان!....ویسے کیا میں ان باپ بیٹے پر مقدما نہیں کر سکتی؟"

"مقدما تو کر سکتی ہو مگر جیتنا مشکل ہو جائے گا بیٹی!.... آج کل جج اور وکیل خریدنا بالکل مشکل نہیں ہے۔ اور آپ کے پاس تو اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے شاید اتنی رقم بھی نہیں ہو گی کہ کوئی اچھا وکیل ہی کر سکو۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چچا جان!" اسوہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "گو میں وکیل تو ہائر کر لوں گی مگر ان فراڈیوں کا مقابلہ کرنا یقیناً میرے بس سے باہر ہو گا۔ خیر اللہ پاک کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔"

"اچھا کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو سب سے پہلے اپنے چچا کو یاد کر لینا۔" انسپکٹر راحیل جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چچا جان!.... میں آپ کی محبت اور شفقت کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"یہی تو خوبی ہوتی ہے بیٹیوں میں۔" انسپکٹر راحیل نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں اور کل میں بھی بارہ بجے تک آجاؤں گا، چند باوردی پولیس والے بھی ساتھ ہوں گے آپ بالکل فکر نہ کرنا۔"

"شکریہ چچا جان"....!

"اپنے چچا کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔" انسپکٹر راحیل اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈرائینگ روم سے نکل آیا۔ اپنی زندگی میں اس نے بہت اتار چڑھاو دیکھے تھے، لیکن اسوہ پر کچھ زیادہ ہی بڑی افتاد آن پڑی تھی۔ کوٹھی سے باہر نکلتے وقت اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔ اس نے دو تین سال پہلے والی اسوہ کا طنطنہ، فخر اور غرور بھی دیکھا تھا وہی اسوہ آج اسے ایک بے بس اور مجبور لڑکی کی شکل میں نظر آئی تھی۔ ایسی لٹی پٹی لڑکی جس سے نہ صرف اس کا سہارا چھین لیا گیا تھا بلکہ وہ بے گھر بھی ہونے والی تھی۔

اسوہ کے والد اسلم شکور نے اسے کئی بار انعامات سے نوازا تھا خود اسوہ بھی اسے انعام میں ایک قیمتی کار دے چکی تھی۔ وہ دنیا دار تو تھا لیکن اتنا زیادہ احسان فراموش نہیں تھا کہ باپ بیٹی کے احسانات کو یکسر فراموش کر دیتا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس سے جتنا ہو سکا وہ اسوہ اور اس کی ماں مدد کرے گا۔ یہ اور بات کہ وہ بس انھیں تسلی و تشفی ہی دے سکتا تھا۔ کسی بڑی مچھلی پر ہاتھ ڈالنا اس کے بس سے باہر تھا۔

"برخوردار!.... اب مزید کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟" صبح ناشتے کی میز پر بشیر احمد نے عمار سے پوچھا۔

"کیسا انتظار ابو جان؟"

بیٹا! تم تیس سالوں کے ہونے والے ہو اور اصولاً آج سے پانچ سال پہلے تمھیں شادی کر لینا چاہیے تھی۔"

"ویسے بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔" عمار نے توس پر جیم لگاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"ویسے مجھے تم سے اس سمجھ داری کی توقع تو خیر نہیں تھی۔ اب غلطی سے تم نے اعتراف کر ہی لیا ہے تو بتاو اس غلطی کو کب تک سدھار رہے ہو؟"

"غلطی ماننے کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کا ازالہ بھی کرنا چاہتا ہوں؟"

اسی وقت اس کی ماں سکینہ بیگم چائے کی کیتلی کے ساتھ نمودار ہوئی۔

"یہ لیں جی گرما گرم چائے۔" وہ بشیر احمد کے سامنے پڑے کپ میں چائے ڈالنے لگی۔ گو گھر کے کام کاج کے لیے انھوں نے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی مگر باورچی خانے کا کام سکینہ بیگم کو اپنے ہاتھوں سے کرنا پسند تھا۔ یوں بھی باپ بیٹا اس کے علاوہ کسی کے ہاتھوں کا بنا کھانے پر راضی نہیں تھے۔

"ویسے بیگم صاحبہ!.... تم نے اپنے بیٹے کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔" چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بشیر احمد بیوی کو مخاطب ہوا۔

"میں نے یا آپ نے؟" سکینہ نے اچنبھے سے پوچھا۔

"بھئی بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈنا باپ کا کام ہوتا ہے یا ماں کا؟"

وہ افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "تو اپنے لاڈلے کو تو راضی کر لو۔"

"ماں جی!.... میری ضروری میٹنگ ہے میں چائے دفتر ہی میں پی لوں گا۔" عمار چائے کی پیالی کو ہاتھ لگائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

"جانتا ہوں برخوردار!" بشیر منہ بناتے ہوئے چائے کا سپ لینے لگا جبکہ سکینہ بیگم دکھ بھری نظروں سے بیٹے کا جائزہ لینے لگی جو شادی کے ذکر پر ہمیشہ بھاگ جایا کرتا تھا۔

☆☆☆

دس بجے ہی سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسوہ کے حکم پر چوکیدار آنے والوں کو داخل ہونے کی اجازت دیتا گیا۔ آنے والے کوٹھی کے خوب صورت گراسی لان میں بیٹھتے گئے تھے۔ بارہ بجے تک اسی، نوے کے قریب افراد جمع ہو گئے تھے۔ گیارہ بجے انسپکٹر راحیل بھی پانچ باوردی سپاہیوں کے ہمراہ پہنچ گیا تھا۔ دو سپاہیوں کو چوکیدار کے ساتھ گیٹ پر کھڑا کر کے اس نے باقی سپاہی اندرونی عمارت کے لکڑی کے خوب صورت منقش دروازے کے سامنے کھڑے کر دیے تھے۔ خود وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہو گیا۔ اسوہ اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گئی۔

"اسلام علیکم چچا جان!" انسپکٹر راحیل کو لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی اسوہ ہے جو کبھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی ۔ لیکن اس کے ساتھ تو باپ بیٹی نے ہمیشہ اچھائیاں ہی کی تھیں اس وجہ سے اسے ان سے کوئی گلہ بھی نہیں تھا۔

"وعلیکم سلام بیٹی!" اس نے آگے بڑھ کر اسوہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نسرین بیگم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا ۔

"باجی!.... آپ ٹھیک ہیں۔"

"جی بھائی!" نسرین نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے ماں بیٹی کے سامنے ہی نشست سنبھال لی۔

"چائے یا ٹھنڈا....؟" اسوہ نے پوچھا۔

"چائے ٹھیک رہے گی۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔ اور اسوہ ملازما کو چائے کا بتانے لگی۔

"اب کیا کریں؟" چائے کا بتا کر وہ انسپکٹر راحیل سے مستفسر ہوئی۔

"ایسا کرو کہ ان لوگوں کے سامنے تمام صورت حال رکھ دو۔ اور انھیں اصل سرغنے کا بھی بتا دو۔ اس کے بعد اس فراڈی کو بلا کر اس کا چہرہ بھی سب کو دکھا دینا۔ پھر یہ لوگ جانیں اور ان کا کام۔ اس کے بعد آپ یہ کوٹھی چھوڑ کر میرے ہاں منتقل ہو جائیں۔"

"چچا جان!.... ہم مستقل تو آپ کے پاس نہیں رہ سکتے نا؟" اسوہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ نسرین کی آنکھیں بھی کوٹھی چھوڑنے کے خیال سے نم ہو گئی تھیں۔"

"بیٹی یہ کوٹھی تو آپ کو چھوڑنا پڑے گی، آج نہیں تو کل۔ یقیناً انھوں نے پکا کام کیا ہو گا اور عدالتی کارروائی کے ساتھ وہ آپ دونوں پر غیر قانونی دباؤ بھی ڈالیں گے۔ دو اکیلی عورتیں ان غنڈوں کا مقابلہ بھلا کہاں کر سکتی ہیں؟ میں بھی مستقل بنیادوں پر آپ کو محافظ مہیا نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑھ کر یہ جو باہر عوام جمع ہے یہ سچ جاننے کے بعد بھی آپ کا جینا حرام کیے رکھے گی روزانہ ان میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی کوٹھی پر حاضری لگوانے پہنچ جایا کرے گا۔ اس لیے مناسب تو یہی ہے کہ آپ جتنا جلدی یہ کوٹھی خالی کر دیں اتنا بہتر ہے۔" انسپکٹر راحیل کی بات نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی۔

"بھائی!.... کیا آپ ہمارے لیے کوئی چھوٹا سا مکان تلاش کر سکتے ہیں، بیس پچیس لاکھ تک کے زیورات ہمارے پاس موجود ہیں۔ کم از کم سر چھپانے کا ٹھکانہ ہی مل جائے، کرائے کے مکان تو آپ کو معلوم ہے مناسب نہیں ہوتے۔"

"بالکل تلاش کر لوں گا۔ اور اس طرح آپ کی چوکیدار اور ملازما وغیرہ کے فالتو خرچ بھی جان چھوٹے گی۔"

"اچھا یہ تو مشورہ بعد میں خر لیں گے چچا جان!.... میرا خیال ہے لوگوں سے بات چیت کر لی جائے۔" اسوہ نے دیوار سے ٹنگی گھڑی پر نگاہ دوڑائی جو بارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔

"ہاں کیوں۔" چائے کی خالی پیالی تپائی پر رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

ڈرائینگ روم سے نکل کر لان میں آ گئے تھے۔ کچھ لوگ کھڑے تھے جبکہ زیادہ تر نے سرسبز گھاس پر بیٹھنے پر ترجیح دی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی بیٹھنے والے بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ یوں بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا درکار ہوتا ہے۔ اپنی عمر بھر کی کمائی کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر ان غریبوں کو کچھ سجائی نہیں دے رہا تھا۔

"آپ تمام لوگ بیٹھ جائیں۔" انسپکٹر راحیل نے ہاتھ سے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سیٹھ اسلم شکور صاحب مرحوم کی بیٹی آپ کو اصل بات بتائیں گی۔"

تمام چہ میگوئیاں کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔

انسپکٹر راحیل کی موجودی میں اسوہ کی ڈھارس بندھی ہوئی تھی ورنہ وہ اتنے لوگوں کا سامنا نہ کر پاتی۔ تمام کے بیٹھتے ہی اس نے چند لمحے الفاظ کو ذہن میں ترتیب دیا اور پھر گویا ہوئی۔

"میں جانتی ہوں آپ لوگوں کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے اور فراڈ کرنے والوں کا مقصد آپ کی محدود کمائی لوٹنا نہیں، بلکہ میرے پاپا اسلم شکور کو کنگال کرنا تھا۔ اور ان کی سازش کامیاب ہو گئی۔ میرے والد صاحب مرحوم ان کی مکاری، چالاکی اور فراڈ کو نہ پہچان سکے۔ ان دھوکے بازوں جھانسے میں آ کر اپنی عمر بھر کی کمائی لٹا بیٹھے"....

"میڈم!.... آپ کی تقریر ہمارے پلے نہیں پڑ رہی۔ یہ وسیع و عریض کوٹھی، گیراج میں کھڑی چار قیمتی کاریں آپ کا لباس آپ کی باتوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔" ایک ادھیڑ عمر شخص نے قطع کلامی کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"کیا آپ نے ہمیں یہی رام کہانی سنانے کے لیے اکٹھا کیا تھا؟" ایک دوسرے جوان آدمی نے استہزئی لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگوں کے سامنے میرے پاپا کی بے گناہی واضح ہو۔ دوسرا میں اصل شخص کی طرف آپ لوگوں کی رہنمائی بھی کرنا چاہتی ہوں جو آپ لوگوں سے زیادہ میرا مجرم ہے۔"

"آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔

"میرے پاس دلیل یہ ہے کہ یہ کوٹھی جس میں آپ کھڑے ہو مکمل سازوسامان کے ساتھ اور یہ چاروں قیمتی کاریں جو آپ لوگوں کو نظر آرہی ہیں یہ گروی رکھی ہوئی ہیں۔ ان کاروں کے کاغذات بھی پاپا ان کے حوالے کر گئے ہیں۔"

"ہمیں کیسے یقین آئے کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔" ایک اور آدمی نے شک ظاہر کیا اور باقی تمام بھی سر ہلانے لگے۔

وہ اعتماد سے بولی۔ "آپ لوگ بے شک ان چاروں کاروں کو آگ لگا دیں یا کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"آپ اصل مجرم کی طرف رہنمائی کرنے والی تھیں۔" حاضرین میں سے ایک نئی آواز بلند ہوئی۔

"بالکل۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "میں اسے آپ لوگوں کے سامنے فون کروں گی۔ وہ نہایت چاپلوس اور دوغلا آدمی ہے۔ اس لیے آپ لوگوں کو اس سے نمٹنے کے لیے تھوڑی سمجھ داری سے کام لینا ہو گا۔ اس کے ساتھ آپ میں سے چند جوانوں کو اسے دھمکی بھی دینا ہو گی کہ اگر اس نے آپ لوگوں کی رقم نہ لوٹائی تو آپ اسے اور اس کے بیٹے کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

"وہ تو خیر ہم سچ مچ کریں گے۔" ایک بپھرے ہو جوان نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں اسے کال کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور طاہر جواد کا کارڈ پر درج کیا ہوا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ہیلو!" اس نے کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اسوہ نے تمام کو سنانے کے لیے موبائل کا سپیکر آن کر دیا تھا۔

"میں اسوہ اسلم شکور بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں جی مس اسوہ!.... تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"کیا تم ارشد کے ہم راہ اسی وقت یہاں آسکتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟" وہ دبے دبے جوش سے بولا۔

"آ جائیں میں منتظر ہوں؟" اس نے رابطہ منقطع کر کے تمام کو کہا۔ "اسے یہاں تک آنے میں تھوڑی دیر لگے گی۔"

انسپکٹر راحیل نے چار پانچ جوانوں کو تیار کر کے گیٹ پر بھیج دیا کہ جونھی وہ کار اندر لے کر آئیں، انھیں واپس نہ مڑنے دیا جائے۔ پولیس والوں کو اس نے جان بوجھ کر اس معاملے سے علاحدہ رکھا تھا۔ کیوں کہ نہ تو اس کے پاس طاہر جواد کو روکنے کا اختیار تھا اور نہ وہ اس بے وقوفی کا مرتکب ہونا چاہتا تھا۔

انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ طاہر جواد نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ باپ بیٹا دونوں اکٹھے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔

کوٹھی کے اندر کار لانے کے بعد ان کی نظر وہاں جمع ہوئے ہجوم پر پڑی تھی۔ مگر واپسی کا رستا بند ہو چکا تھا ۔ گیٹ کو بند کر کے چار جوان گیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔

"کوئی گڑبڑ لگتی ہے؟" طاہر جواد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"یہ ڈھیٹ لڑکی نہیں سدھرنے والی۔" ارشد کے چہرے پر بھی غم و غصے کے آثار پھیلتے چلے گئے۔

"پولیس کے سپاہی بھی نظر آ رہے ہیں، اس کا مطلب ہے کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ چلو دیکھتے ہیں ؟" چہرے سے پریشانی کے تاثرات جھٹکتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگا۔ ارشد نے اس کی تقلید کی۔

"یہ کیا ڈراما ہے انسپکٹر صاحب!" ان کے قریب پہنچتے ہی طاہر نے مزاحیہ انداز اپنایا۔

"ڈراما نہیں حقیقت ہے مسٹر طاہر!" اسوہ، انسپکٹر راحیل کی موجودی میں کافی حوصلہ محسوس کر رہی تھی۔

"بڑوں کو مخاطب کرنے کی تمیز تو سیکھ لو؟" طاہر نے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

"الفاظ اور لہجہ سامنے والے کی شخصیت اور کردار کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔"

"مجھے کیوں بلایا؟" طاہر جواد نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اسوہ نے کہا۔ "یقیناً تم جانتے ہو۔"

"اگر جانتا تو پوچھنے کی زحمت نہ کرتا۔" طاہر جواد نے منہ بنایا۔

"یہ تمام لوگ ایڈوانس رقم ادا کر چکے ہیں اور اب انھیں پلاٹ یا ایڈوانس کی رقم واپس چاہیے؟"

اس نے بے پرواہی سے کہا۔ "جس کو دی تھی اس سے یا اس کے ورثا سے مانگیں۔"

"ان سے تو سب کچھ ہتھیا لیا گیا ہے۔" اسوہ زہر خند لہجے میں بولی تھی۔

"تو میرا قصور؟.... اور وہ بچے بھی نہیں تھے کہ کسی کے جھانسے میں آ گئے۔"

"تم اس کے ساتھ حصہ دار تھے۔"

"صرف پانس فیصد حصے کا؟.... باقی جہاں تک فراڈ کا تعلق ہے تو اس کا نشانہ ہم بھی بنے ہیں، تمھارے والد کا حصہ زیادہ تھا اسے نقصان بھی زیادہ پہنچا میرا حصہ کم تھا، مجھے کم نقصان پہنچا۔ اور یہ تو تمھیں معلوم ہو گا کہ سارا پیسا وہ لوگ لے گئے ہیں جنھوں نے ہم پر دھوکے سے زمین بیچی۔"

اسوہ اس بارے کافی معلومات حاصل کر چکی تھی وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ "تمھارا ایک اور ساتھی 35 فیصد کا حصہ دار تھا۔ باقی زمین خریدنے کے بعد جب تم لوگوں نے ان غریبوں سے ایڈوانس کی رقم لینا شروع کی وہ کہاں گئی ؟ اور یہ گھر بھی تو ابو جان نے بعد میں گروی رکھا تھا اس رقم کا کیا بنا؟"

طاہر نے اطمینان سے کہا۔ "یہ تمھارے والد مرحوم کو علم ہو گا؟"

"میں نے آپ لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ اس فراڈ کے اصل مجرم کو آپ لوگوں کے سامنے بے نقاب کروں گی ۔"اس مرتبہ اسوہ وہاں اکھٹے ہوئے لوگوں کو مخاطب ہوئی۔"اور وعدے کے مطابق میں نے اسے آپ لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔یہ کوٹھی بھی اب اس کی ہے یہ کاریں بھی اس کی ملکیت ہیں۔میں ایک دو روز میں اپنی امی کے ساتھ یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو جاو□ں گی۔بہت زیادہ نقصان اٹھانے کے باوجود میں اپنے مرحوم پاپا کی طرف سے معذرت چاہتی ہوں....اور درخواست کرتی ہوں کہ انھیں معاف کر دیں۔وہ دھوکے باز نہیں تھے۔وہ بے چارے خود دھوکے کا شکار ہوئے۔اب میرے پاس نہ اتنی رقم ہے کہ میں اس فراڈیئے کو عدالت میں گھسیٹ سکوں اور نہ اور کوئی وسائل ہیں کہ انصاف حاصل کر سکوں۔اب آپ جانیں اور آپ کا مجرم۔"اس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی ابھر آئی تھی۔تقدیر نے اسے یہ دن بھی دکھا دیا تھا کہ وہ غریب غربا لوگوں کے سامنے صفائیاں دیتی پھر رہی تھی۔یقیناً اسے اپنے غرور و تکبر کا صلہ مل رہا تھا۔

"یہ بالکل جھوٹ بول رہی ہے اور سراسر بکواس کر رہی ہے۔اپنے والد کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹ موٹ ٹسوے بہا رہی ہے۔"طاہر با آواز بلند بولا تھا۔

مجمع میں سے ایک شخص بولا۔"آپ بھی اسلم شکور صاحب کے ساتھی ہیں اور میں نے آپ کو وہاں دفتر میں دیکھا تھا۔"

"ہاں مگر آپ لوگوں کے پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔" طاہر جواد نے گڑبڑا کر جواب دیا تھا۔

"اس کا حصہ دار ہونے کے باوجود اگر آپ ذمہ دار نہیں ہیں تو یہ لٹی پٹی لڑکی کیسے جواب دہ ہو گئی جسے شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کا والد کیا کاروبار کر رہا ہے؟" ایک بڑے میاں نے صورت حال کا تجزیہ کیا۔

"دیکھیں، میرا حصہ پانچ فیصد تھا اور اس کی ادائی کے لیے میں تیار ہوں۔ آپ لوگ جس وقت چاہو وہ رقم مجھ سے لے لو؟"

ایک نوجوان جوشیلے لہجے میں بولا۔ "ہمیں پانچ فیصد نہیں مکمل رقم چاہیے۔ ورنہ میں تمھیں اور تمھارے بیٹے کو قتل کر دوں گا۔"

"دیکھیں ایسی باتیں نہ کریں، آپ مجھے دھمکی نہیں دے سکتے۔" طاہر جواد گھبرا گیا تھا۔ ارشد بھی ہراساں نظر آرہا تھا۔ وہ آئے تو اپنی جیت کا تماشا دیکھنے تھے مگر یہاں ان کا اپنا تماشا بن گیا تھا۔

"صرف یہ نہیں، ہم بھی اس کے ساتھ ہیں۔ ہم مقدما وغیرہ کوئی نہیں کرنے والے، نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ ہم سے اگر عمر بھر کی کمائی لوٹ لی گئی تو ہم بھی لوٹنے والوں کو چین سے نہیں رہنے دیں گے۔" ایک اور جوان نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ یقین کریں مجھے پہلے ہی بہت نقصان ہوا ہے؟" طاہر نے یوں ظاہر کیا گویا وہ خود بھی کافی نقصان اٹھا چکا ہو۔

"ویسے آپ بتا سکتے ہیں کہ ابھی آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" یہ سوال تھری پیس سوٹ پہنے ایک شخص نے کیا تھا۔ جو شکل وصورت سے اتنا غریب دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"مجھے اس نے بلایا تھا؟" اس نے اسوہ کی طرف اشارہ کیا۔

"تو آپ نے پوچھا نہیں تھا کہ یہ کس لیے بلا رہی ہے؟" مسئول نے سوال جاری رکھے۔

"وہ....میں...." کہہ کر طاہر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

"جی....جی بتائیں۔" اسے خاموش ہوتا دیکھ کر اس نے دوبارہ پوچھا۔ "آخر آپ کے آنے کی کوئی وجہ تو ہو گی؟....ہمارے سامنے اس نے فون کیا کہ کیا آپ یہاں آ سکتے ہیں؟ اور آپ دوڑتے چلے آئے، بغیر کوئی سوال پوچھے بغیر کوئی حجت کیے....کیوں؟....یقیناً آپ کی کوئی غرض اٹکی ہے اس سے۔ یہ ہمارے سامنے آپ سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے اور یہ نفرت یہ پہلے بھی کرتی ہو گی تو ایسی بد تمیز لڑکی سے جسے بڑوں سے بولنے کی تمیز ہی نہیں اس کے ایک بار کہنے پر آپ یہاں کیوں بھاگے چلے آئے؟"

"اس کا باپ تو میرا دوست تھا نا؟" طاہر نے جلدی سے بات سنبھالی۔ "اسی وجہ سے میں اس کی بدتمیزی کو نظر انداز کر کے آ گیا۔"

"اس کا مطلب آپ اپنے دوست کی خاطر انھیں اس کوٹھی سے بے دخل نہیں کریں گے؟"

"یہ کوٹھی میں نے تو نہیں خریدی، یہ تو کسی اور نے خریدی ہے؟"

"آپ صرف خالی کرانے کی کوشش کر رہے ہو، ہے نا؟ اور مجھے یقین ہے اس وقت بھی آپ اسی وجہ سے بھاگے چلے آئے۔"

"بھائی جان!.... یہ بات نہیں ہے۔" اسوہ اس سوٹ والے کو مخاطب ہوئی۔ "پرسوں یہ دونوں باپ بیٹا یہاں مجھے اور امی کو دھمکانے آئے تھے کہ اگر میں نے اس کے بیٹے سے شادی نہ کی تو یہ میرا جینا اجیرن کر دیں گے۔ اس گھر کی راہ بھی آپ لوگوں کو اسی کی ایما پر اس کے کسی بندے نے دکھائی ہو گی تاکہ مجھے ڈرا دھمکا سکیں۔ اب آپ خود انصاف کریں، جس شخص کی وجہ سے میرا والد مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہو، میرا گھر بار مجھ سے چھن گیا ہو اور میں خود کوڑی کوڑی کی محتاج ہو گئی ہوں کیا میں اس کے بیٹے کے ساتھ شادی کر سکتی ہوں؟"

اس نے شستہ لہجے میں جواب دیا۔ "بہن!.... ہمیں پہلے بھی پتا تھا کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ میں خود ایک وکیل ہوں، یہاں میں اپنے غریب چچا کی مدد کے لیے آیا تھا کہ وہ بھی اپنے پیسے ایڈوانس کی مد میں پھنسا بیٹھا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں تیسرے حصہ دار کو مل کر آپ لوگوں کے مسئلے کے بارے میں سوچتا ہوں۔" طاہر نے وقتی طور پر ہجوم سے جان چھڑانا چاہی۔

"آپ ابھی بے شک چلے جائیں، لیکن یاد رکھنا اگر ایک ہفتے کے اندر اندر آپ نے ہماری رقم واپس کرنے کا بندوبست نہ کیا.... تو ہم تو ڈوبے ہیں صنم والا کام ہو گا۔" جوشیلے نوجوان نے اپنے ہاتھ کو چھری تصور کرتے ہوئے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی بات کا جواب دیے بغیر وہ واپس جانے کے ارادے سے مڑا۔

"اور بات سنیں؟...." اسوہ نے اسے آواز دی۔ وہ رک کر استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

اسوہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "کل ہم یہ کوٹھی خالی کر رہے ہیں اور یاد رکھنا تمھارے شہدے بیٹے کے ساتھ محل میں رہنے کے بجائے میں کسی خانہ بدوش کے ساتھ اس کے جھونپڑے میں رہنے کو ترجیح دوں گی۔"

اس مرتبہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر باپ بیٹا کار کی طرف بڑھ گئے تھے۔

اسوہ بھی باقیوں سے اجازت مانگ کر اندر چلی گئی۔ جبکہ انسپکٹر راحیل ان تمام کو رخصت کرنے لگا۔ اپنی نگرانی میں گیٹ بند کرا کر وہ بھی اندر چلا گیا۔ اسوہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹی!.... میں چلتا ہوں؟" اس نے جانے کی اجازت مانگی۔

"شکریہ چچا جان!.... ہم بس کل یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے اگر آپ کل تک کوئی کرایے کا مکان دیکھ لیں تاکہ اپنا گھر خریدنے تک ہم وہاں رہ سکیں۔"

"اب اتنا تکلف بھی اچھا نہیں ہوتا۔ جب تک مکان خریدا نہیں جاتا آپ دونوں میرے گھر رہ سکتی ہیں۔"

"میرا تو خیال ہے چچا جان!.... جب تک ہم مکان خرید نہیں لیتے ہمیں یہ گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے یونہی کرلینا۔" راحیل نے متفق ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اسوہ کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر وہاں سے نکل آیا۔ جبکہ اسوہ، اسماء کے گھر جانے کی نیت لیے ماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تاکہ ان سے وہاں جانے کی اجازت مانگ سکے۔

☆☆☆

"اتنا جلدی ضرورت کیا ہے گھر خالی کرنے کی؟" اس کی ساری کہانی سنتے ہی اسماء نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"تو کیا کریں؟" اسوہ نے دکھی ہو کر کہا۔ "کس امید پر یہاں ٹکے رہیں۔ وہ گھٹیا باپ بیٹا نت نئے طریقے سوچ رہے ہیں ہمیں تنگ کرنے کے اور پھر ہمیں کہیں سے اتنی رقم ملنے کی بھی امید نہیں ہے نا۔ سب سے بڑھ کر جو جمع پونجی ہے اگر وہ ہم نے ایسے ہی اڑادی تو اپنے لیے کوئی گھر وغیرہ کیسے خریدیں گے۔ یہاں تو ہمیں چوکیدار اور ماسی کی تنخواہ بھی دینا پڑتی ہے۔ بجلی، گیس وغیرہ کے بل بھی چھوٹے گھر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ادا کرنا پڑتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر آخر کب تک ہم پرانی زندگی کو چمٹے رہیں گے۔ اب ہم امرا سے عوام کی صف میں آ گئے ہیں اسماء بہن اور ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔"

"بڑی سمجھ دار ہو گئی ہے میری بہن تو؟" اسماء نے مزاحیہ انداز اپنا کر اسوہ کو دکھی ماحول سے نکالنا چاہا۔

"وقت سمجھ دار کر دیتا ہے اسما!.... ورنہ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ باورچی خانے کا خرچ کیا ہوتا ہے اور بجلی گیس کا بل کس چڑیا کا نام ہے، پٹرول کیا بھاؤ ہے اور ملازمین کی تنخواہیں کیسے ادا کی جاتی ہیں۔ ابھی تک تو ہم نے کپڑے جوتے اور میک اپ وغیرہ کا سامان نہیں خریدا۔ پاپا کیا گئے کہ سب مسائل نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ اور اس کی ذمہ دار میں خود ہوں۔ اگر میں حوصلے سے کام لیتی، ارشد کے خلاف یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو شکایت کر

دیتی تو یقیناً یہ مسئلہ حل ہو جاتا اور یہ مجرم ٹولہ بھی پاپا کے خلاف یہ ساری سازش تیار نہ کرتا۔ اسی طرح اگر میں عمار کے خلاف بھی وہ کارروائی نہ کرتی تو شاید آج وہ میرا ہوتا۔ اور زندگی کتنی حسین ہوتی۔" اسوہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"صرف دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔" اسماء نے اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے پیار بھرے انداز میں تسلی دی ۔" دیکھو ہمارے پاس بھی تو کوٹھی، کار اور بے تحاشا دولت نہیں ہے لیکن الحمد للہ ہم بہت خوش ہیں۔ دو وقت کھانے کو مل رہا ہے، پہننے کے کپڑے اور جوتے موجود ہیں اور یہی تو ضروریات زندگی ہوتی ہیں۔ بلکہ اب تو مدثر کی ترقی ہو گئی ہے امید ہے چند ماہ کے اندر ہی ہم اپنا ذاتی مکان بھی خرید لیں گے اور کرائے کے مکان سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔"

"آپ لوگ قناعت سے واقف ہیں اور ہمارے لیے صبر و شکر ایک نئی چیز ہے۔ ورنہ تو سارا دن مزدوری کر کے فٹ پاتھ پر سونے والے محنت کش کی بھی ضروریات تو پوری ہو رہی ہوتی ہیں۔ در در ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے کی بھی ضروریات ادھوری نہیں رہتیں اور یہی حقیقت ہے کہ ہر طبقہ کی ضروریات زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ ہمیں آپ کی طرح صابر و شاکر بننے کے لیے کچھ وقت لگے گا۔ اس ماحول میں ڈھلنے کے لیے بہت محنت کرنا ہو گی تبھی اس قابل بنوں گی کہ یہ پہاڑ سی زندگی گزار سکوں۔ یقین مانو ابھی تو مجھے چائے بنانا نہیں آتی ۔ برتن دھونے تو کجا کبھی خالی پیالی ہی نہیں دھوئی۔ یہ شکر ہے کہ ہمارے ہاتھ پاو ں بدن کا حصہ ہیں ورنہ اگر یہ علاحدہ کیے جاسکتے تو ضرور انھیں دھونے کی ذمہ داری بھی ملازموں کے ذمہ ہی ہوتی۔"

اس کا آخری فقرہ سن کر اسماء قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ اسوہ کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی

۔

"کس بات پر قہقہے لگائے جارہے ہیں بیگم صاحبہ!" مدثر اچانک اندر داخل ہوا۔ وہ اس وقت دفتر سے لوٹا تھا ۔"اور میری اسوہ بہن!.... کیسی ہے؟" اس نے ایک ہی فقرے میں دونوں کو بھگتا دیا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں مدثر بھائی!....ویسے آپ دفتر سے کافی لیٹ پہنچ رہے ہیں؟"

"کبھی کبھی شام بھی ہو جاتی ہے بہنا!.... آج تو پھر بھی جلدی پہنچا ہوں۔ ویسے بھی پرائی نوکری پابندی کا دوسرا نام ہے۔ جو باس کا حکم ہو بجالانا پڑتا ہے۔"

"صحیح کہا۔" اُسوہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور آپ سنائیں کوئی نئی تازی؟" اس نے بھی وہیں نشست سنبھال لی تھی۔

اسوہ ہنسی۔ "میں سناچکی ہوں جو سنانا تھا تفصیل آپ اسماء سے پوچھ لینا۔"

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے، آپ اپنی گفتگو جاری رکھیں میں ذرا تازہ ہو جاو□ ں۔" وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

"اچھا اب مستقبل کا کیا پروگرام ہے؟" مدثر کے جاتے ہی اسماء نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں، بس جلد از جلد کوٹھی خالی کرنا ہے تاکہ ان منحوس باپ بیٹوں سے جان چھڑا سکیں، یقین کرو جب بھی انھیں دیکھتی ہوں پاپا یاد آجاتے ہیں۔"

"ایک بات کہوں؟ برا تو نہیں مانو گی۔"

"ہونہہ، برا تو نہیں مانوں گی۔" اسوہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ "شاید مذاق اڑا رہی ہو میرا۔"

"یوں تو نہ کہو۔" اسماء اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلانے لگی۔

"اچھا کہو نا۔" اسوہ مصر ہوئی۔

"اگر تم اور آنٹی ہمارے یہاں شفٹ ہو جاو۔"

"شکریہ اسماء بہن!.... لیکن یہ ممکن نہیں۔ تھانیدار چچا نے بھی یہی آفر کی ہے مگر میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔"

"اس کا مطلب ہے تم ہمیں غیر سمجھتی ہو۔"

"تم دونوں کے علاوہ ہمارا ہے کون؟" اسوہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ہم کب تک یہاں رہیں گے۔ تمھارا گھر کرائے کا بھی ہے اور اتنا بڑا بھی نہیں ہے کہ ہم آسانی سے یہاں ضم ہو جائیں۔ دو تین دن کی بات ہوتی تو مضائقہ نہیں تھا مگر اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھیں تکلیف دینا نہ تو ہمیں زیب دیتا ہے اور نہ یہ مناسب ہے۔"

اس مرتبہ اسماء خاموش رہی تھی۔ اسوہ کی بات صحیح تھی۔

اسوہ، اسما سے جانے کی اجازت لے کر وہاں سے نکل آئی۔

☆☆☆

"سر!.... آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" مہ جبین نے احکامات لے کر ڈائری بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی بولیں؟" عمار اسے فارغ کر کے اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا مہ جبین کے پکارنے پر دوبارہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سر!.... آج میری سالگرہ ہے، اگر آپ میری چھوٹی سی دعوت کو رونق بخشنے آسکیں تو مہربانی ہو گی۔"

عمار ہنسا۔ "یہ رونق بخشنا کیا ہوتا ہے؟"

"کسی بڑے آدمی کا اپنے نوکر کی دعوت قبول کرنا، رونق بخشنا ہی ہوتا ہے نا سر!۔"

"دیکھو مہ جبین!.... پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں۔ اور دوسرا میں اتنا مصروف ہوتا ہوں کہ اس قسم کی دعوتوں کے لیے وقت نہیں نکال پاتا۔ آپ یوں کریں کے انوار بھائی اور باقی چند آدمیوں کو مدعو کر لیں اور میری معذرت قبول کر لیں۔"

"ٹھیک ہے سر!" مہ جبین نے دکھی لہجے میں کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔ مگر اس نے نشست نہیں چھوڑی تھی۔

عمار مطلوبہ فائل کھول کر اپنا کام کرنے لگا۔ مزید دو تین منٹ بھی جب مہ جبین اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی تو اسے پوچھنا پڑا۔

"اب کیا ہے؟"

"کچھ نہیں سر!" مہ جبین کے لہجے میں خفگی کا گہرا تاثر لیے ہوئے تھا۔

"اچھا کتنے بجے ہے پارٹی؟" خفیف سے مسکراہٹ عمار کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

"شام آٹھ بجے سر!" مہ جبین کا لہجہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔وہ جانتی تھی کہ وہ عمار کو منا لے گی۔ پچھلے سات آٹھ ماہ سے وہ اس کے ساتھ کام کر رہی تھی اور اس کے مزاج کو اچھی طرح جانتی تھی۔

"اچھا میں پہنچ جاو ں گا اب موڈ ٹھیک کر و اور جاو کام کرو۔"

اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔"شکریہ سر!....بہت بہت شکریہ۔"

"لیکن اس کے بعد کوئی دعوت نہیں۔"عمار نے تنبیہی انداز میں کہا۔

"سر امیروں کی دعوتوں میں تو ہر دوسرے دن چلے جاتے ہیں، کبھی کبھی ہم غریبوں پر بھی مہربانی فرماتے رہا کریں۔"

"مہ جبین!....ایک بات یاد رکھنا، میں کسی کی امارت دیکھ کر دعوت پر نہیں جایا کرتا۔نہ میں بے مقصد سالگرہ پارٹیوں میں شمولیت اختیار کرتا ہوں۔میرا مقصد صرف اپنے بزنس کو پھیلانے کی تگ ودو کرنا ہے۔"عمار ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

وہ جلدی سے بولی۔"جانتی ہوں سر!....یونہی مذاق کر رہی تھی۔"

"ویسے برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔"

"سر!....مجھے آپ کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔"مہ جبین کے الفاظ کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا وہ عمار کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھا۔

"یادرکھنا، یہ جو سال گرہ ہوتی ہے نا یہ غیر مذہبی تہوار ہے، غیر مسلموں کا طریقہ جو نا معلوم کہاں سے ہمارے ہاں رائج ہو گیا۔اس کی عقلی طور پر بھی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی ہے۔کیونکہ ہر گزرنے والا سال یہ اعلان کرتا ہے کہ انسان کی زندگی کا ایک اور سال ختم ہو گیا اور یقیناً یہ خوشی کی بات تو نہیں ہوتی۔پھر ہم اسے منانے پر کیوں اتنا وقت اور پیسا برباد کرتے ہیں؟ چلو امراء کو تو ہلا گلا اور پارٹی وغیرہ کرنے کا بہانہ چاہیے ہوتا ہے ہمارے طبقے کے لوگ کیوں ان کی نقل میں اپنا وقت اور پیسا برباد کرنے میں لگ جاتے ہیں یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"سر!.... آپ آج رات کا کھانا میرے گھر کھانا پسند کریں گے؟" مہ جبین نے سر جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"کہہ تو دیا کہ آو□ ٔں گا۔" عمار نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں سر!.... میں سالگرہ نہیں منا رہی یونھی آپ کی دعوت کر رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں شام آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔" عمار نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے حامی بھری۔

مہ جبین خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی۔ "شکریہ سر!.... آپ بہت اچھے ہیں۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی تھی۔اور پھر وہ عمار کے جواب کا انتظار کیے بغیر جھپاک سے اس کے دفتر سے نکل گئی۔عمار اس کے دفتر سے نکلنے کے بعد بھی دروازے کو گھورتا رہ گیا۔مہ جبین کے الفاظ سے زیادہ اس کا لہجہ عمار کو پریشانی میں مبتلا کرنے والا تھا۔

اس نے آٹھ ماہ پہلے ہی عمار کی پرسنل سیکرٹری کی سیٹ سنبھالی تھی۔اس کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا ۔اس کے چناؤ میں اس کی قابلیت سے زیادہ اس کے حلیے کا عمل دخل تھا۔سر پر سلیقے سے اوڑھے دوپٹے اور سادہ وکھلے لباس میں دیکھ کر عمار نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسی کو پرسنل سیکرٹری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔بعد میں مہ جبین کا کام دیکھ کر وہ اسے اپنے فیصلے پر فخر محسوس ہوتا۔لیکن پچھلے ایک دوماہ سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ مہ جبین کی دلچسپی عمار کے اندر بہت بڑھ گئی تھی۔اس نے کوئی بے ہودہ حرکت تو نہیں کی تھی البتہ احکامات وغیرہ لیتے ہوئے وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے میں مشغول ہو جاتی۔عمار بچہ نہیں تھا کہ اس کے احساسات سے ناواقف ہوتا۔مہ جبین ایک خوب صورت اور شریف لڑکی تھی۔اگر اسے اسوہ سے محبت نہ ہوتی تو مہ جبین شادی کے لیے ایک آئیڈیل بیوی تھی مگر اب عمار اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔وہ اسوہ کے علاوہ کسی لڑکی کے بارے ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔اسے ہر صورت میں مہ جبین کی غلط فہمی دور کرنا تھی۔دل ہی دل میں ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ اپنا کام کرنے لگا۔

اچانک بجنے والی انٹر کام کی گھنٹی نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"جی!" رسیور اٹھا کر اس نے سوالیہ انداز میں پکارا۔

"سر!.... میڈم شمائلہ اندر آنا چاہتی ہے۔"

"مہ جبین!.... کتنی بار کہا ہے کہ اسے بغیر پوچھے بھیج دیا کرو۔" عمار کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

"سر!.... میڈم خود ضد کرتی ہیں میں کیا کروں؟" مہ جبین نے دبے لفظوں میں شکوہ کیا۔

"اچھا اب اسے بھیج دو۔" کہہ کر عمار نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"اسلام علیکم سر!" شمائلہ سلام کہتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم سلام!.... آؤ شمائلہ بہن کیسی ہو؟" عمار خوش دلی سے بولا۔ عبدالحکیم کی دونوں بیٹیوں کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، بالکل اپنی بہنوں کی طرح عزت کرتا۔ شمائلہ اور ثوبیہ بھی اپنے کام میں ماہر تھیں خاص کر شمائلہ تو بہت اچھی ڈیزائنر تھی۔ انوارلاحق جیسا اہل فن بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتا۔

"بالکل ٹھیک ہوں سر"!

"یقیناآپ اپنا کام ختم کر چکی ہوں گی۔"

"جی سر!.... یہ دیکھیں، میں سارا حساب کر چکی ہوں۔" شمائلہ نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کے سامنے رکھی ۔عمار فائل کھول کر دیکھنے لگا۔

"گویا ہمیں یہ آرڈر لے لینا چاہیے؟" فائل پڑھتے ہوئے اس نے زیر لب تبصرہ کیا۔

"جی سر!...." شمائلہ نے اثبات سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے، میں فرم کو اوکے کا پیغام بھجوا دیتا ہوں۔"

"سر!.... ایک درخواست بھی تھی۔" عمار کی طرف سے گفتگو ختم ہونے کا عندیہ پا کر وہ جلدی سے بولی۔

"آج صبح سے درخواستیں سننے ہی پر لگا ہوں۔ بہ ہر حال بولیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر سراج صاحب اور اپنی چھٹی کی درخواست لے کر آئی ہو تو نامنظور ہے۔" سراج، انوارالحق کا بیٹا اور شمائلہ کا شوہر تھا۔

"نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں۔"

”اچھا جو بات ہے وہ جلدی بتاؤ؟“

”سر جی!....چند ماہ پہلے ہونے والی ہڑتال میں پانچ لڑکیاں بھی شامل تھیں، ان میں سے تین نہایت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ نہایت شرمندہ ہیں سر!....اور معافی کی خواست گار ہیں۔ میں انھی کی سفارش کے لیے حاضر ہوئی تھی۔“

ہڑتال کرنے والے قریباً ساٹھ کے قریب مرد بھی ان میں شامل تھے۔“

شمائلہ اطمینان سے بولی۔”وہ میرے دائرہ کار میں نہیں آتے۔“

”مگر میرے دائرہ کار میں تو آتے ہیں۔ اور ایسے افراد جو چند ٹکوں کی خاطر اپنی کمپنی کو بلیک میل کریں میں ان پر کس طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔ وہ دعا دیں چچا عبدالحکیم کو جنھوں نے انھیں نوکری سے نکالنے کی مخالفت کی ورنہ میں تو انھیں یہاں رکھنے پر تیار نہیں تھا۔“

”ان پانچ خواتین کو تو معاف کر دیں، یقین مانیں وہ اب سدھر گئی ہیں اور آئندہ میں ان کی ذمہ داری لینے پر تیار ہوں۔“

”وہ مردوں کے ساتھ برابر کی قصوروار ہیں۔“

”سر! پلیز۔“شمائلہ ملتجی ہوئی۔

”سوری۔“عمار نے انکار میں سر ہلایا۔

"مگر میں نے ایسے یہاں سے نہیں جانا۔" شمائلہ مصر ہوئی۔

"اس طرح کل دوسروں کو بھی ترغیب ملے گی، غلط کام کی۔"

"عمار بھیا!.... آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔ اور میں اپنے بھائی کی ناں کو ہاں میں بدلے بغیر نہیں جانے والی ۔پہلے میں کمپنی کی ورکر کے طور پر ضد کر رہی تھی اب بہن بن کر زبردستی منواؤں گی۔ اور میں جانتی ہوں کہ آپ اپنی چھوٹی بہن کی بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔"

"بس آگئی اپنی اصلیت پر نکمی!" عمار پھیکے انداز میں ہنسا۔ اور رسیور اٹھا کر مہ جبین کا نمبر ملانے لگا۔

"جی سر!" اس نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"اکاؤنٹ آفیسر کو میرے پاس بھیجو۔"

"جی سر!" مہ جبین نے ایک بار پھر اپنا پسندیدہ لفظ دہرایا اور رسیور رکھ دیا۔

"میرا بھیا بہت اچھا ہے۔" فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے شمائلہ کھڑی ہو گئی۔

"اب یہ خوشامد چھوڑو اور مجھے کام کرنے دو۔"

"ٹھیک ہے سر!" شمائلہ نے دوبارہ ایک جونیئر کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کے انداز پر عمار بے ساختہ مسکرا دیا۔

وہ کمپنی کی اہم ورکر تھی اور کمپنی کے ابتدائی چند ورکرز میں اس کا شمار بھی ہوتا تھا۔ دیکھا جاتا تو عمار کی ترقی میں اس کا کافی کچھ ہاتھ تھا۔ عمار یہ بھی جانتا تھا کہ اسے کئی بار دوسری کمپنیوں سے بہت اچھی اچھی آفرز مل چکی تھیں، مگر وہ آفرز ماننا تو در کنار اس نے عمار کے سامنے ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

انوار الحق اس کے دو بیٹے، عبد الحکیم اور اس کی دونوں بیٹیوں کو عمار بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا اور انھیں کمپنی کے بانیوں میں شمار کیا کرتا اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ تمام لوگ اس وقت سے اس کے کاندھے کے ساتھ کاندھا ملائے آ رہے تھے جبکہ یو اے کمپنی ابتدائی مراحل میں تھی بہت کم ہی وہ ان کی کوئی بات ٹھکراتا۔ وہ بھی عمار کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ ان تمام میں شمائلہ عمار کو بہت عزیز تھی وہ اسے چھوٹی بہن ہی سمجھتا تھا اور جب انھوں نے مل کر عمار سے کوئی کام نکلوانا ہوتا تو اسی کو وکیل بنا کر بھیجتے تھے۔ ہڑتال میں ملوث افراد کے بارے عمار اپنے فیصلے پر ڈٹا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار انوار الحق اور عبد الحکیم نے بھی دبے لفظوں میں اسے معاملہ رفع دفع کرنے کا کہا تھا مگر وہ خوب صورتی سے ٹال گیا تھا۔ وہ دونوں جہاں دیدہ شخص جان گئے تھے کہ عمار انھیں معاف کرنے کو تیار نہیں۔ زور وہ اس لیے نہیں دے رہے تھے کہ عمار بات تومان جاتا مگر بے دلی کے ساتھ ۔ جبکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ عمار یہ محسوس کرے کہ وہ تعلقات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں بہت سوچ بچار کرنے کے بعد انھوں نے شمائلہ کو عمار کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ وہ اس کی کوئی بات ٹالتا نہیں تھا۔ صحیح معنوں وہ اسے اپنی لاڈلی بہن کی طرح رکھتا تھا۔ یہ الگ بات کہ شمائلہ دفتر میں ہمیشہ اسے سر کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتی۔ بلکہ انوار لحق تک اسے عمار صاحب کہہ کر پکارا کرتا۔

شمائلہ کے نکلتے ہی مہ جبین نے اسے اکاو□ نٹ آفیسر کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ اسے آفس میں بلا کر عمار ہڑتال والوں کی بابت ضروری ہدایات دینے لگا۔

☆☆☆

”ایک ہفتے کے اندر انسپکٹر راحیل نے ان کے لیے چار مرلے کا کوارٹر نما مکان ڈھونڈ لیا تھا۔ مکان کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مرتبہ تو اسوہ دکھ سے بھر گئی تھی۔ کہاں دو ایکڑ کی کوٹھی اور کہاں تین مرلے کا ڈربا نما گھر۔ وہ گھر

دو چھوٹے چھوٹے کمروں، ایک باورچی خانے، مختصر سے برآمدے اوراس کے سامنے ایک چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ داخلی دروازے کے ایک جانب غسل خانہ اور بیت الخلا اکٹھے بنے ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہے چچا جان!“ مکان کا جائزہ لے کر اس نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی کی ہنسی بکھیری۔

گہرا سانس لے کر راحیل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”بیٹی!.... قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔“

”چچا جان!.... اللہ پاک کا شکر ہے کہ ہمیں چھت تو میسر آگئی ہے۔“ اس نے بہ مشکل اپنی زبان سے تشکر کا کلمہ نکالا تھا۔ ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دے۔ وہ آسمان کی بلندی سے پاتال میں آگرے تھے۔ ایسے ڈربا نما مکان میں رہنے کے بارے تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

”صحیح کہا بیٹی!“ انسپکٹر راحیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کل میں ایک سپاہی مقرر کر دوں گا کہ یہاں کی صفائی اور سفیدی وغیرہ کر دے پرسوں آپ یہاں شفٹ ہو جانا۔“

”جی۔“ اس نے مختصراً کہا اور وہ وہاں سے باہر نکل آئے۔

”پینتیس لاکھ میں سودا ہوا ہے۔“ گھر واپس جاتے ہوئے انسپکٹر راحیل نے اسے مطلع کیا۔

”ٹھیک ہے چچا جان!.... شام تک میں رقم پوری کر دوں گی۔“

انسپکٹر راحیل اسے کوٹھی کے اندر اتار کر واپس مڑ گیا۔ اس کی چائے پینے کی دعوت پر اس نے معذرت کر لی تھی۔

ماں کے پاس جا کر اس نے ساری تفصیل بتلائی۔اور وہ اپنے اپنے اکاؤنٹس کا حساب کرنے لگیں۔اسوہ کے اکاؤنٹ میں دس لاکھ کے بہ قدر رقم موجود تھی۔اس کی ماں کے اکاؤنٹ میں انیس لاکھ کے قریب رقم موجود تھی۔دونوں نے بینک میں جا کر تھوڑی تھوڑی رقم اکاونٹ میں چھوڑنے کے بعد باقی رقم نکلوا لی۔اور لاکر میں موجود تمام زیور بھی نکلوا لے تھے۔زیوارت وہ ایک جاننے والے جیولر کے پاس لے گئیں جہاں سے وہ زیورات خریدا کرتی تھیں۔

جیولری شاپ سے نکلتے وقت ان کے پاس سینتیس لاکھ موجود تھے۔بینک سے انھوں نے بڑے نوٹوں کی گڈیاں لی تھیں اور جیولری شاپ والے کو بھی یہی کہا تھا کہ بینک سے رقم منگواتے وقت پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں والی گڈیاں منگوائے۔گھر جانے کے بجائے اس نے انسپکٹر راحیل کو وہیں سے کال کر لی کیونکہ اتنی بڑی رقم اپنے ساتھ پھرانا بالکل مناسب نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ وہیں پارکنگ میں ٹھہریں میں آرہا ہوں۔“

”بات سنیں؟“اس نے جونھی رابطہ منقطع کیا ایک جوان لڑکے نے کھڑکی کے سامنے آکر کہا۔

”جی؟“وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔اس کے عقب میں ایک اور لڑکا بھی کھڑا تھا۔اور پھر عقب والے کے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

آگے کھڑا ہوا لڑکا بولا۔”اگر برا نہ لگے تو اپنا ہینڈ بیگ میرے حوالے کر دو۔“

"کک.... کیوں کر دوں۔" ہکلاتے ہوئے کہہ کر اس نے کھڑکی کا شیشہ چڑھانے کی کوشش کی۔ مگر شیشے پر دونوں ہاتھوں کا دباو□ ڈال کر اس لڑکے نے اسوہ کی کوشش ناکام بنادی تھی۔اس کے ساتھ ہی وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

"یقیناموت سے زیادہ اہم نہیں ہے یہ رقم؟"

"مدد کرو.... کوئی ہے۔" اسوہ زور سے پکاری۔ دو تین آدمی پارکنگ میں موجود تھے مگر اس طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ اسی وقت کسی اور کونے سے دو اور لڑکے نمودار ہوئے جنھوں نے ہاتھوں میں پسٹل پکڑے ہوئے تھے۔

اسوہ سے مخاطب ہونے والے لڑکے نے اس کی گود میں پڑے شولڈر بیگ پر ہاتھ ڈالا مگر اسوہ نے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

"چھوڑو ورنہ گولی مار دوں گا۔" پیچھے لڑکے نے اسے دھمکاتے ہوئے پستول اس کی جانب سیدھا کیا۔

"خدا کے لیے ایسامت کرو، یہ ہم سے نہ چھینو۔" وہ ایک دم رو دی تھی۔

"بیٹی چھوڑ دو بیگ کو جانے دو اسوہ!" نسرین نے خوف زدہ لہجے میں اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"ماردیں گولی ماں....ماردیں۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

لڑکے نے جھٹکا دے کر اس سے بیگ چھیننے کی کوشش کی مگر وہ بالکل چمٹ گئی تھی۔ زور زور سے روتے ہوئے وہ لوگوں کو مدد کے لیے بھی بلا رہی تھی۔ مگر اسلحے کی موجودی میں کون ایسا بہادر تھا جو بے بس ماں بیٹی کی مدد کرتا

۔اسوہ کو مزاحمت پر آمادہ پاکر اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے والے لڑکے نے بیگ چھوڑا اور ایک دم کار کا دروازہ کھول کر اسوہ کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا۔وہ اس ردعمل کے لیے تیار نہیں تھی۔وہ باہر پختہ فرش پر آ گری تھی۔ابھی بیگ پر اس نے اپنی گرفت کم نہیں کی تھی۔

اس کے نیچے گرتے ہی لڑکے نے بائیں ہاتھ سے اس کی گھنی زلفوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور دائیں ہاتھ کا زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارا۔درد،توہین اور ذلت کی وجہ سے اسوہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے بھی ان ظالموں پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔پسٹل پکڑے لڑکے نے ایک زوردار لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ زمین پر گر گئی اس کی گرفت بیگ پر ڈھیلی ہوئی اور اس کے ساتھ زور آزمائی میں مصروف لڑکے نے بیگ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اس کے ساتھ ہی نیچے گرا ہوا اس کا قیمتی موبائل بھی اٹھا کر جیب میں ڈال لیا تھا۔

اس کارروائی کے دوران نسرین نے بھی چیختے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کی تھی مگر دوسری طرف موجود پسٹل بردار نے ڈھاڑ کر کہا....

”اگر باہر نکلیں تو گولی بھیجے میں اتار دوں گا بڑھیا!“ اس نے سہم کر اپنا ہاتھ دروازے کے ہینڈل سے ہٹا لیا لیکن اس کی منتیں اور دہائیاں جاری رہیں۔کبھی وہ اسوہ کو مخاطب کرنے لگتی اور کبھی ان لڑکوں کی منت کرنے لگتی۔

بیگ اور موبائل وصول کرتے ہی وہ چاروں وہاں موجود دو موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر نکلتے چلے گئے۔نسرین جلدی سے باہر نکلی اسوہ پیٹ پر ہاتھ رکھے دہری ہوئی تھی۔

"اسوہ.... اسوہ.... "نسرین آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے لگی۔ "بیٹی!.... منع کیا تھا نا کہ ان ظالموں سے زور آزمائی نہ کرو۔ اگر وہ درندے تمھیں گولی مار دیتے میری جان!.... میرا کیا بنتا۔ "نسرین روتے ہوئے بیٹی کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ اوہ اسے جواب دیے بغیر خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

اسی وقت ایک دو بندے ان کے قریب آئے۔ "بہن ٹھیک تو ہو؟" وہ ہمدردی سے پوچھنے لگے۔

"بڑی جلدی خیال آ گیا بہنوں کا؟" اسوہ پھٹ پڑی تھی۔ "آپ جیسے بھائی ہوں گے تو بہنوں کی دولت کیا عزت بھی سر بازار لٹے گی۔"

سوال پوچھنے والا شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا تھا۔ اس کے ہمراہ کھڑے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

"بیٹی!.... ہم کیا کر سکتے تھے۔ وہ مسلح تھے، ہم خالی ہاتھ ان کا مقابلہ کیسے کرتے؟"

"آپ لوگوں کی اسی بزدلی نے ان جیسے درندوں کو کھلی چھوٹ دے دی ہے۔"

اس مرتبہ کسی نے بھی اسوہ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ نسرین نے اسے سہارا دے کر کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اسی وقت انسپکٹر راحیل سرکاری گاڑی جیپ کے ساتھ پارکنگ میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ تین سپاہی بھی تھے۔ تمام اس وقت وردی میں تھے۔ انسپکٹر راحیل کو دیکھ کر اسوہ پھر رونے لگ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" جیپ کے رکتے ہی وہ جلدی سے باہر نکلا۔

وہاں موجود تماشائیوں نے کھسکنے کی کوشش کی مگر انسپکٹر راحیل نے انھیں ہاتھ اٹھا کر روکا۔

"ٹھہریں آپ لوگ۔" اور اس کی بات سن کر تمام لوگ رک گئے تھے۔

اسوہ کی حالت دیکھتے ہی وہ ایک لمحے میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔"کتنے آدمی تھے؟"

"چار افراد تھے بھائی صاحب!"نسرین نے دکھی لہجے میں بتایا۔

"تمھیں چوٹ تو نہیں لگی؟"راحیل نے آگے بڑھ کر اسوہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"اچھا چلو گھر چلیں۔"انسپکٹر راحیل کے پاس اس کے علاوہ کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ کراچی جیسے شہر میں چار مجرموں کو تلاشنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے سے بھی کئی گنا زیادہ مشکل تھا۔

☆☆☆

غم نے تو گویا اسوہ کے گھر کا رستا دیکھ لیا تھا۔اسے کوٹھی کا ریں چھن جانے پر اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا آخری جمع پونجی کے لٹنے پر ہوا تھا۔وہ رقم ان کے لیے باعزت زندگی گزارنے کا آخری سہارا تھی۔اس واقعے کو ہفتہ گزر گیا تھا۔انسپکٹر راحیل پوری کوشش کے باوجود بھی ان مجرموں کو تلاش نہیں کر سکا تھا۔اس وقت وہ اپنے بیڈ پر لیٹی خوب صورت نقش و نگار سے مزین چھت کو گھور رہی تھی۔دماغ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔والد کی وفات ،عمار کی جدائی،کوٹھی کاریں چھن جانے کا غم،ڈکیتی کی واردات میں ہونے والی توہین اور مستقبل کی فکر۔ماں بیٹی بالکل ہی بے سہارا اور بے یارو مددگار ہو گئی تھیں۔ان کے خون کے رشتے تو یوں بھی موجود نہیں تھے اور دور پار رشتے داروں کے ساتھ انھوں نے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔اب اس حالت میں انھیں کس نے برداشت کرنا تھا۔لے دے کے انسپکٹر راحیل،مدثر اور اسماء کی ذات ایسی تھی جن سے وہ اپنے دکھ درد بیان کر

سکتی تھی۔ اس دن کے بعد طاہر جواد اور اس کا بیٹا نہیں آئے تھے، البتہ اکا دکا پلاٹ خریدار پہنچ جایا کرتے تھے۔ اور ان کے بارے اسوہ نے پہلے سے چوکیدار کو سمجھا دیا تھا۔ وہ ہر آنے والے کو طاہر جواد کا فون نمبر اور اس کے گھر اور دفتر کا پتا سمجھا دیا کرتا۔

ماں کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی تھی۔ "آئیں امی جان"!

"گڑیا اتنی پریشان کیوں ہو؟.... جہاں اتنا کچھ چلا گیا وہاں اس حقیر رقم کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ میری بیٹی جینے ہی سے منہ موڑ لے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں امی جان!.... بس وہ توہین کا احساس ہی دماغ سے زائل نہیں ہوتا۔ کس بے دردی سے ان ظالموں نے مجھے مارا تھا۔"

"امی کی جان!.... یہ وہ درندے ہیں کہ دولت کے لیے اپنے ماں باپ کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر تیار ہو جائیں تم تو پھر بھی ایک غیر لڑکی تھیں۔ اور یاد ہے اس وقت کتنی منتیں کی تھیں کہ بیگ ان ظالموں کے حوالے کر دو۔ یہ تو شکر ہے انھوں نے تم پر گولی نہیں چلا دی تھی ورنہ میں تو جیتے جی مر جاتی۔"

"ماں جی!.... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ اب کیا کریں گے؟"

"فی الحال تو دو تین ماہ رہ سکتے ہیں یہاں۔" نسرین بیگم نے خیال ظاہر کیا۔

"ماں جی!.... ہمارے اکاؤنٹس میں اتنی رقم نہیں ہے کہ ہم چوکیدار اور ملازما کی عیاشی افورڈ کر سکیں۔ اور نہ گیس بجلی کے بل کی ادائی کی رقم ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ عارضی طور پر انسپکٹر چچا کے ہاں چلے جاتے ہیں۔"

نسرین نے کہا۔ ”دو تین ماہ تک بجلی اور گیس کے بل کی ادائی نہ کرنے پر میٹر نہیں کاٹا جاتا۔ باقی رہ گیا چوکیدار اور ملازما کا مسئلہ تو انھیں رخصت کر دیتے ہیں۔“

”یہ ٹھیک ہے ماں جی!“ اسوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اگلے دن ہی ان دونوں کو بلا کر نسرین بیگم نے مطلوبہ تنخواہ کے چیک پکڑائے اور پھر معذرت کر کے انھیں الوداع کر دیا۔

☆☆☆

تمام کے چھٹی کر جانے کے بعد بھی وہ دفتر میں بیٹھا رہا۔ دوسروں کے ساتھ اس نے مہ جبین کو بھی رخصت کر دیا تھا۔ صرف عبدالحکیم دفتر میں موجود تھا کہ وہ عمار کے جانے کے بعد ہی چھٹی کیا کرتا تھا۔ عمار نے اسے کئی بار منع کیا تھا مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ فرصت کے لمحوں میں عمار اس کے سامنے اپنی اور اسوہ کی کہانی بھی دہرا چکا تھا ۔اب بھی جب اس کا دل کرتا وہ چچا عبدالحکیم کو بلا کر اسوہ کی یادیں اس سے بانٹ لیتا۔

ضروری کام نبٹا کر اس نے اپنی قیمتی گھڑی پر نگاہ دوڑائی شام کے ساتھ بج رہے تھے۔ مزید ایک گھنٹا گزارنے کے لیے اس نے چچا عبدالحکیم کو بلا لیا۔ اس کے گھنٹی بجانے پر وہ فوراً حاضر ہو گیا تھا۔

”جی سر!....“ اس نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔

”آو چچا جان!.... بیٹھو دو باتیں ہی کر لیں۔“

”ساتھ اگر چائے بھی ہو جائے تو؟“ عبدالحکیم نے مسکرا کر پوچھا۔

"ٹھیک ہے، سبز چائے ٹھیک رہے گی۔" عمار نے بے تکلفی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ چچا عبدالحکیم اس کا کام کر کے دلی خوشی کیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس طرح کے کام بتانے میں عمار بخل سے کام نہ لیتا۔

اس چائے لانے تک وہ مہ جبین کے رویے پر غور کرنے لگا۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ رہا تھا کہ وہ ناراض بھی نہ ہو اور اس تک عمار کی بات ھی پہنچ جائے۔ کسی کا دل توڑنا اسے گوارا نہیں تھا، مگر وہ کیا کرتا کہ جس بارے مہ جبین اس کے پیچھے پڑی تھی وہ اس کے بس میں نہیں تھا۔

"یہ لیں سر!.... گرما گرم چائے۔" چچا عبدالحکیم نے اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے نشست سنبھالی ۔ اپنے لیے چائے لانا وہ نہیں بھولا تھا۔

"چچا جان!.... ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے؟" چائے کی چسکی لیتے ہوئے عمار عبدالحکیم کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں سن رہا ہوں سر!" عبدالحکیم نے بھی اپنی چائے کی پیالی دائیں ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

"مہ جبین بہت اچھی لڑکی ہے مگر اب معاملہ کچھ بدلنے لگا ہے۔"

عبدالحکیم ہنسا۔ "عمار صاحب!.... جس چیز کا کوئی وارث نہ ہو اس کے ہزاروں امیدوار پیدا ہو جاتے ہیں۔" وہ جہاں دیدہ شخص عمار کے بتلائے بغیر حقیقت کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

"میں نے اس طرح کی کوئی بات ہی نہیں کی پھر آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟"

"میں کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ مہ جبین کی دلچسپی آپ کی شخصیت میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جب تک وہ یہاں بیٹھی ہوتی ہے مجھے آپ کے لیے چائے یا کافی وغیرہ بھی نہیں لانے دیتی۔ ہر وقت آپ کی تعریفوں رطب اللسان رہتی ہے۔"

"ہونہہ، آج مجھے سال گرہ پارٹی کی دعوت دے رہی تھی۔ چونکہ غیر اسلامی تہوار مجھے اچھے نہیں لگتے۔ اس بارے میرے خیالات جانتے ہی وہ سال گرہ پارٹی کا ارادہ ختم کر کے مجھے کھانے کی دعوت دینے لگ گئی اس کا دل رکھنے کے لیے مجھے حامی بھرنا پڑی۔"

"میرے لیے حکم؟"

"کوئی ایسی ترکیب کہ اس کا دل بھی نہ ٹوٹے اور اس کی سمجھ میں بھی ساری بات آجائے۔"

"دل نہ ٹوٹے، یہ بھی خوب کہی۔" عبدالحکیم کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "سر! آپ اپنی بات کو شہد کی ہزار پرتوں میں لپیٹ کر بھی جب ایک لڑکی کو یہ خبر سنائیں گے کہ جسے وہ چاہتی ہے وہ اسے نہیں مل سکتا تھا تو بلاشک وشبہ اس کے دل کے اتنے ہی ٹکڑے ہوں گے جتنے یہی خبر آپ غصے کی حالت میں اس کے گوش گزار کرنے پر ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب واضح ہے۔ محبت کرنے والے بچھڑنے کی خبر کے الفاظ پر دھیان دیتے ہیں انداز اور لہجے پر نہیں۔"

"تو پھر؟"

عبدالحکیم نے جواب دیا۔ "پھر یہ کہ اسے بتادو، وہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ آپ کی خاموشی اس کے دل میں غلط فہمی کا کوئی بیج بھی بو سکتی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے.... لیکن میں اسے سمجھانے کے لیے کوئی عمدہ طریقہ سوچ رہا تھا۔"

"سب سے عمدہ طریقہ یہی ہے کہ اس کے اظہار سے پہلے ہی اسے اسوہ کے متعلق پوری کہانی سنادو۔"

"تو کیا اس طرح وہ سنبھل جائے گی؟"

عبدالحکیم نے اطمینان سے کہا۔ "یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔"

"دکھ تو ہوتا ہے ناچچا۔" عمار نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"جس دکھ کا مداوا آپ کے بس سے باہر ہے اس کو سوچنا وقت کا ضیاع ہے اور میں آپ کو وقت ضائع کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔"

"گویا میری احتیاط فضول ہے۔"

عبدالحکیم نے منطقی انداز میں کہا۔ "فضول تو نہیں، بے فائدہ کہہ لیں۔"

"چلو ایسا ہی سہی.... اور اب مجھے چلنا چاہیے۔" گھڑی پر نظر دوڑا کر وہ اٹھ گیا۔

عبدالحکیم بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا تھا۔ عمار نے لیپ ٹاپ بیگ میں ڈالا دفتر سے باہر نکل آیا۔ عبدالحکیم نے اس کے ہاتھ سے بیگ تھام لیا تھا۔ گو عمار اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ عبدالحکیم اس کا سامان اٹھا کر اس کے

پیچھے چلے مگر عبدالحکیم کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنا پڑتا تھا۔کئی بار منع کرنے کے باوجود وہ باز نہیں آیا تھا تو عمار نے اسے اس کے حال پر چھوڑنا پڑا۔

اس کی کار کارخ عبدالحکیم کے گھر کی طرف تھا کیونکہ جس دن وہ دفتر سے لیٹ اٹھتا اس دن عبدالحکیم کو اس گھر پر اتارنے ضرور جاتا۔عبدالحکیم سے رخصت لے کر وہ مہ جبین کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔البتہ رستے میں مارکیٹ میں رک کر وہ چند تحائف لینا نہیں بھولا تھا۔

پورے گھر والے شدت سے اس کے منتظر تھے۔مہ جبین کا باپ شوکت حیات ایک بینک میں کیشئر تھا جبکہ ماں بشریٰ ایک گھریلو خاتون تھیں۔اس سے ایک چھوٹی بہن اور بھائی ابھی تک پڑھ رہے تھے وہ سب سے بڑی تھی اور آزاد خیال باپ نے اسے نوکری کی اجازت دی ہوئی تھی۔یوں بھی گھروں کے خرچ اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ایک تنخواہ سے گزارا نہیں ہو پاتا۔البتہ ماں باپ نے اس کی تربیت اس نہج پر کی تھی کہ انھیں اپنی بیٹی پر پورا بھروسا تھا۔

اپنی کار اس نے گھر سے باہر ہی پارک کی تھی کہ اس چھوٹے مکان میں اتنی گنجائش موجود نہیں تھی۔

”شکریہ سر!“مہ جبین نے سر کے اشارے سے اسے خوش آمدید کہا۔شوکت حیات سے ہاتھ ملا کر وہ اس کی معیت میں ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔پر تکلف کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ہلکی پھلکی گپ شپ میں کھانا کھایا گیا۔کھانے کے بعد بھی عمار نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔جوان لڑکی کے والدین اتنے بچے نہیں تھے کہ وہ اپنی بیٹی کے دل کے حال سے ناواقف ہوتے۔کھانے کے بعد قہوہ پی کر وہ غیر محسوس انداز میں وہاں سے کھسک لیے تھے۔جب مہ جبین اور عمار اکیلے رہ گئے تو عمار مقصد کی گفتگو پر آیا جس

کی وجہ سے وہ ابھی تک رخصت نہیں ہوا تھا۔ مہ جبین کے گھر والوں کے بارے سرسری معلومات لینے کے بعد اس نے دھیرے دھیرے گفتگو کا رخ اپنی ذات کی جانب موڑا۔ اور اس کی کوشش کے بہ موجب جلد ہی مہ جبین نے وہ سوال کر دیا جس کا وہ منتظر تھا۔

"سر!.... ویسے آپ نے بہت جلد ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ پرانے ورکرز بتلاتے ہیں کہ آپ نے بالکل صفر سے ابتداء کی اور آپ کا تعلق بھی ایک سفید پوش گھرانے ہی سے تھا۔ ویسے اتنے کم وقت میں اتنا سفر ؟"

" صحیح کہہ رہی ہیں آپ اور جانتی ہو جب لگن سچی ہو تو انسان کی کوششیں ضرور بار آور ثابت ہوتی ہیں۔ یقین کرو میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اس میدان میں اترا۔ کیونکہ کسی نے میری غربت کا بہت مذاق اڑایا تھا ۔ ایک ایسی جو مجھے سارے جہان میں سب سے عزیز تھی بلکہ اب بھی ہے البتہ میری غربت اس کی نظروں میں باعث استہزاء تھی۔ اس نے میری محبت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا مجھے دھتکارا اور میرے دل میں یہ یقین بیٹھ گیا کہ دنیا میں عزت صرف اسی کی ہے جس کے ہاتھ میں پیسا ہے۔ اور پھر میں عزت کمانے کی تگ ودو میں شروع ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ جب میں اس مقام پر پہنچ جاو□ ں جہاں اس کا دولت مند باپ موجود ہے تب میں اس کا رشتا مانگنے اس کے گھر جا سکتا ہوں اور اب جلد ہی میں اس کے گھر کا رخ کرنے والا ہوں بس ایک دو تعمیراتی کام زیر تکمیل ہیں جو نھی یہ مکمل ہوتے ہیں میں اپنے والدین کو اس کے گھر لے جاو□ ں گا۔"

مہ جبین کے چہرے پر مایوسی کے گہرے بادل چھا گئے تھے۔ لیکن اس نے بہ ظاہر مسکرا کر کہا۔

"اللہ پاک آپ کو کامیاب کرے سر"!

دکھ کا گہرا احساس دل میں چھپا کر جو مسکراہٹ لبوں پر ظاہر ہوتی ہے وہ مسکراہٹ ایک عجیب منظر پیش کرتی ہے یوں جیسے دھوپ میں بارش ہو رہی ہو، کیچڑ میں پھول کھلا ہو یا گلستان کو آگ لگ جائے۔ ہنسنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا اپنے محبوب کی خوشی میں شریک ہوا جائے یا اپنے ٹوٹنے والے دل کا ماتم کیا جائے۔ اسی کیفیت سے مہ جبین گزر رہی تھی۔ عمار جانتے بوجھتے اس کے احساسات سے بے خبر بنا رہا۔

"شکریہ مہ جبین!.... اور اپنی سناؤ ؟.... منگنی کی مٹھائی وغیرہ کھلانے کا کب ارادہ ہے؟" اس نے ماحول میں چھائی اداسی کے گھمبیر احساس کے باوجود مہ جبین کے دل میں پلنے والی آخری امید کو بھی جڑ سے اکھاڑنے کی خاطر کہا۔

وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ "سر!.... اس بارے تو امی جان اور ابو جان ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"بالکل صحیح کہا!.... نیک بخت لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"نیک بخت، یہ بھی خوب کہی سر!" مہ جبین کے لہجے میں شامل دکھ عمار کی نظر سے اوجھل نہیں تھا، بلکہ وہ تو اس دکھ کی چبھن تک اپنے سینے میں محسوس کر سکتا تھا کہ یہ وقت اس پر بیت چکا تھا۔ مگر وہ اس حالت میں نہیں تھا کہ مہ جبین کو تسلی دے سکتا۔

"میرا خیال ہے کافی دیر ہو گئی ہے مجھے چلنا چاہیے۔" اپنی بات وہ اس تک پہنچا چکا تھا اب وہاں مزید بیٹھنا اسے مناسب معلوم نہ ہوا۔

"جی سر!" مہ جبین کھڑی ہو گئی تھی۔ "چلیں میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ دیتی ہوں۔"

"گیٹ نہیں کار تک۔ میں نے آپ لوگوں کے لیے چند تحائف لائے ہیں وہ کار ہی میں پڑے ہیں۔"

"یہ آپ نے زیادتی کی ہے سر!" مہ جبین نے احتجاجاً کہا۔

"پہلی دفعہ اپنی چھوٹی بہن کے گھر جا رہا تھا اتنا بھی نہ کرتا۔" عمار نے اس کے تڑپتے پھڑکتے دل پر آخری وار کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مہ جبین کی آنکھوں سے نکلنے والی غم کی تیز آنچ اسے دکھی کرنے لگی تھی۔

کار کا دروازہ کھول کر اس نے عقبی نشست سے ایک بڑا سا شاپنگ بیگ نکال کر مہ جبین کے ہاتھ میں پکڑایا اور اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔ وہ جانتا تھا کہ چند دنوں تک وہ سنبھل جائے گی۔ وقت ایک بہت بڑا مرہم ہے جو کسی بھی زخم کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ ایک معصوم لڑکی کو وہ اپنے انتظار کی سولی پر نہیں لٹکا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عمار کی وجہ سے وہ کوئی اچھے رشتے ٹھکرا دیتی اور بعد میں اس کے پاس پچھتانے کا بھی موقع نہ ہوتا۔ اب بھی اگر وہ کوئی ایسا کام کرتی تو اس کا ذمہ دار کم از کم عمار نہ ہوتا۔

تھوڑا سا آگے جاتے ہی جانے کیوں اس کے دل میں اسوہ کی یاد ہلکورا لے کر بیدار ہوئی اور اس نے اپنی کار کا رخ اس کے گھر کی طرف کر دیا۔ یہ مشکل تھا کہ رات کے اس وقت وہ گھر سے باہر نکلتی یا گیٹ پر کھڑی ہوتی کہ عمار صاحب آ کر اس کا دیدار کر لے مگر اس کے باوجود وہ خود کو روک نہ پایا۔ محبوب نہ سہی اس کے گھر کا دیدار بھی ایک سعادت ہی تھی۔ گو وہ جانتا تھا کہ اسوہ کے دل میں اس کے لیے محبت نہیں ہے مگر یہ بات اسے اسوہ کی محبت سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ گزرے سالوں نے اسوہ کی محبت میں ذرا سی بھی کمی نہیں آنے دی تھی۔ وہ آج بھی شروع دن کی طرح اس کے دل پر قابض تھی۔ آج بھی وہ اسے اتنا ہی پیاری تھی جتنا پہلی نظر میں لگی تھی بلکہ اگر وہ اپنی محبت کا موازنہ گزشتہ دنوں سے کرتا تو آج اسوہ کی محبت کا پلڑا پہلے سے بھی کچھ زیادہ وزنی دکھائی دیتا تھا۔ بہت زیادہ کوشش کے باوجود وہ اپنے دل میں اس کی یاد کی شدت کو کم نہیں کر پایا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے والدین کی حسرت بھری نگاہیں دیکھ کر اتنا شرمندہ ہو جاتا کہ خود سے نظریں ملانے کے بھی قابل نہ

رہتا اور اس کا دل چاہتا کہ امی ابو کی بات مان کر شادی کر لے۔ مگر اسی لمحے اسوہ کی یاد اس کے دل میں چٹکی لے کر اپنے ہونے کا احساس دلاتی۔ اور وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کے قابل نہ رہتا۔

جلد ہی وہ اسلم شکور کی وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اپنی کار کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے وہ کوٹھی کے سامنے سے گزرنے لگا۔ غیر متوقع طور پر اسے کوٹھی میں اندھیرا چھایا نظر آیا۔ حالانکہ اس کے ارد گرد کی کوٹھیوں میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ وہ کافی عرصے بعد وہاں سے گزرا تھا۔ داخلی دروازے کے سامنے اس نے ایک لحظے کے لیے کار روکی اور پھر چل پڑا۔ دل ہی دل میں اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ چند دنوں تک اپنے انتظار کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے وہاں کا رخ ضرور کرے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اسوہ کی شادی ہو گئی تھی یا نہیں اور اگر ہو گئی تھی وہ اپنی خانگی زندگی میں خوش حال تھی یا نہ خوش۔ لیکن اس کا وجدان یہ کہتا تھا کہ وہ قیمتی موتی ابھی تک کسی تاج کی زینت نہیں بنا ہو گا۔ اور شاید عمار کی دنیاوی ترقی دیکھ کر وہ بے دلی ہی سے سہی مگر اس کا تھام لیتی۔ عمار کو تو بس اس کا ساتھ چاہیے تھا۔

☆☆☆

دو تین ماہ پلک جھپکتے کی دیر میں گزر گئے تھے۔ اس دوران اسوہ دو تین مرتبہ ہی اسماء لوگوں کے ہاں جا سکی تھی ۔ اسوہ پر پڑنے والی افتاد نے انھیں بھی دکھی کر دیا۔ پلاٹ کے خریداروں کا طاہر جواد کے ساتھ کیا معاہدہ ہوا تھا اس بارے وہ لاعلم تھی۔ البتہ گروی رکھی کوٹھی کی مہلت ختم ہونے سے ایک ہفتہ پہلے انھیں قانونی طور پر گھر چھوڑنے کا نوٹس مل گیا تھا۔ اب گیٹ وغیرہ پر کسی کے آنے کی صورت میں اسوہ کو خود جا کر گیٹ کھولنا پڑتا۔ باورچی خانہ اس کی ماں نے سنبھال لیا تھا۔ اپنے دو کمروں کے علاوہ انھوں نے باقی کمرے مستقل بند کر

دیے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت اپنے کمرے ہی میں گزارتی۔ وہ چاہ کر بھی سہانے ماضی کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ اس کوٹھی میں اسے اپنے پاپا کی شفقت بھری سرگوشیاں سنائی دیتیں۔

"ارے میری پیاری گڑیا رو کیوں رہی ہے؟" بچپن ہی سے اسے منہ بسورتے دیکھ کر اس کے ابو جان بڑے پیار سے پکارا کرتے اور پھر جب وہ آنکھوں میں نمی لیے کسی بھی جائز ناجائز خواہش کا اظہار کرتی پاپا اسے پورا کرنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ وہ اسے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ مذاق میں موڈ بناتی اور اس کے والد سچ مچ پریشان ہو جاتے۔ آج وہ سچ مچ پریشان تھی مگر اس کے آنسو صاف کرنے والا اپنی شفقت، محبت سمیت بہت دور چلا گیا تھا۔ ایسی جگہ جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹا کرتا۔ والد نے کبھی اسے گلاب کے پھول سے بھی نہیں مارا تھا اور اس کی غیر موجودی میں دو تین غنڈوں نے اسے تھپڑ مارے اس کے نازک پیٹ میں ایسی لات رسید کی جس کی تکلیف وہ کئی دن تک محسوس کرتی رہی۔ اور اس وقت اس کا رونا کسی کام نہ آیا۔ اگر اس کا پاپا زندہ ہوتا تو پاتال سے بھی ان غنڈوں کو ڈھونڈ کر لے آتا۔ مگر اب تو خود پاپا ہی نہیں رہا تھا۔ اور پھر والد کے بعد اسے عمار نے بھرپور محبت دی تھی۔ مگر پاپا کی طرح وہ اسے بھی گنوا چکی تھی۔ وہ اس کی بے لوث محبت کی قدر نہ کر سکی۔ اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ بھی عمار کو چاہتی ہے تو عمار بھی غائب ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے بعد اب وہ اپنے پیارے گھر سے بھی بے دخل ہونے والی تھی۔ وہ بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی کی حدود میں اسی کوٹھی کے اندر رہ کر داخل ہوئی تھی۔ اس کوٹھی کے چپے چپے سے اسے عشق تھا۔ وہ مہلت ختم ہونے سے دو تین بار پہلے کوٹھی سے رخصت ہونے کا ارادہ کر چکی تھی مگر ہر بار اس کی کوشش رائیگاں جاتی۔ وہ لاشعوری طور پر بھی مہلت ختم ہونے سے پہلے کوٹھی خالی کرنے پر تیار نہیں تھی مگر اب تو وہ وقت پورا ہو چکا تھا۔ مہلت ختم ہونے

کے بعد وہ بہت تکلیف میں دن گزار رہی تھی۔ اور پھر وہ دن آ گیا جب طاہر جواد اپنی منحوس شکل لے کر وہاں آن پہنچا۔

"تو کیا سوچا ہے مس اسلم شکور!" اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھا تھا۔"

"ہم کل یہاں سے چلے جائیں گے۔" کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے میں گہرے دکھ کے احساس کو نہیں چھپا سکی تھی۔

"گو تمھاری وجہ سے مجھے بہت نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ مجھے لوگوں کے ایڈوانس کی رقم اپنے پلے سے ادا کرنا پڑی پھر بھی میری آفر قائم ہے۔ میرا بیٹا اب بھی تمھیں اپنانے کے لیے تیار ہے۔"

"کل آکر گھر کی چابی لے لینا۔" دروازہ بند کر کے وہ پیچھے مڑ گئی۔ اپنے باپ کے قاتل سے وہ سودے بازی نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ پستول خرید کر دونوں باپ بیٹوں کو قتل کر دے۔ مگر ایسا صرف سوچا جا سکتا تھا۔ وہ ایک کمزور لڑکی کے بس سے باہر تھا کہ وہ ان درندوں کا مقابلہ کرتی۔

اسی رات کو اس نے تیب بڑے بیگوں میں اپنی امی اور اپنا سامان پیک کر لیا تھا۔ دونوں کے پاس استعمال کے کافی لباس اور جوتے موجود تھے۔ انسپکٹر راحیل سے اس نے بات کر لی تھی وہ مقررہ وقت پر وہاں اپنی کار لے کر پہنچ گیا تھا۔ اس کے پاس وہی کار تھی جو کبھی اسوہ کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ اور اس نے انسپکٹر کی کارکردگی پر خوش ہو کر اسے انعام میں دی تھی۔ لاکھوں کی کار اس کے حوالے کرتے وقت اسوہ کو ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوا تھا ۔ اور وہی اسوہ تھی کہ چند لاکھ کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے پر تیار ہو گئی تھی۔ وقت بھی انسان کو جانے کہاں لا پٹختا ہے۔ دو بیگ کار کی ڈگی میں اور ایک عقبی نشست پر ماں کے ساتھ رکھ کر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ طاہر جواد

بھی اس کے بتائے ہوئے وقت پر پہنچ گیا تھا۔ ان کے کپڑوں وغیرہ کے لے جانے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

کار کے آگے بڑھتے ہی اسوہ نے مڑ کر اپنے گھر پر آخری نگاہ ڈالی۔ ڈرائینگ روم کے دروازے پر اسے اپنا والد مسکراتا ہوا کھڑا دکھائی دیا۔ ایک بار وہ دوستوں کے ساتھ مری کی سیر کو گئی تھی اس وقت بھی اسی جگہ پر کھڑے ہو کر اس کے پاپا نے اسے ہاتھ ہلا کر رخصت کیا تھا۔ وہ بے ساختہ امڈ پڑنے والے آنسوو□ ں کو روکنے کے لیے ایک دم نیچے دیکھنے لگی مگر ساکی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے راحیل نے دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

"بیٹی!....ماضی کی آسائشوں کے بجائے مستقبل کے سہانے سپنوں پر توجہ دو۔"

وہ سسکی۔"چچا جان!.... مستقبل بھی تو اندیشوں سے پر نظر آ رہا ہے۔"

اس کی ماں بھی اپنی آنکھوں پر دوپٹا لپیٹے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی تگ و دو میں تھی۔

"اللہ نہ کرے بیٹی!.... ایسا نہیں کہتے۔ جو آزمائشیں آنا تھیں وہ تو گزر چکیں۔ انھیں آپ لوگ جھیل چکے ہو اب اس سے بڑی مصیبت تو نہیں آسکتی۔ اور ڈرتا تو وہ ہے جس کے پاس کچھ گنوانے کو ہو۔ آپ نے سب کچھ گنوا دیا ہے اب ڈر کاہے کا۔ بس اللہ پاک کو راضی کرو۔ کہ یہ دنیا بالکل عارضی ہے۔" ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر انسپکٹر راحیل کے پاس ان کو تسلی دینے کے لیے اس کے علاوہ کوئی الفاظ موجود نہیں تھے۔ اس نے ماں بیٹی کی ذمہ داری اس لیے قبول کی تھی کہ وہ جانتا تھا اسوہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اور جاب وغیرہ کر کے اپنا خرچا پانی

پورا کر لیتی۔ اور پھر وہ اسے بیٹی جیسے مقدس نام سے پکار چکا تھا اس وجہ سے اس کا اتنا حق تو بنتا تھا کہ ماں بیٹی کو رہنے کے لیے گھر میں ایک کمرہ ہی دے دیتا۔

☆☆☆

"پاپا!.... کیا فائدہ ہوا میرا کام تو نہیں ہوا نا؟" ارشد نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور یار!.... اب میں اس کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتا نا؟.... یوں بھی وہ انسپکٹر راحیل کے گھر شفٹ ہو گئی ہے۔ شاید اسے تمھارے ارادے کی خبر پہلے سے تھی، کہیں تم نے اسے فون پر دھمکی وغیرہ تو نہیں دی تھی۔"

"مگر آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اسے کسی بھی صورت میری زندگی میں لائیں گے؟" ارشد نے تمام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اس وقت شیخ رئیس الدین، فیروز خان رئیسانی اور سید تبریز شاہ بھی وہیں موجود تھے۔ تمام اس وقت اسلم شکور کی کوٹھی کی بندر بانٹ کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔

تبریز شاہ نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "ارشد میاں!.... گو تم اچھے تو نہیں ہو مگر تم نے اچھا نظر آنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اتنے عرصے کی مہلت تھی تمھارے پاس، تم ایک لٹی پٹی لڑکی ہی کو نہ ورغلا سکے۔ اللہ کے بندے ہمدردی کے دو بول ہی اسے تمھاری جھولی میں پھینک دیتے۔ اپنے والد کی تھوڑی برائیاں کرنا تھیں اسے مستقبل کے سہانے خواب دکھانا تھے اور بس"....

"اسے میری شکل دیکھنا گوارا نہیں تھا کیسے کرتا یہ سب کچھ۔" ارشد نے منہ بنایا۔

”اب ہمیں جوانوں کو لڑکیاں پھانسنے کے طریقے سکھلانے پڑیں گے؟ حد نہیں ہو گئی۔“ تبریز شاہ نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

”اچھا اسے چھوڑو طاہر صاحب! آپ کچھ بتا رہے تھے؟“ رئیسانی نے اس لا ینحل بحث کو ختم کرتے ہوئے طاہر جواد سے پوچھا۔

”کہنا کیا ہے، اسلم شکور کی کوٹھی ہمارے پاس آ گئی ہے آپ میں سے جو بھائی رکھنا چاہے وہ رکھ لے باقیوں کا حصہ رقم کی صورت ان کے حوالے کر دے۔“

”گویا آپ نے وہ کوٹھی نہیں رکھنی؟“ شیخ رئیس الدین نے پوچھا۔

”نہیں....“ طاہر جواد نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے بھی نہیں چاہیے۔“ تبریز شاہ نے بھی انکار کر دیا۔

”اب آپ دونوں رہ گئے ہو؟“ طاہر نے ہنستے ہوئے شیخ رئیس الدین اور فیروز خان کو مخاطب ہوا۔

”دل تو میرا بھی نہیں ہے۔“ شیخ رئیس الدین بھی نہ خریدنے والوں کی طرف ہو گیا۔

فیروز خان نے کہا۔ ”اچھا پہلے کوٹھی کا قیمت کا تو تعین کر دو۔“

”کسی پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ کر لیتے ہیں جو قیمت ملی تقسیم کر لیں گے۔“ تبریز شاہ نے مشورہ دیا۔

”یہ کام تو اپنے طاہر صاحب بھی کافی عرصے سے کر رہے ہیں۔“ رئیس الدین نے طاہر جواد کی طرف اشارہ کیا۔

طاہر جواد نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، میں خود حصے دار ہوں۔شاید میری لگائی ہوئی قیمت آپ لوگوں کو قبول نہ ہو۔اس لیے میں اپنے چند جاننے والے پراپرٹی ڈیلرز کے ذمہ یہ کام لگاتا ہوں کہ وہ یہ کوٹھی بیچ کر رقم ہمارے حوالے کر دیں۔"

"چلو یہ بھی صحیح ہے۔جونہی رقم وصول ہوئی تمام کو اپنا مقرر حصہ مل جائے گا۔" تبریز شاہ نے اس کی تائید کی اور باقیوں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

طاہر جواد نے کہا۔"ویسے میں نے اپنی کوٹھی اور شور روم کا تو سودا کر لیا ہے؟ آج میں اور ارشد کسی ہوٹل میں شفٹ ہو جائیں گے۔اور اسلم شکور کی کوٹھی کا حصہ وصول کرتے ہی میرا ارادہ تو کچھ عرصے کے لیے کراچی کو عارضی طور پر خیر باد کہنے کا ہے۔"

"ارادہ تو اپنا بھی یہی ہے؟" رئیسانی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"آپ لوگوں کو تو میرا خیال ہے کراچی چھوڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔میری تو مجبوری بن گئی ہے ورنہ میں نے بھی کہیں نہیں جانا تھا۔"

تبریز شاہ نے پوچھا۔"مجبوری کیسی یار"!

"بتایا تو تھا اس الو کی پٹھی اسوہ کی وجہ سے ایڈوانس جمع کرانے والے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔میں نے بڑی مشکل سے ان سے تین ماہ کی مہلت مانگی تھی کہ میں اس عرصے میں کہیں نہ کہیں سے ان کے لیے رقم کا بندوبست کر لوں گا۔آپ تمام بھی وہ رقم واپس کرنے کے حق میں نہیں ہو اب اس کے علاوہ اور کیا تدبیر کروں کہ ان میں سے چند جوشیلے جوان مجھے قاتلانہ حملے کی دھمکیاں بھی دے رہے ہیں۔"

"ارے یہ دھمکیاں گیدڑ بھبکیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔" شیخ رئیس الدین نے منہ بنا کر کہا۔

طاہر جواد صاف گوئی سے بولا۔ "مگر میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ یوں بھی میں کسی بھی دوسرے شہر میں جا کر کوئی اچھا کاروبار شروع کر سکتا ہوں۔"

"چلو جو آپ کی مرضی۔" شیخ رئیس الدین نے تکرار کی ضرورت محسوس نہیں تھی۔

"چلو آپ بھی اپنے جاننے والوں کے ذمہ یہ کام لگائیں۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں۔" رئیسانی نے اٹھتے ہوئے گویا بات ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

"ہم بھی اپنی سی کوشش کریں گے۔" باقی دونوں نے بھی رئیسانی کی طرح حامی بھری اور وہ تمام وہاں سے رخصت ہونے کے لیے رئیسانی کی تقلید میں کھڑے ہو گئے تھے۔

☆☆☆

مہ جبین سے گفتگو کیے اسے تین ماہ ہو چکے تھے۔ حیرت انگیز طور پر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اب کبھی کبھار ہی اس کی نظریں عمار کے سراپے سے الجھتیں ورنہ زیادہ تر وہ نگاہیں جھکائے اس کے احکامات نوٹ کرتی رہتی۔ عمار نے بھی اس کے ساتھ اپنا رویہ نارمل ہی رکھا تھا۔

اس دن وہ جونھی دفتر پہنچا کنسٹریکشن کمپنی میں اس کا حصے دار آفتاب احمد دو تین فائلیں پکڑے وہاں پہنچ گیا۔

"اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ!" اندر داخل ہوتے ہی اس نے خشوع و خضوع سے سلام کیا۔

"وعلیکم سلام، آئیں آفتاب بھائی!" عمار نے کھڑے ہو کر اس کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اور مصافحہ کرتے ساتھ ہی صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیں۔

"شکریہ۔" کہتے ہوئے اس نے نشست سنبھال لی۔

"ٹھنڈا یا گرم؟" عمار نے انٹر کام کا رسیور اٹھا کر پوچھا۔

"آپ میری پسند جانتے ہیں۔" آفتاب نے مسکرا کہا اور عمار، مہ جبین کو کافی کا بتانے لگا۔

"اب سنائیں آج کیسے بھول پڑے۔" رسیور رکھ کر عمار نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"پرسوں، نقیب احمد سے ملاقات ہوئی اس کے پاس دو ٹھیکے ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اس معاملے میں اس کے تعلقات کافی وسیع ہیں۔"

"جی، آپ بات کریں۔" عمار نے اثبات میں سر ہلا کر اسے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"وہ دو فلائی اوور اور پچاس کلو میٹر طویل روڈ کا ٹھیکا یوا ے کمپنی کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔"

"وہ خود کیوں نہیں کرا رہا یہ کام؟" عمار نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ دونوں ٹھیکوں میں سے کچھ منافع رکھ کر باقی خود کو ایک طرف کر رہا ہے۔"

"معذرت کر لو۔" عمار نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم کسی کے طفیلیے نہیں بن سکتے۔ اور محنت ہم کریں کریڈٹ وہ سنبھالے یہ مجھے منظور نہیں۔"

"ہمیں بچت سے غرض ہونا چاہیے۔" آفتاب نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اسی وقت مہ جبین نے آکر ان کے سامنے کافی کے کپ رکھے اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

"آفتاب بھائی!.... یو اے کمپنی کا ایک نام ہے۔ ہم صرف منافع کو دیکھتے رہے تو اپنی الگ پہچان نہیں بنا سکیں گے۔ آپ یہ معاہدہ نہ کریں بس خوب صورتی سے معذرت کر لیں۔"

"ٹھیک ہے سر!" آفتاب احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس کے علاوہ یہ ایک بڑے پلازے کی تعمیر کا ٹھیکا ہے۔" اس نے ایک دوسری فائل عمار کی طرف بڑھائی۔ اسلم خان صاحب ہیں کافی عرصہ پہلے ان کی کوٹھی کی تعمیر کی تھی اس وقت میں اپنی پہلی کمپنی کے ساتھ تھا۔ انھی دنوں اسلم خان صاحب واقفیت ہوئی اور کل ان سے اتفاقی طور پر ملاقات ہو گئی اور اس نے فوراََ پلازے کی تعمیر کا ٹھیکا میرے حوالے کر دیا۔"

"یہ سیٹھ اسلم شکور خان کی بات کر رہے ہیں نا آپ؟ جن کی ٹرانسپورٹ کمپنی بھی ہے؟"

"اسلم شکور۔" آفتاب احمد نے ایک لمحہ سوچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں سر!.... اس کا نام اسلم خان ہے اور اس کا ٹرانسپورٹ کا بزنس کوئی نہیں ہے۔"

"چلو میں یہ فائل آرام سے پڑھ کر آپ کو کال کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے پھر میں چلوں گا۔" آفتاب احمد کافی کا خالی کپ تپائی پر رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

عمار نے دروازے تک جا کر اسے رخصت کیا اور واپس آکر فائل کھول کر دیکھنے لگا۔ مگر اس سے فائل صحیح طریقے سے پڑھی نہ گئی اسلم کے نام کے ساتھ اس کے ذہن میں اسوہ اسلم شکور کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ فائل بند

کر کے اس نے رسیور اٹھا کر مہ جبین کو کنسٹریکشن کمپنی کے پراجیکٹ ڈائریکٹر اسد صدیقی کو بھیجنے کا کہا اور رسیور رکھ کر اسوہ کی یادوں سے لڑنے لگا۔

اجازت مانگ کر اسد صدیقی ''اسلام علیکم سر!....'' کہتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

سلام کا جواب دے کر اس نے آفتاب احمد سے لی ہوئی فائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسد!.... یہ فائل پڑھو اور مجھے تفصیلی رپورٹ بھجواو ؤ۔''

''ٹھیک ہے سر!'' وہ فائل لے کر واپس مڑ گیا۔

لیپ ٹاپ آف کر کے وہ اسوہ سے ملاقات کا سوچنے لگا۔ اتنا عرصہ گزر گیا تھا۔ اب کم از کم وہ اس حالت میں تھا کہ اس سے سر اٹھا کر بات تو کر سکتا تھا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد وہ اچانک ایک عزم لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دفتر سے برآمد ہوتا دیکھ کر مہ جبین کھڑی ہو گئی تھی۔

''مہ جبین!.... میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں اگر مجھے دیر ہو جائے تو آپ اپنے وقت پر چھٹی کر لینا۔''

''جی سر!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور عمار آفس سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کار اسوہ کے گھر کی جانب اڑی جا رہی تھی۔ اس کا دل مختلف قسم کے اندیشوں سے بھرا ہوا تھا۔

انسپکٹر راحیل کی بیوی سندس بہ ظاہر انھیں خوش دلی سے ملی تھی۔ اس کے دو ہی بچے تھے بیٹی نمرہ جو نہم کی طالبہ تھی اور بیٹا اخلاق جو فورتھ ایئر میں تھا۔ دونوں بچے سکول گئے ہوئے تھے۔ انسپکٹر راحیل نے انھیں، ان کی خواب گاہ دکھائی اور اجازت لے کر چلا گیا۔ وہ درمیانہ سا کمرہ تھا جس دو لوہے کی چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں ۔ان کا سامان بھی انسپکٹر راحیل نے کمرے میں لا کر رکھ دیا تھا۔ ایک دیوار میں کپڑوں کی الماری بنی ہوئی تھی

۔اسوہ بیگ کھول کر اپنے اور ماں کے کپڑے ہینگروں میں ڈال کر لٹکانے لگی۔نسرین بیگم خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔گھر چھوڑنے کے دکھ نے انھیں بات کرنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔اسوہ بھی اسی وجہ سے فوراً کام میں مشغول ہوگئی تھی تاکہ ذہن بٹا سکے۔اس کے فارغ ہونے تک سندس انھیں دوپہر کے کھانے کے لیے بلانے آگئی۔گو ماں بیٹی کو بالکل بھوک نہیں تھی مگر میزبان کی دعوت کو ٹھکرانا انھیں مناسب نہ لگا۔کھانا کھا کر وہ ڈرائینگ روم میں آکر باتوں میں مشغول ہوگئیں۔سندس کے سوالات نے پھر ان کے زخم ہرے کر دیے تھے۔اسوہ زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکی اور اٹھ کر کمرے میں آگئی۔پہلے وہ انسپکٹر راحیل کو کال کر کے دو تین اخبارات لانے کا بتانے لگی تھی کہ تاکہ نوکری کے کوئی اشتہارات دیکھ سکے۔کیونکہ وہ گھر میں فارغ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ماں بیٹی کا بینک بیلنس اتنا نہیں تھا کہ دو تین ماہ سے زیادہ ان کی ضروریات کا کفیل ہو سکتا۔مگر پھر اسے والد کے ایک دوست کا خیال آیا جو اس کے والد کے انتقال پر تعزیت کے لیے بھی ان کے گھر آیا تھا۔وہ اپنا وزٹنگ کارڈ اس کے پاس چھوڑ گیا تھا جو اس نے میز کی دراز میں رکھ چھوڑا تھا۔ابھی گھر سے آتے وقت وہ اپنے کمرے اس طرح کی چھوٹی موٹی تمام چیزیں لے کے آئی تھی۔وہ گھر سے لائے بیگوں کی تلاشی لینے لگی ۔جلد ہی اسے مطلوبہ وزٹنگ کارڈ مل گیا۔انور کمال نام تھا اس کا۔وزٹنگ کارڈ اپنے پرس میں رکھ کر اس نے صبح اس کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔اپنے چارپائی پر لیٹتے ہوئے اسے عجیب سا محسوس ہوا۔کہاں جہازی سائز کا بیڈ اور کہاں وہ لوہے کی مختصر سی چارپائی۔لیکن اب یہ اس کا مقدر تھا۔بلکہ یہ چارپائی بھی غنیمت تھی۔

"میر اعمار بھی تو اس قسم کی چارپائیوں پر سوتا رہا ہے۔"اس نے اپنے محبوب کی یاد سے دل کو بہلانا چاہا۔"شاید اب بھی اسی قسم کی چارپائیوں پر لیٹ رہا ہو۔"ایک امکانی سوچ اس کے دماغ میں ابھری جسے درخور اعتنانہ

سمجھتے ہوئے وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ”تو کیا وہ مجھے ہر صورت قبول ہے۔ اس کے ساتھ تو میں اب جھونپڑی میں بھی رہنے کو تیار ہوں۔“

”اور اگر وہ امیر ہو گیا ہو تو ایک مفلس قلاش لڑکی کو اپنا لے گا۔ ایک ایسی لڑکی کو جس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ جو مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اور کیا میں اس کا سامنا کر پاؤں گی۔ اگر اس نے میرے ساتھ وہی رویہ اپنا جو کبھی میں اس کے ساتھ اپنایا کرتی تھی۔ کیا پھر میں زندہ رہ پاؤں گی۔ کیا اس کے بعد بھی میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر تیار ہو جاؤں گی؟“ اور پھر یونہی عمار کی یادوں میں کھوئے ہوئے اسے نیند آ گئی۔

☆☆☆

عمار گیٹ کے سامنے کار روک کر نیچے اترا اور دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھا۔ اسے لگ رہا تھا گویا اس کا دل سینے کے پنجرے سے باہر آ گرے گا۔ لرزتے ہاتھ سے اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا، مگر اسے گھنٹی کی آواز سنائی نہ دی حالانکہ چوکیدار کا کمرہ گیٹ کے ساتھ ہی بنا تھا اور گھنٹی کو چوکیدار کے کمرے ہی میں بجنا چاہیے تھا۔

چند منٹ انتظار کے بعد اس نے لوہے کے مضبوط گیٹ کو کھٹکھٹایا۔ اس مرتبہ اسے کامیابی ہوئی تھی۔ ذیلی کھڑکی کھول کر ایک کرخت شکل موٹے تازے شخص نے باہر جھانکا۔ عمار کا قیمتی لباس اور شاندار کار دیکھ کر وہ باہر نکل آیا تھا۔

”جی؟“ جسامت کی طرح اس کی آواز بھی کافی بھاری تھی۔ لیکن عمار کے حلیے نے اس کے لہجے میں نرمی پیدا کر دی تھی۔

"مس اسوہ اسلم شکور سے ملنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے دل میں یہ اندیشہ ضرور جاگزیں تھا کہ شاید وہ اب مس کے بجائے مسز کے درجے پر فائز ہو چکی ہو مگر پھر بھی اس نے مس کہنا ہی پسند کیا تھا۔

"کون اسوہ بھائی صاحب!.... کوٹھی تو خالی پڑی ہے۔" چوکیدار کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"یہ اسلم شکور صاحب کا گھر نہیں ہے؟"

"شاید کبھی ہو؟" اس نے بے پرواہی سے کندھے اچکائے۔ "مگر اب تو یہ رئیسانی صاحب کی ملکیت ہے بلکہ وہ بھی اسے بیچنے کی کوشش میں ہیں۔"

"رئیسانی صاحب....؟" عمار نے اپنی یاداشت کو کھنگالا مگر یہ نام اس کے سامنے پہلی بار آ رہا تھا۔ "کیا ان کا رابطہ نمبر مل جائے گا؟"

"جی صاحب!" کہہ کر اس نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور عمار کو ایک نمبر نوٹ کروا دیا۔

نمبر ڈائل کر کے عمار نے موبائل فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو!" دوسری تیسری گھنٹی پر کال اٹینڈ کر لی گئی تھی۔

"رئیسانی صاحب بات کر رہے ہیں؟" وہ مستفسر ہوا۔

"جی فیروز خان رئیسانی ہی بات کر رہا ہوں، آپ کون؟"

"سر!.... میں عمار بشیر ہوں، کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟" رئیسانی نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"میں آپ کی اس کوٹھی کے سامنے کھڑا ہوں جو کبھی اسلم شکور صاحب کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ چوکیدار سے پتا چلا کہ آپ کوٹھی بیچنا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں بات کرنا تھی۔" عمار کو ایک دم بہانہ سوجھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے آجائیں؟" رئیسانی نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

عمار نے پوچھا۔ "اپنا پتا بتا دیجیے گا۔" جواباََ رئیسانی اسے اپنا پتا سمجھانے لگا۔

پتا سمجھنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کیا اور کار مطلوبہ پتے کی جانب موڑ دی۔ پون گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ رئیسانی کے سامنے بیٹھا تھا۔ تعارفی کلمات کے بعد رئیسانی مطلب کی بات پر آگیا تھا۔

"تو عمار بشیر صاحب آپ یہ کوٹھی خریدنا چاہتے ہیں۔"

"جی رئیسانی صاحب!.... مگر اس سے پہلے مجھے اسلم شکور صاحب کے بارے کچھ معلومات بھی درکار ہوں گی۔ یقیناً آپ کو علم ہو گا کہ کوٹھی بیچ کر وہ کہاں شفٹ ہوئے ہیں؟"

رئیسانی نے پوچھا۔ "کیا وہ آپ کے واقف کار تھے؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھیں؟" عمار نے گول مول جواب دیا۔ ورنہ حقیقت تو یہی تھی کہ اس نے کبھی اسلم شکور کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو بس اس کی بیٹی کو جانتا تھا اور روح کی گہرائیوں سے جانتا تھا۔ اسوہ ہی کی وجہ سے اس کا والد بھی اسے قابلِ احترام لگتا تھا۔

"آپ اچھے واقف کار ہیں کہ آپ کو علم نہیں ہے اس کے بارے؟" رئیسانی کے لہجے میں گہری حیرت پوشیدہ تھی۔

"وہ اصل میں اس کی بیٹی میری کلاس فیلو تھی.... خود اسلم شکور صاحب سے میری ذاتی واقفیت کوئی نہیں تھی ۔"اس مرتبہ عمار کو اپنی بات کی وضاحت کرنا پڑی۔

"ہونہہ !...."گہرا سانس لے کر رئیسانی چند لمحے سوچ میں ڈوبا رہا۔اور جب اس نے زبان کھولی تو بجائے حقیقت بیان کرنے وہ ایک جھوٹ گھڑ چکا تھا۔

"عمار صاحب !....مجھے نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو بتانا پڑ رہا ہے کہ اسلم شکور صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ان کی وفات کو تو اب چھے مہینے گزر گئے ہیں۔اور جہاں تک سوال ہے ان کی بیٹی اور بیوی کا تو اسلم شکور کی وفات کے تین چار ماہ بعد انھوں نے اپنی جائیداد اور کوٹھی وغیرہ بیچی اور بیرون ملک چلی گئیں۔مجھ سے اس وقت تو امریکہ جانے کی بات کر رہی تھیں غالباً وہاں ان کے کوئی رشتادار وغیرہ تھے۔البتہ بعد میں پروگرام تبدیل کر لیا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔انھیں پاکستان سے گئے ہوئے تقریباً مہینا ہونے کو ہے۔"

چونکہ اس مکار کو عمار کی آمد کی وجہ اسوہ ہی لگ رہی تھی۔اور عمار کی ظاہری حالت سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اچھا خاصا باحیثیت شخص تھا۔اسوہ کے ساتھ مل کر وہ ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا سلسلہ بھی شروع کر سکتا تھا۔اس خواہ مخواہ کے بکھیڑے سے بچنے کے لیے اسے یہی تدبیر سوجھی تھی کہ عمار کو غلط راہ پر ڈال دیا جائے ۔گو اسوہ اور اس کا اتفاقاً ٹکراؤ ہو جانا، ممکن تھا مگر کراچی جیسے وسیع و عریض شہر میں زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ ساری زندگی یونھی ایک دوسرے سے بے خبر گزار دیتے۔ایک بات تو اسے کنفرم تھی کہ اسوہ، عمار کی شخصیت سے بے خبر تھی ورنہ وہ بہت پہلے اس سے رابطہ کر چکی ہوتی۔اور جب عمار کی تلاش کو بھی وہ غلط سمت ڈال دیتا تو یقینا یہ مفت کی سر دردی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا تھی۔طاہر جواد اور اس کا بیٹا تو کراچی چھوڑ کر جا رہے تھے مگر انھوں نے تو یہیں رہنا تھا۔

"کیا اسوہ نے شادی کر لی ہے؟" عمار کے لہجے میں ہزار قسم کے اندیشے لہرا رہے تھے۔

"شادی........ نہیں شادی تو نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے منگنی ہوئی تھی جو بعد میں کسی وجہ سے ٹوٹ گئی اور ابھی امریکہ جانے کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ اسوہ کی ماں اس کی شادی وہاں کرنا چاہتی تھی۔" رئیسانی نے نپا تلا جواب دیا۔

"منگنی کیوں ٹوٹی تھی؟" عمار نے ایک اور سوال کیا۔

"عمار صاحب!.... میرا خیال ہے آپ صرف یہی معلومات لینے کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔" رئیسانی نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا مگر عمار کو اس میں موجود طنز صاف دکھائی دے گیا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" عمار نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اصل میں اسوہ میری کلاس فیلو تھی نا، اس وجہ سے اس کے بارے فطرتی کچھ کرید تو ہو گی۔ باقی اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو زبردستی تھوڑا کر سکتا ہوں میں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں میرے اسلم شکور کی فیملی کے ساتھ کوئی قریبی تعلق نہیں تھا۔ یہ تو جب مرحوم کی بیوہ نے کسی اور کے سامنے اپنی کوٹھی بیچنے کی بات کی تو، مجھے دلچسپی ہوئی اور میں اس سے ملنے چلا گیا۔ وہاں ماں کے ساتھ بیٹی بھی موجود تھی تبھی یہ تھوڑی بہت معلومات ان سے حاصل ہوئیں۔"

"شکریہ سر!" عمار نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا جو ملازم ان کے سامنے رکھ گیا تھا۔

"اب میرا خیال ہے کوٹھی کی بات ہو جائے؟" رئیسانی نے گہری نظروں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ اس کا اندازہ تھا کہ عمار کو کوٹھی خریدنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور وہ بس اسوہ کے بارے معلومات لینے آیا تھا۔

"ضرور۔" عمار خوش دلی سے بولا۔ "آپ قیمت بتائیں۔"

جواباً رئیسانی نے ایک مناسب قیمت بتادی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ عمار کیسے انکار کرتا ہے۔

"مزید گنجائش ہو سکتی ہے؟" وہ قیمت سن کر ایک دم عمار کو کوٹھی خریدنے سے دلچسپی ہو گئی تھی۔

"پہلے ہی اتنی مناسب قیمت بتائی ہے۔ آپ چند لاکھ اور گھٹا دیں۔"

عمار ہنسا۔ "کروڑوں کی قیمت میں چند لاکھ نہیں گھٹائے جاتے۔"

"چلو ایک کروڑ کم کر لینا۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کوٹھی کے اندر موجود سامان جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ ماں بیٹی نے سامان سمیت کوٹھی میرے حوالے کی تھی۔ اور اتنا تو آپ جانتے ہوں گے کہ اس سامان کی قیمت بھی کروڑ کے ہندسے کو تو چھو لے گی۔" رئیسانی نے اسے مزید ترغیب دی۔

اس مرتبہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر عمار موبائل فون نکال کر اکاؤنٹ آفیسر سے بات کرنے لگا۔

"یس سر!" اکاونٹ آفیسر لیاقت سلیم نے کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"سلیم!.... اپنے تینوں اکاؤنٹس میں کتنے پیسے ہوں گے؟"

جواباً سلیم اسے تینوں اکاؤنٹس کی تفصیلات بتانے لگا۔

"ٹھیک ہے شکریہ۔" کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کیا اور انوار الحق کا نمبر ملانے لگا۔

"جی سر!...." انوار الحق اس کے منع کرنے کے باوجود اسے سر کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا۔

”انوار بھائی!.... آپ کے پاس اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہو گی؟“

”کافی ہے آپ حکم کریں۔“اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

”دو کروڑ ہو جائے گی؟“

انوار الحق نے جواب دیا۔”آرام سے۔“

”ٹھیک ہے، مجھے چند ماہ کے لیے دو کروڑ چاہیے ہوں گے۔“

”شرمندہ تو نہ کریں۔“انوار الحق نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔”آپ یہ بتائیں کس وقت چاہیے۔“

”شکریہ انوار بھائی!....بس اکاؤنٹ آفیسر سے مل کر میرے ذاتی اکاؤنٹ میں منتقل کرا دیں۔“

”ٹھیک ہے مل لیتا ہوں۔“اور انوار الحق سے بات ختم کرنے کے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”رئیسانی صاحب!....کل میرا وکیل یہیں آجائے گا۔ آپ بتائیں رقم کیش چاہیے یا چیک؟“

”کیا مطلب؟“رئیسانی نے حیرانی سے پوچھا۔اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جسے وہ مذاق سمجھ رہا تھا وہ حقیقت نکلے گی۔

”مطلب یہ کہ مجھے یہ سودا منظور ہے۔کل میرا وکیل آپ کے پاس آجائے گا اور میں کل ہی وہاں شفٹ ہونا چاہوں گا۔باقی کی کاغذی کارروائی مکمل ہوتی رہے گی۔“

”بالکل ٹھیک ہے، رئیسانی کے چہرے پر خوش گوار حیرت ظاہر ہوئی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ اسی کوٹھی کو بیچنے کی فکر میں تھے۔اتنی آسانی سے اس کا سودا ہو جانا اس کے لیے حیران کن تھا۔مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسوہ کی

عمار کی زندگی میں کیا اہمیت تھی۔ اور پھر اس کوٹھی سے اسوہ کی یادیں وابستہ تھیں اب تو اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اسوہ لوگ تمام سامان اسی طرح چھوڑ گئے تھے۔ گویا اسوہ سے جڑی کئی چیزیں اسے ملنے والی تھیں ۔ کوٹھی خریدنے کے لیے اس نے اپنے اکاؤنٹ کے خالی ہونے کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ بلکہ دو کروڑ قرض بھی لے لیا تھا۔ مگر اب اس کا کاروبار جس نہج پر جاری تھا یہ رقم اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

وہ رئیسانی سے ہاتھ ملا کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ اپنے دفتر کی طرف تھا۔

☆☆☆

اسوہ کو انور کمال کا دفتر تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ وہاں تک آنے کے لیے اسے رکشا لینا پڑا تھا اور رکشے کا سفر اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ دفتر تک پہنچتے پہنچتے اس کا سر درد کرنے لگ گیا تھا۔ گو پہلے اس کا ارادہ ٹیکسی لینے کا ہوا تھا مگر پھر یہ سوچ اسے رکشے میں بیٹھنے پر مجبور کر گئی کہ ابھی اسے اس طرز زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا تھا۔ اب وہ سیٹھ اسلم شکور کی بیٹی نہیں ایک یتیم بے گھر اور بے آسرا لڑکی تھی جو پرائے در پر پڑی تھی۔

چوکیدار نے اسے دفتر میں کام کرنے والی کوئی لڑکی سمجھا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے ایک خاتون سے کمپنی کے مالک کے دفتر کی جگہ معلوم کی اسی جانب بڑھ گئی کمپنی مالک کے آفس کے باہر ایک قبول صورت لڑکی بیٹھی تھی جو یقیناً سیکرٹری تھی۔

”مس!.... مجھے انور کمال صاحب سے ملنا ہے۔“

لیڈی سیکرٹری نے کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔"انور کمال صاحب تو آپ کو گھر پر ملیں گے
۔"

اسوہ نے پوچھا۔"وہ دفتر کیوں نہیں آئے؟"

"وہ تو پچھلے دوماہ سے دفتر نہیں آرہے۔اب سارا کام ان کا بیٹا آفاق انور صاحب دیکھتا ہے۔"لیڈی سیکرٹری نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تو پھر آفاق صاحب ہی سے ملوا دیں۔"اس نے سوچا کہ جب آ ہی گئی تھی تو آفاق صاحب سے ملنے میں بھی مضائقہ نہیں تھا۔

"جی آپ بیٹھیں میں انھیں اطلاع کرتی ہوں۔"سامنے پڑی آرام دہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے انٹر کام کا رسیور اٹھا لیا۔

"آپ کا نام؟"باس کا نمبر ڈائل کرنے سے پہلے اس نے اسوہ سے دریافت کیا۔

"اسوہ....اسوہ اسلم شکور۔"

"سر!....کوئی مس اسوہ اسلم شکور آپ سے ملاقات کی خواہش مند ہیں۔"

اور پھر دوسری جانب کی بات سن کر اس نے۔ "ٹھیک ہے سر!" کہتے ہوئے رسیور رکھ دیا۔

"جائیں میڈم!.... آفاق صاحب کے آپ کے منتظر ہیں۔"

"شکریہ۔" کہہ کر وہ دفتر کی طرف بڑھ گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے ایک جواں سال شخص ریوالونگ چیئر پر بیٹھا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولا۔

"آئیں مس!.... پلیز بیٹھیں۔" اس نے اسوہ کو سلام کہنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ شاید مجھے نہیں جانتیں مگر میں غائبانہ آپ سے واقف ہوں۔ آپ کے والد صاحب مرحوم کے ابو جان سے اچھے تعلقات تھے۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے بہت اعلا پائے کے کاروباری شخصیت تھے۔ جانے کیوں ایک دم انھوں نے کاروبار سے کنارہ کشی اختیار کر کے کسی ہاؤسنگ سکیم کے پیچھے پڑ گئے۔"

"جی سر!" اسوہ کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کا باپ جس مقام پر تھا اس کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ اسے کسی جاب کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور آج مقدر اسے یہ دن بھی دکھا رہا تھا کہ وہ جن کے برابر بلکہ جن سے کئی درجہ بلند تھی اب ان کی ملازم بننے والی تھی۔

"اچھا سوری آپ سے پوچھ ہی نہیں پایا کہ آپ چائے لیں گی یا کافی۔" اچانک خیال آنے پر آفاق اس سے معذرت کرنے لگا۔

"شکریہ سر!" اسوہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اس کی بن بلائی مہمان تھی۔ بلکہ اپنے لیے اسے مہمان کا لفظ بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

"یہ آپ کیا بار بار سر کہہ کر شرمندہ کر رہی ہیں۔ میرا نام آفاق ہے۔ اور میرا خیال ہے کولڈ ڈرنک منگوا لیتا ہوں۔" اس کے انکار سے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتے ہوئے آفاق نے انٹر کام کے رسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"سر!.... پلیز رہنے دیں میں آپ کے پاس کسی کام کی غرض سے آئی تھی۔" اسوہ فوری مطلب کی بات پر آ گئی کہ وہ آفاق کو غلط فہمی سے نکال دینا چاہتی تھی۔

"جی بولیں۔" اس نے اٹھایا ہوا رسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

"سر!.... مجھے نوکری چاہیے۔" اس نے بہ مشکل فقرہ ادا کیا۔

"کیا....؟؟؟" وہ حیرانی سے اچھل پڑا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"سر!....مجھے نوکری چاہیے۔یہ میری CV اور تعلیمی اسناد ہیں۔"اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کے سامنے رکھ دی۔

"آپ اسوہ اسلم شکور خان صاحب ہی ہیں نا؟"آفاق نے حیرانی کے عالم میں پوچھا تھا۔

"سر!....اسلم شکور خان میرے ابو جان ہی تھے۔لیکن یقیناً آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہو گی کہ انتقال سے پہلے ہی ابو جان چند ظالموں کے فراڈ کا شکار ہو کر اپنے سارے اثاثے ساری جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔اور آج اس کی بیٹی ہونے کا شرف رکھنے کے باوجود مجھے نوکری کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"ہونہہ!...."ایک گہرا سانس لے کر آفاق نے کرسی سے ٹیک لگائی چند لمحے وہ سوچتا رہا اور پھر سیدھا ہو کر کہنے لگا۔"تو اس سلسلے میں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"اس دفعہ اس کے لہجے میں پہلے والی مروت، اخلاق اور مٹھاس غائب تھی۔

"سر!....بتایا تو ہے نوکری کے حصول کے سلسلے میں زحمت دینے آئی تھی۔"

آفاق نے اس کی فائل کھول کر سرسری نظر اس کی CV پر ڈالی۔اور پھر اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"سوری اس کمپنی میں آپ کی تعلمی استعداد کے مطابق تو کوئی ویکنسی خالی نہیں ہے۔"

"سر!....مجھے انکل انور کمال نے کہا تھا کہ مجھے کوئی کام وغیرہ ہو تو وہ کر دیں گے۔"

دیکھیں مس اسوہ!....ابو جان نے اگر آپ سے کوئی وعدہ کیا تھا تو یہ ان کا اور آپ کا ذاتی معاملہ ہے وہ قریباً مہینا بھر سے کاروبار سے بالکل لاتعلق ہو گئے ہیں۔اب سب کچھ میں دیکھ رہا ہوں اور میرے پاس آپ کے لیے زیادہ سے زیادہ پرسنل سیکرٹری ہی کی سیٹ خالی ہو گی۔"

"سس.... سیکرٹری۔"اس نے بہ مشکل اٹکتے ہوئے وہ لفظ ادا کیا۔

"جی....البتہ یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ جیسے ہی کوئی بہتر پوسٹ خالی ہوئی آپ کو وہاں ترقی دے دوں گا۔"

اسوہ نے سوچنے کے انداز میں سر جھکا لیا۔وہ ایم بی اے تھی اس کا خاص شعبہ مارکیٹنگ تھا اور اسے لیڈی سیکرٹری کی سیٹ دی جارہی تھی۔

"سر کتنے عرصے تک کوئی سیٹ خالی ہو جائے گی۔"چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"دیکھو یہ مجھے واضح نہیں ہے۔ابھی میرے پاس اسسٹنٹ مارکیٹنگ منیجر کے ہیلپر کی ویکنسی بھی موجود ہے ٹائپسٹ کی پوسٹ بھی خالی ہے مگر وہاں آپ کی ترقی کا چانس بہت کم ہو گا کیوں کہ اس سیٹ پر کوئی بڑی مشکل سے آپ کو آگے بڑھنے کو موقع دے گا۔اور پھر وہاں آپ کی تنخواہ بھی کم ہو گی۔میری پرسنل سیکرٹری بننے کی صورت میں جو نھی۔مارکیٹنگ ایم ڈی یا اکاؤنٹ آفیسر وغیرہ کی پوسٹ خالی ہوئی میں آپ کا ٹرانسفر اس پوسٹ پر کر دوں گا۔اور یہاں آپ کی تنخواہ بھی وہاں سے زیادہ ہو گی۔"

اس نے ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے پوچھا۔"کتنی تنخواہ ملے گی؟"

"بیس ہزار۔" آفاق نے بغیر ایک لمحہ سوچے جواب دیا۔شاید وہ پہلے سے طے کیے بیٹھا تھا۔"یہ پیش کش بھی میں آپ کی ماسٹر کی ڈگری کو دیکھ کر دے رہا ہوں اور ٹائپسٹ کی سیٹ پر آپ کو پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے۔"

اسوہ کا جی چاہا کہ زوردار قہقہہ لگائے۔اس وقت اس نے پاؤں میں جو جوتے پہنے ہوئے تھے ان کی قیمت بھی اس بتائی گئی تنخواہ سے زیادہ تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ تلخ سوچ اس کے دماغ میں گھومی کہ وہ بھلے وقتوں میں خریدے گئے تھے۔اس وقت تو وہ کئی لاکھ کی ائر کنڈیشنڈ گاڑی میں بھی سفر کرتی تھی اور آج اسے رکشے میں سفر کرنا پڑ گیا تھا۔اس رکشے کا خرچا بھی جانے وہ کب تک برداشت کر پاتی۔یقیناً جلد یا بدیر اسے بسوں میں خوار ہونا تھا۔

"شاید آپ کو تنخواہ سن کر مایوسی کا شکار ہو گئی ہیں۔"اس کے چہرے کے تاثرات سے آفاق کو اس کی کیفیت کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"سر!....میں اس بارے کچھ کہہ نہیں سکتی۔پہلی بار یہ تجربہ ہو رہا ہے۔بہ ہر حال ٹھیک ہے۔" اسوہ نے بادل نخواستہ حامی بھر لی۔یوں بھی وہ گھر میں فارغ نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔اور پھر اس نوکری کے ساتھ ساتھ وہ بہتر نوکری کی تلاش جاری رکھ سکتی تھی۔اسے امید تھی کہ جلد ہی وہ کوئی بہتر نوکری تلاش کر لے گی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے یہیں کوئی بہتر پوسٹ مل جاتی۔یوں بھی وطن عزیز میں بے روزگاری کی صورت حال کے بارے آئے روز ہونے والی خبریں اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھیں۔

"تو پھر تم کب سے کام پر آ رہی ہو؟" اس مرتبہ آفاق اپنے لہجے میں چھپا اشتیاق نہیں چھپا سکا تھا۔ اسوہ کی طرح کی پرسنل سیکرٹری کا تصور اس نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا اور وہ اسے حقیقت میں مل گئی تھی۔ اور اس کی ہاں کو دیکھتے ہی وہ آپ سے تم کہنے پر اتر آیا تھا۔ یقیناً باس اپنی سیکرٹری کو آپ کہہ کر مخاطب کرنے سے رہا۔

"کل سے۔" اسوہ نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

"گڈ۔" آفاق نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے سر!.... اب میں چلوں گی۔" اسوہ کا انداز اجازت مانگنے والا نہیں تھا۔

"ایک منٹ بیٹھو۔" آفاق کو اس کے بات کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

اسوہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"مس اسوہ!.... ایک بات یاد رکھنا۔ تم ماضی میں جو بھی تھیں وہ ماضی ختم ہوا۔ اب حال کو دیکھو اور جس طبقے میں آ گئی ہو اس کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرو۔ شاید میری باتیں تمھیں بری لگ رہی ہوں مگر یہ حقیقت ہیں۔"

"آپ نے صحیح کہا سر!.... مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے؟ آپ نے جو حقیقت بیان کی ہے مجھے اس سے انکار تو نہیں ہے۔"

"ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اور میں نے یہ اس لیے کہا کہ تم نے مجھے اپنے جانے کی اطلاع دی اور اپنے باس کو اطلاع نہیں دی جاتی اجازت مانگی جاتی ہے۔ تمھیں کہنا چاہیے تھا کہ سر اگر اجازت ہو تو میں چلی جاوں؟"

"سوری سر!...." اسوہ کو شدت سے توہین کا احساس ہوا تھا مگر وہ کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھی۔ بدمزگی پھیلانے کے بجائے اس نے سمجھوتہ کر لینا ضروری سمجھا۔ "آئندہ خیال رکھوں گی سر"!

"ٹھیک ہے، ابھی آپ جائیں اور کل آکر کرن سے یہ کام سیکھنا شروع کر دو۔ دو دنوں کے بعد وہ اپنی سیٹ پر واپس چلی جائے گی۔ اسے میں نے عارضی طور پر پرسنل سیکرٹری کی جگہ بٹھایا تھا۔"

"جی سر!" کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اور سر جھکائے ہوئے وہاں سے نکل آئی۔ اس کی انا اور خودداری عجیب کش مکش کی زد میں تھی۔ اگر اس کے والد کے جاننے والوں کا اس کے ساتھ یہ رویہ تھا تو جانے ان جان لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ وہ آنکھوں کی نمی کو بہنے سے روکنے کی تگ و دو کرتی کمپنی آفس سے باہر نکل آئی۔

اسوہ کے دفتر سے نکلتے ہی آفاق نے اپنی لیڈی سکرٹری کو بلوا لیا تھا۔

"کرن!.... کل سے یہ لڑکی اسوہ میری پرسنل سیکرٹری کی جگہ سنبھالے گی۔ تم نے دو دن تک اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے مکمل کام سمجھا دینا ہے۔"

"جج.... جی سر۔" کرن گڑبڑا گئی تھی۔

"اور تم نے خود اسسٹنٹ اکاؤنٹ آفیسر کے ہیلپر کے طور پر اپنا کام سنبھال لینا ہے۔ اور فکر نہ کرو تمھاری تنخواہ یہی رہے گی جو سکرٹری کے طور پر تھی۔"

"جی سر!" کرن نے اس مرتبہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسے سر کے اشارے سے جانے کا اشارہ کر کے آفاق نے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر دیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اسوہ کا ملیح چہرہ گھوم رہا تھا۔ جانے کیوں اس وقت اسے اپنی بیوی بہت بری محسوس ہو رہی تھی۔

"مجھے اتنی جلد شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اسوہ انسپکٹر راحیل کے مکان کے سامنے رکشا رکوا کر اتر گئی۔ رکشے والے نے اس سے سو روپیا کرایہ لیا تھا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ دماغی طور پر یہی حساب کرتی رہی کہ روزانہ آنے جانے کا دو سو کرایہ ادا کرنے پر مہینا بھر میں چھے ہزار روپیا تو کرایہ بن رہا تھا۔ بیس ہزار سے چھے ہزار کرایہ کی مد میں ادا کر کے بقایا تنخواہ چودہ ہزار بچتی تھی اور چودہ ہزار میں بھی اس نے دفتر میں رہتے ہوئے چائے وغیرہ تو پینا تھی۔ اس کے بھی اگر چار ہزار منہا کر دیے جاتے تو ماں بیٹی کو دس ہزار روپے پر گھر چلانا پڑتا۔ دس ہزار میں گھر کا کرایہ ادا کر کے بقیہ مہینا گزارنا یقینا جان جوکھوں کا کام تھا۔ پہلے اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ نوکری ملتے ہی انسپکٹر راحیل کو کہے گی کہ ان کے لیے کوئی کرایے کا گھر ڈھونڈے مگر تنخواہ کی صورت حال دیکھ کر اس کی ساری خوش فہمی ہوا بن گئی تھی۔

"آ گئی ہو بیٹی!" ماں شدت سے اس کی منتظر تھی۔

"جی ماں جی!...." اس نے لہجے میں خوش دلی سمونے کی کوشش کی جو بہر حال اتنی نا کم نہیں گئی تھی۔

"کیا ہوا نوکری کا؟"

وہ ہنسی۔ "نوکری تو مل گئی ماں۔"

نسرین خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”مجھے پتا تھا کہ میری بیٹی ناکام نہیں لوٹے گی۔“

”صحیح کہاماں جی!“ کہہ کر وہ اپنی چارپائی پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگی۔

”بیٹی کھانا کھالیا ہے؟“

”نہیں ماں جی بس تازہ دم ہو کر کھاتی ہوں۔“ کہہ کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ہاتھ منہ دھو کر وہ باہر نکلی تو اس کی ماں کھانے کی ٹرے وہیں کمرے میں لے آئی تھی۔

”ماں جی!.... آپ نے کیوں زحمت کی۔“

”اس میں زحمت کی کیا بات ہے؟“ نسرین نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں وہیں جا کر کھالیتی۔“ کہہ کر وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔چنے کی دال بنی ہوئی تھی۔ صبح ناشتا کر کے وہ گھر سے نکلی تھی۔اس وقت اسے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔وہ رغبت سے دال کو جڑ گئی۔نسرین دکھی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگی۔یہ وہی اسوہ تھی جسے کوئی کھانا پسند ہی نہیں آتا تھا۔کھانا بنانے والی ماسی کو ہمیشہ اس کی وجہ سے تین چار قسم کے کھانے تیار کرنا پڑتے تھے۔کیونکہ اسوہ سے کچھ بعید نہیں ہوتا تھا کہ چکن کی پلیٹ سے دو نوالے لے کر کہہ دے مجھے تو سبزی کھانا ہے۔یا مٹن کے سالن کو ایک جانب ہٹا کر بریانی کا تقاضا شروع کر دے۔ صبح ناشتے میں بھی کبھی اسے ہاف فرائی انڈہ چاہیے ہوتا تھا تو کبھی انڈہ خاگینہ اور کبھی آملیٹ۔ماسی بے چاری کو اس کے لیے یہ سب تیار کرنا پڑتا اور وہ ان میں سے کسی کو بھی ہاتھ لگائے بغیر توس پر شہد لگا کر کھانے لگتی۔وہی اسوہ آج دال بھی بہت رغبت سے کھا رہی تھی۔بلکہ اسلم شکور کی وفات کے بعد سے اس کی یہی حالت تھی۔

"کیا ہوا اماں جی!" نوالہ چباتے ہوئے اسوہ کی نظر ماں کی غمگین صورت پر پڑی اور وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ماں جی!.... حالات سب سکھا دیتے ہیں۔ وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ بیٹیاں نخرے اور لاڈ تب تک کرتی ہیں جب تک باپ کے پاس ہوتی ہیں۔"

"اچھا تم نے بتایا نہیں پہلی تنخواہ سے اپنی ماں کے لیے کیا لاؤ گی؟" نسرین نے صفائی سے موضوع بدلا۔ کیونکہ ماضی کی یاد کرب ہی ساتھ لاتی ہے۔ اور پھر بچھڑوں ہوؤں کو یاد کرنا بھی آنسوؤں کی سوغات کے علاوہ کچھ نہیں دے پاتا۔

"کون سی تنخواہ کی بات ہو رہی ہے بھئی؟" سندس نے اندر آتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"آئیں آنٹی۔" اسوہ ہولے سے مسکرائی۔ جبکہ نسرین فخریہ لہجے میں بتانے لگی۔

"اسوہ بیٹی نے نوکری کر لی ہے نا تو اسی وجہ سے اسے چھیڑ رہی تھی۔"

"ہاں یہ تو بہت اچھا کیا۔" وہ اس کی ماں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "فضول گھر میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ اس طرح کم از کم کسی کی محتاج تو نہیں ہو گی۔"

"صحیح کہا بہن۔" نسرین نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"اچھا اسوہ!.... میں ایک درخواست لے کر آئی تھی۔" سندس کھانا کھاتی اسوہ کو مخاطب ہوئی۔

"جی آنٹی!.... حکم کریں؟" اسوہ سندس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"نمرہ بیٹی ریاضی کے مضمون میں ذرا کمزور ہے۔ گو اس کی ٹیوشن تو لگوائی ہوئی ہے لیکن اگر رات کو گھنٹا ایک آپ بھی اسے پڑھا دیا کریں۔"

"کیوں نہیں آنٹی!" وہ خوش دلی سے بولی۔

"شکریہ۔" سندس نے خوش ہو کر کہا۔ "اور اس وقت اخلاق بیٹا بھی اپنا سبق یاد کرتا ہے اگر اسے بھی کوئی مشکل پیش آئے تو یقینا آپ اس کی مدد بھی کر دیا کریں گی؟"

"ضرور۔" اسوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ فارغ بیٹھنے کے بجائے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہے تاکہ اذیت ناک یادوں سے چھٹکارا پا سکے۔

☆☆☆

عمار کاغذی کارروائی مکمل ہونے سے پہلے ہی نئی کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا۔ بشیر صاحب کو وہ کوٹھی دیکھ کر کافی حیرانی ہوئی تھی۔

"ویسے برخوردار!.... کب سے اتنے عیاش ہو گئے ہو؟" کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہی بشیر احمد نے پوچھا۔

"ابو جان!.... یہ کوٹھی مرحوم اسلم شکور خان کی ہے۔" عمار باپ کی جانب جھک کر رازداری کے انداز میں بولا تاکہ عقبی نشست پر بیٹھی اس کی ماں نہ سن لے۔

"مرحوم اسلم شکور خان۔ یہ بھلا کون ذات شریف تھے کہ اس کے مرحوم ہونے کے بعد اس کا تعارف کرایا جا رہا ہے؟"

"آپ کو بتایا تو تھا۔" عمار نے حیرانی سے کہتے ہوئے اپنی کار گیراج میں کھڑی کر دی۔

"کب؟" بشیر احمد کو یاد نہیں آ رہا تھا۔

"اچھا بعد میں بتاتا ہوں۔ اس وقت خواتین کی موجودی میں اچھا نہیں لگ رہا۔ کار سے باہر نکل کر اس نے جلدی سے پیچھے جا کر ماں کے لیے بھی دروازہ کھول دیا۔

"خواتین نہیں، اکیلی خاتون ہیں اور وہ بھی تمھاری امی جان ہیں۔" بشیر احمد نے اسے شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"اسی لیے تو خواتین کہا ہے کہ ایک امی جان میں کئی خواتین کے برابر خوبیاں ہیں۔"

"تم نہیں پھنسو گے۔" بشیر احمد نے مسکرا کر کہا۔ سکینہ عمار کا اشارہ پا کر آگے بڑھ گئی تھی۔ بشیر احمد بیٹے کے قریب پہنچ کر سرگوشی میں بولا۔ "تمھیں اسوہ بی بی ہی آ کر نکیل ڈالے گی پتر"!

"ابو جان!.... یہ اسی کی کوٹھی ہے۔" اس نے بھی والد کی طرح سرگوشی ہی میں جواب دیا تھا۔

"اوہ.... تو یہ بات ہے۔" بشیر احمد نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔

"جی ابو جان!.... کوٹھی خرید لی ہے ان شاء اللہ جلد ہی کوٹھی والی بھی مل جائے گی۔" لیکن یہ کہتے ہی وہ اداس ہو گیا تھا کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق وہ امریکہ جا چکی تھی۔ نامعلوم کب اس کی واپسی ہوتی تھی۔ لیکن اتنا اسے یقین تھا کہ وہ پاکستان واپس آ کر ایک مرتبہ تو ضرور اپنی کوٹھی دیکھنا چاہے گی اور اس وقت عمار اس سے مل سکتا تھا۔

"ہونہہ!....یہ امیدیں کسی اور کو دلاؤ۔" اس مرتبہ بشیر احمد کا لہجہ حقیقی ناراضی کا گہرا اثر لیے ہوئے تھا۔

"امی جان کو ٹھی پسند آئی کہ نہیں؟" عمار قدموں کی رفتا تیز کر کے ماں کے قریب ہو گیا۔اس کا انداز دیکھ کر بشیر احمد کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر وہ اپنے چہرے سے دکھ بھرے اثرات نہیں مٹا سکا تھا۔

"اتنی بڑی کوٹھی کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی بیٹا!....پہلے والی کوٹھی بھی اتنی بڑی تھی۔" اس قناعت پسند عورت کو اتنی وسیع کوٹھی میں آکر عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

"ضرورت تھی تو خریدی ہے ناماں جی!....اور آئیں آپ کو آپ کا کمرہ دکھاؤں۔" وہ ماں باپ کو لے کر ان کی خواب گاہ میں دھکیل کر خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ایک دن پہلے آکر مکمل کوٹھی کا جائزہ لے گیا تھا۔اتنی بڑی کوٹھی میں صرف دو کمرے ہی زیر استعمال رہ چکے تھے۔ایک اسوہ کی خواب گاہ تھی اور دوسری اس کے والدین کی۔اسوہ کی خواب اس نے اپنے لیے پسند کی تھی جبکہ والدین کے لیے اس نے ایک نئی خواب گاہ کا انتخاب کیا تھا۔اسوہ کے والدین والا کمرہ اس نے ٹ تالا کر دیا تھا۔اسوہ کے کمرے کو اس نے اس کی الماری میں لٹکے ایک دو تین کپڑوں کے جوڑوں سے پہچانا تھا۔اسی طرح اس کمرے میں اسے چند پرانے جوتوں کے جوڑے بھی بوٹ ریکس میں ملے تھے جو وہ یونیورسٹی کے دنوں میں اسوہ کے پاو□ ں میں دیکھ چکا تھا۔اس کمرے کی فضا نے اسے مدہوش سا کر دیا تھا۔یہ وہی کمرہ تو تھا جو اس کی جانِ حیات کا رازداں تھا۔اس کے ذہن میں احمد فراز کے اشعار گونجے اور وہ انھیں زیر لب گنگنانے لگا۔۔۔

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے

کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت

مکیں ادھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں

چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے

کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

اور خوش قسمتی سے وہ ابھی انھیں دیوار و در کے بیچ میں تھا۔اسوہ کے پرانے لباس تو گویا اس کے لیے کسی خزانے سے کم نہیں تھے۔اور پھر جیسے ہی وہ اس خوب صورت وسیع و عریض بیڈ پر لیٹا اسے بے پایاں سکون کا احساس ہوا۔وہ بٹوے سے اس کی ہنستی مسکراتی تصویر نکال کر دیکھنے لگا۔وہ تصویر آٹھ سال پرانی تھی۔"جانے اب وہ کیسی ہو گی؟" وہ تصور کی آنکھ میں اس کی موہنی شکل کو لانے لگا۔

اسوہ کا آج تیسرا دن تھا دفتر میں۔پہلے دو دن کرن اس کے ساتھ رہ کر اس کی مکمل رہنمائی کرتی رہی تھی۔آج وہ اکیلی تھی۔صبح صبح ہی آفاق صاحب اس پر بگڑ گئے تھے۔

"میڈم اسوہ!.... صفائی دیکھی ہے آفس کی۔ اتنی گرد پڑی ہے ہر چیز پر، حالانکہ تمھارا کام بنتا ہے کہ خاکروب سے اچھی طرح صفائی کرالیا کرو۔"

"جج.... جی سر!" وہ محجوب سی ہو گئی تھی۔

"دیکھو دو دن میں نے اسی وجہ سے کرن کو تمھارے ساتھ مددگار کے طور پر رکھا تاکہ تم اچھی طرح یہ سیکھ جاو□ ۔ بہ ہر حال آئندہ خیال رکھنا۔" آفاق نے قدرے بے زاری سے کہا۔

اسوہ نے اس بار خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ اور میرے لیے کافی کا ایک کپ بھجوادو۔"

اسوہ سر ہلاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کسی کی ماتحتی میں رہ کر کام کرنا اپنی خودداری اور انا پر مصلحت کے پردے ڈال کر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ بھی مصلحت کرنا سیکھ گئی تھی۔ غربت اور تنگ دستی بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ یتیم بے آسرا لڑکی خود کو بہت تنہا اکیلا اور بے بس محسوس کرتی ہے۔ اور یہی کیفیات اس پر بھی گزر رہی تھیں۔

انٹر کام پر کافی کا بتا کر وہ پریشان سی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے وہاں کام کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آفس بوائے نے کافی کا مگ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

اس نے کہا۔ "آفاق صاحب کو دے آو□ ۔" اور لڑکا سر ہلاتا ہوا آفاق کے دفتر میں گھس گیا۔ وہ لڑکا بہ مشکل ہی اندر جا پایا ہو گا کہ فوراً انٹر کام بجنے لگا۔

"جی سر!" اس نے کال رسیو کی۔

"میرے پاس آؤ۔" کہہ کر آفاق نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ بے زاری سے سر ہلاتے ہوئے اس کے دفتر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا اندر داخل ہونا اور آفس بوائے کا باہر نکلنا اکھٹے ہوا تھا۔

"مس اسوہ!.... تمھارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

"کک.... کیا ہوا سر!" وہ گھبرا گئی تھی۔

"کیا تمھیں کرن نے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے دفتر میں کافی پیش کرنا تمھاری ذمہ داری ہے۔"

"سس.... سوری سر!.... یاد نہیں رہا تھا۔"

"میں نے پہلے ہی دن تمھیں بتا دیا تھا کہ اپنے ماضی سے باہر نکل آؤ۔ اگر پرسنل سیکرٹری کی سیٹ پر تم سے کام نہیں ہو رہا تو کسی شعبے کی ایم ڈی کیسے بن پاؤ گی؟"

"آئندہ خیال رکھوں گی سر"!

"بہتر یہی ہو گا۔" کر آفاق نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور وہ لہولہان احساسات لیے اس کے دفتر سے نکل آئی۔ تازہ اخبار آفس بوائے اس کی ٹیبل پر رکھ گیا تھا وہ بے تابی سے اشتہارات کا صفحہ نکال کر دیکھنے لگی۔ مگر اسے اپنی ڈگری کے مطابق کسی نوکری کا اشتہار نظر نہ آیا۔ دفتر اوقات ختم ہونے تک آفاق اسے کئی بار ٹوک چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔ مگر یہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی کہ آیا اس کا مقصد کیا تھا۔

واپسی پر اس نے رکشا لینے کے بجائے بس میں جانا بہتر سمجھا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ بس کا سفر کر رہی تھی اور یہ تجربہ کوئی اچھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ اوباش مرد بڑی گھناؤنی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ بہ قول شاعر....

اچھی صورت بھی کیا بری شیئے ہے

جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

یونیورسٹی وغیرہ میں بھی اسے کبھی کبھار ایسی نظروں کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ مگر وہاں کا ماحول کچھ اور قسم کا تھا یہاں تو حالت ہی کچھ اور تھی۔ انسپکٹر راحیل کے گھر کے قریبی سٹاپ پر اتر کر وہ پیدل ہی چل پڑی۔ آئندہ کے لیے اس نے بس میں سفر نہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کر کے وہ گھر میں داخل ہوئی۔ وہ شدید تھکن محسوس کر رہی تھی۔ سہ پہر ہو گئی تھی اور اب تک وہ دن کا کھانا نہیں کھا سکی تھی۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر نسرین جلدی سے اس کے لیے کھانا لینے چل دی۔ وہ اتنی تھکن محسوس کر سکی تھی کہ جھوٹے منہ بھی ماں کو منع نہیں کر سکی تھی۔

اور پھر وہ بہ مشکل کھانے سے فارغ ہو پائی تھی کہ ایک نئ مصیبت اس کے گلے آ پڑی۔ نمرہ اپنی کتابوں کا بستہ اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

"باجی پڑھنا ہے۔" وہ اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بے تکلفی سے بیٹھ گئی تھی۔

"رات کو پڑھیں گے نمرہ!.... اور اس وقت تو تم ٹیوشن پڑھنے جاتی ہو نا؟"

نمرہ اطمینان سے بولی۔ "امی جان نے وہاں جانے سے منع کر دیا ہے۔"

"کیوں؟" وہ حیران رہ گئی تھی۔

"امی جان کہتی ہیں اسوہ باجی سے پڑھ لیا کرنا۔"

"ہونہہ!...." گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے پھر رات کو پڑھیں گے۔"

"جی باجی!" کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور اس سے پہلے کہ اسوہ لیٹنے کا سوچتی اس کے کانوں میں سندس کی تیز آواز گونجی۔ وہ کمرے میں آکر پوچھ رہی تھی۔

"ایسی بھی کیا بے مروتی ہے اسوہ!.... کہ بچی کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ پڑھنے ہی آئی تھی نا کون سا گھر کا کرایہ مانگنے آئی تھی۔"

"نن.... نہیں آنٹی ڈانٹا کب ہے؟" وہ اس کا طعنہ سن کر تلملا گئی تھی۔ "میں نے تو فقط اتنا کہا ہے رات کو پڑھیں گے۔"

"رات کو اگر بچی پڑھتی رہے گی تو سوئے گی کب؟.... میرا مطلب ہے رات کو تو بس گھنٹا ادھ ہی پڑھ پائے گی نا۔"

"اچھا ٹھیک ہے آنٹی اسے ابھی بھیج دیں۔" طوعن وکرہن وہ رضامند ہوتے ہوئے بولی۔

"رہنے دو، ٹیوشن ہی بھیج دیتی ہوں۔ میں نے تو سوچا تھا چلو آپ اسے چھوٹی بہن سمجھ کر پڑھا دیا کرو گی اور شاید عورت ہونے کی وجہ سے تمھاری بات اس کے پلے صحیح پڑے۔ مگر آپ نے جانے کیا سمجھ کر بچی کو دھتکار دیا۔

"نہیں بہن!.... ایسی کوئی بات نہیں۔" خاموش بیٹھی سنتی نسرین ان کی گفتگو میں مخل ہوئی۔ "اسوہ بیٹی تو ایسا کچھ نہیں کہا۔"

"ہاں اب آپ نے بھی بیٹی ہی کی طرف داری کرنا ہو گی۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔ وہ گویا جان بوجھ کر لڑنے کے بہانے ہی تو ڈھونڈ رہی تھی۔

"آنٹی جی!.... آپ خفا نہ ہوں میں ابھی بھی پڑھا دیتی ہوں اور شام کو بھی پڑھا دوں گی۔"

"شکریہ اور اب وہیں اس کے کمرے میں چلی جاو۔ اب بچی کیا بار بار آپ کے کمرے کا طواف کرے گی۔" اس نے روکھے انداز میں کہا۔

اور اسوہ سر ہلاتی ہوئی نمرہ کے کمرے کی بڑھ گئی۔ اس کی انا پر مسلسل چرکے پڑ رہے تھے۔ وہ شاید یہ سب برداشت بھی کر لیتی مگر اگلے دن صبح صبح سندس آنٹی نے بہت بے ہودہ انداز میں اس کی ماں کو کام بتایا تو اسے برداشت نہ ہو پایا۔

"نسرین!.... ذرا ناشتا تو تیار کر دو، آج ماسی نہیں آئی۔ ویسے بھی آپ فارغ ہی ہوتی ہیں۔"

اس کی بات سن کر اسوہ کو بہت برا لگا تھا مگر وہ ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ سندس جاتے جاتے رکی اور کہا۔ "ہاں اسوہ!.... دفتر جانے سے پہلے تھوڑی جھاڑ پونچھ کر لینا گھر کی۔"

"میرا خیال ہے آنٹی!.... ہم یہاں ملازمت کرنے نہیں آئیں۔" اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ کنٹرول کیا ہوا تھا۔

"آئے ہائے، میں نے کب آپ لوگوں کو ملازم کہا ہے۔ گھر میں رہنے والے کیا گھر کی صفائی نہیں کرتے۔ اور آپ کی ماں اگر اپنے اور تمھارے لیے ناشتا تیار کر لے گی تو دو پراٹھے فالتو بھی تو ڈال سکتی ہے۔"

”بالکل، مگر آنٹی!....بتانے کے طریقے میں فرق ہوتا ہے۔“

”اب تم مجھے بات کرنے کا طریقہ سکھاو□ ؤ گی۔“سندس جھگڑالو عورتوں کی طرح اسوہ کی ہر بات کو الٹ لے رہی تھی۔

”اسوہ بیٹی!.... ختم کرو بحث کو۔“نسرین نے آہستگی سے کہا۔خود اسے بھی سندس کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

”امی جان!....سامان باندھیں ہم یہاں سے ابھی رخصت لیں گے۔مجھے نہیں لگتا کہ یہاں مزید رہنا مناسب ہو گا۔“

”ہاں باپ کوٹھیاں چھوڑ گیا ہے ناتر کے میں کہ مہارانی صاحب یہاں سے جائیں گی۔“ سندس منہ بناتے ہوئے باہر نکل گئی۔

اسوہ غصے سے ہونٹ چبانے لگی۔اس کی ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بیٹی کہاں جائیں گی؟“

”ایک منٹ ماں جی!....“اسوہ موبائل فون نکال کر اسماء کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”اسلام علیکم!“اسماء نے کال اٹینڈ کرتے ہی خوش کن لہجے میں کہا۔”آج کیسے یاد آگئی غریبوں کی۔“

”ایک کام تھا۔“اسوہ کے لہجے میں ابھی تک سندس کی بات چیت کا اثر باقی تھا۔

اسماء نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔”غصے میں لگ رہی ہو، کسی سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟“

”کچھ ایسا ہی سمجھو۔“

"اچھا غصہ تھوکو اور بتاؤ کیا کام ہے؟"

"کچھ عرصے کے لیے رہنے کے لیے ایک کمرہ مل جائے گا؟"اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"سچ...."اسماء کا لہجہ خوشی سے پر تھا۔"بتاؤ کب آ رہی ہو؟"

"ابھی....اسی وقت۔"

"بس جلدی کرو، میں کمرہ تیار کر دیتی ہوں۔"اسماء نے بے صبری سے کہا تھا۔

"مدثر بھائی سے تو پوچھ لو؟"اس کی بے تابی دیکھ کر اسوہ کا دل خوش ہو گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی اسے پچھتاوا ہوا کہ انھیں پہلے ہی اسماء کے ہاں منتقل ہو جانا چاہیے تھا۔

اسماء بے پرواہی سے بولی۔"ضرورت ہی کیا ہے۔"

"پھر بھی وہ تمھارا شوہر ہے، بلکہ سر کا تاج اور مجازی خدا ہے۔"اس کے لہجے میں شوخی تھی۔اسماء سے بات چیت کر کے وہ دماغی طور پر تازہ دم ہو گئی تھی۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔

"ہا....ہا....ہا۔"اسماء نے قہقہہ لگایا۔"ایسی بیویاں اب کہانیوں میں بھی نہیں ملتیں محترما"!

"اچھا میں سامان پیک کر لوں۔"اسوہ نے ہنستے ہوئے کہا اور اسماء نے۔"اسلام علیکم کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا
۔

"چلیں امی جان!....اسماء بہن سے بات ہو گئی ہے ان کے ہاں چلتے ہیں۔

اور نسرین اثبات میں سر ہلاتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ سامان پیک کر کے وہ انسپکٹر راحیل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی لوٹا تھا۔

اسوہ اجازت مانگ کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سندس بھی وہیں موجود تھا۔

"چچا جان!.... ہمیں اجازت دیں اور ہو سکے تو ٹیکسی منگوا دیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں چچا جان!.... میری کلاس فیلو ہے اسماء وہ خفا ہو رہی تھی کہ میں نے اس گھر کیوں نہیں منتقل ہوئی ۔اور پھر میں جس کمپنی میں کام کرتی ہوں وہ بھی اسماء کے گھر سے نزدیک ہے میں نے سوچا وہیں چلی جاتی ہوں ۔" اسوہ سندس سے لڑائی کی بات گول کر گئی تھی۔

"تو دفتر تمھیں میں چھوڑ دیا کروں گا۔" انسپکٹر راحیل نے شکوے بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے چچا جان!.... ہفتہ بھر آپ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو لیا۔ اب تو میں یوں بھی کرائے کا گھر ڈھونڈنے والی تھی مگر اسماء کا شکوہ دیکھ کر سوچا چند دن اس کے ہاں بھی گزار لوں۔"

"اچھا جیسے تمھاری مرضی۔" انسپکٹر راحیل نے زیادہ تکرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ "اور چلو میں تمھیں کار میں وہاں چھوڑ آتا ہوں۔"

"شکریہ چچا جان!" کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں ماں بیٹی انسپکٹر راحیل کی بیوی سندس سے رسمی اجازت لے کر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ سندس کے چہرے پر ہلکی سی شرمندگی یا پشیمانی

بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسوہ کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کا مطمح نظر انھیں اپنے گھر سے نکالنا تھا۔ شاید وہ یہ سوچ بیٹھی تھی کہ اسوہ اور اس کی ماں مستقل رہنے کے لیے آ گئے ہیں۔

وہاں سے اسماء کے گھر تک جانے کے لیے ان کی کوٹھی کے سامنے سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ انسپکٹر راحیل کو اسماء کے گھر کا پتا بتا کر وہ بولی۔

"چچا جان!.... ہماری کوٹھی کے سامنے سے نہ گزرنا۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر راحیل نے حیرانی سے پوچھا۔

"چچا جان!.... میں اب اس سڑک سے نہیں گزرتی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنی گم گشتہ جنت کو دیکھ سکوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" کہہ کر انسپکٹر راحیل نے کار آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

اسماء نے انھیں پر جوش انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔ مدثر بھی آفس سے آیا ہوا تھا وہ بھی انھیں دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ مدثر کی ماں ایک سادہ سی گھریلو خاتون تھیں۔ انسپکٹر راحیل انھیں وہاں چھوڑ کر واپس مڑ گیا تھا۔

"یہ ہے جی میری پیاری سی بہن کا کمرہ۔" وہ درمیانے حجم کا کمرہ تھا جس میں دو سنگل بیڈ مساوی رکھے ہوئے تھے جن پر سرخ پھولوں والی خوب صورت اور صاف ستھری بیڈ شیٹ ڈالی گئی تھیں۔ ایک کونے میں دو فوم والی کرسیاں اور ان کے سامنے لکڑی کی ایک سنٹر ٹیبل دھری تھی۔ جس کی سطح شیشے کی تھی۔ دونوں بیڈز کے ساتھ

بیڈ ہی کے رنگ کی تپائی بھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف کی دیوار میں بڑی سی الماری بنی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر ہلکے زرد رنگ کا ڈسٹمبر کیا گیا تھا۔ الماری کی مخالف سمت غسل خانے اور بیت الخلا کا دروازہ تھا۔ یہ کمرہ انسپکٹر راحیل کے گھر کے کمرے سے کئی گنا زیادہ آرام دہ اور خوب صورت تھا۔ لیکن الماری کے اندر سامان رکھتے ہوئے بھی کمرے کے پرائے ہونے کا احساس اس کے دل میں جاگزیں رہا، کچھ بھی تھا وہ گھر اس کا اپنا نہیں تھا۔ اس کی مثال تو کٹی پتنگ کی سی تھی جو ہوا میں ڈول رہی ہو۔

سر جھٹک کر اس نے پریشان کن سوچوں کو دور جھٹکا اور اسماء کو مخاطب ہوئی جو اس کے ساتھ سامان کو ترتیب سے رکھنے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔

"ویسے میرا خیال ہے ہمیں کرائے کا کوئی فلیٹ وغیرہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔"

"پاگل ہوئی ہو کیا؟" اسماء نے اسے جھڑ کا۔ "اکیلی دو عورتیں کہاں در بہ در رلتی پھرو گی۔ اور پھر ہمارا یہ کمرہ بالکل خالی پڑا ہے۔ اس لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ یقین مانو کرائے کے گھر میں رہنا بہت تکلیف دہ کام ہے۔ ہم ساری زندگی کرائے کے مکان میں خوار ہوتے رہے ہیں ابھی مہینا ہوا کہ اپنے مکان کا سکھ نصیب ہوا ہے۔ تمھیں تو میں کبھی اس اذیت کے حوالے نہ کروں۔"

"مگر ہم کب تک یہاں رہ سکتی ہیں؟" اسوہ دکھی ہو گئی تھی۔

اسماء نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جب تک تم شادی نہیں کر لیتیں۔"

"شادی۔" اسوہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "پہلی بات یہ ہے کہ اب کسی اچھے رشتے کے ملنے کی امید کرنا عبث ہی ہے اور دوسرا یہ کہ میں بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"اولذکر بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔"

اسوہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔"ایک غریب خوب صورت لڑکی کو پسند ہر کوئی کرتا ہے مگر وقتی فلرٹ کے لیے۔زندگی کا ساتھی تو اسے بنایا جاتا ہے جو برابر والا ہو۔جیسے مسٹر عرفان کی ماں کو جونھی یہ پتا چلا کہ ہم اب ہر چیز کھو چکے ہیں اس نے رشتا توڑنے میں دیر نہیں لگائی۔اور جانتی ہو وہ کمینہ مجھے اپنی رکھیل کی جگہ رکھنے کی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔اور یہی ایک مفلس لڑکی کا مقدر ہوتا ہے۔"

"اب اتنا بھی قنوطی ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم ایک بار ہاں تو کرو، دیکھو کہ پھر میری بہن کے لیے کتنے رشتے ملتے ہیں، تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔"اسوہ کی ماں اسماء کی ساس کے ہمراہ بیٹھی تھی اس لیے وہ کھل کر گفتگو کر رہی تھیں۔

اس سے بچھڑ کر میں بھی کہاں اب پہلے جیسا دکھتی ہوں

پھیکے پڑ گئے کپڑے وپڑے، زیور شیور سب کے سب

"ہا....ہا....ہا۔"اسماء ہنسی۔"یار!....تم ہاں تو کرو، پھر رشتوں کی قطاریں دیکھو۔"

اسوہ بے پرواہی سے بولی۔"رشتے ملیں یا نہ ملیں، میرا جواب تمھیں معلوم ہے۔"

"ویسے عجیب ضدی لڑکی ہو، کبھی وہ بے چارہ تمھاری ایک نظر کے لیے سارا سارا دن ترستا رہتا اور تمھیں ذرا بھی ترس نہ آتا اور آج اس کے علاوہ تمھیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔اتنا شدت پسند بھی کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔"

"صحیح کہا۔"اسوہ نے اس کی بات کا برا نہیں منایا تھا۔

”تم عمار کو ماضی سمجھ کر بھلا کیوں نہیں دیتیں؟“ اسماء نے اپنی پچھلی بات سے شہ پا کر بات آگے بڑھائی۔

اسوہ ہولے سے گنگنائی....

مسئلہ یہ نہیں کہ اس کی ہوں

مسئلہ یہ ہے صرف اس کی ہوں

”نری بے وقوفی ہے۔“ اسماء نے اسے عمار سے برگشتہ کرنے کی اپنی کوشش جاری رکھی تھی۔ ”مجھے دیکھو، میں بھی تو اسے پسند کرتی تھی، مگر اب مدثر کے ساتھ خوش ہوں اور اپنی پرانی حماقتوں پر ہنسی آتی ہے۔“

”مجھے بھی اپنی پرانی حماقتیں رلاتی ہیں۔“ اسوہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

”تم نہیں سدھرنے والی۔“ اسماء نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ اسوہ بھی ہنس پڑی تھی۔ اب وہ اسماء کو کیا بتاتی کہ ہر آنے والے دن میں عمار کی محبت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہر آنے والی شب جدائی کی اذیت کو بڑھاتی جا رہی تھی۔ عمار کی جدائی کا دکھ ہر غم، ہر زخم سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی انا اور خودداری پر مسلسل پڑنے والی ضربات بھی بھی اسے عمار کے دکھ کے مقابلے میں ہیچ لگ رہی تھیں۔

☆☆☆

”ویسے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے اتنی قیمتی کوٹھی کیوں خریدی؟“ انوارالحق اس وقت عمار کے دفتر ہی میں بیٹھا تھا۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے حیرانی کا اظہار کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

”انوار بھائی!.... اتنی کمائی کر رہا ہوں سو چار رقم اکٹھی کر کے کیا کروں گا تھوڑی عیاشی ہی کر لوں۔“

"بہت دیر سے خیال آیا ہے سر!" انوار الحق معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"نہیں خیال تو بہت پہلے آیا تھا، مگر پہلے استطاعت نہیں تھی۔"

"وہ تو اب بھی نہیں تھی کتنی رقم مجھ سے ادھار لی ہے۔"

"ہا....ہا....ہا۔" عمار نے قہقہہ لگایا۔ "نہیں جناب! بہت تھوڑے سے پیسے ادھار لیے ہیں اور چند دن تک وہ بھی ادا کر دوں گا، بلکہ ایسا کر و وہ میرے والی پرانی کوٹھی بیچ دو آدھے سے زیادہ قرض تو اسی سے اتر جائے گا۔"

"چلو آپ کی پرانی کوٹھی تو بک جائے گی کہ اب اس کا کوئی مصرف باقی نہیں رہا مگر میں اصل بات جاننا چاہتا ہوں؟" انوالحق اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"اس کوٹھی کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تھی یار"!

"تو اسی جذباتی وابستگی کو جاننے کی تو مجھے کرید ہے نا؟" انوار الحق اس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"یہ کوٹھی اسی لڑکی کی ہے جس کی وجہ سے آج میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔ اسی کی محبت نے میری محنت ، کوشش اور لگن کو ایندھن فراہم کیے رکھا۔ مگر جب میں اس مقام پر پہنچا کہ اس کی برابری اور ہم سری کا دعوے دار ہو سکوں تو وہ یہ ملک ہی چھوڑ کر امریکہ جا بیٹھی۔"

"پھر یہ کوٹھی کس سے خریدی؟"

"جس پر اس نے بیچی تھی۔ والد کی وفات کے بعد اس نے پاکستان میں رہنا ہی گوارا نہ کیا حالانکہ کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی کو اس کے یہاں رہنے کی کتنی طلب ہے۔"

"بس اتنی سی بات پر اتنے کروڑ خرچ کر ڈالے کہ یہ کوٹھی کبھی اس لڑکی کی تھی؟" انوار الحق نے شدید حیرانی کا اظہار کیا تھا۔

"یقیناً آپ کے لیے یہ حیرانی کی بات ہو گی۔ بلکہ ہر کسی کے لیے بھی یہ بات اچنبھے کا باعث ہو سکتی ہے۔" عمار نے بغیر کسی حجت کے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"بات آپ کی ہو رہی ہے سر"!

"میری زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے یہ میں کسی کو سمجھا بھی نہیں سکتا۔ باقی رہی کوٹھی خریدنے کی بات تو یہ رقم ضائع تو نہیں ہوئی نا، یہ کوٹھی کبھی بھی بیچ کر میں اس کی خریداری کی مد میں خرچ کی ہوئی رقم بلکہ اس سے کچھ زیادہ رقم حاصل کر سکتا ہوں۔"

"اچھا لاہور جانے کے بارے کیا سوچا ہے؟" انوار الحق نے صفائی سے موضوع بدلا۔

"مہ جبین کو ٹکٹ کا بتا دیا تھا۔ میرا خیال ہے شام چار بجے کی فلائیٹ ہے۔"

"واپسی کب ہو گی؟"

"دو تین دن تو لگ جائیں گے۔ کل کا دن انٹرویو لیتے گزر جائے گا، پرسوں ایک دو ضروری کام ہیں، آفتاب نے ورکنگ سائیٹ کا وزٹ بھی شیڈول میں رکھا ہے اور پھر دو تین ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ڈائریکٹرز سے بھی ملاقات طے ہے۔ اصولی طور پر تو تین دن بھی کم ہیں مگر میں ان شاء اللہ تیسرے دن واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

انوارالحق نے پوچھا۔ "میں نے کل کی کچھ نئی تجاویزات بھجوائی تھیں، چند مشینوں کی خریداری کی بھی ضرورت پڑ رہی ہے۔ مطلوبہ فائل آپ نے اب تک آؤٹ نہیں کی؟"

"میں نے فائل پر سرسری نظر تو دوڑالی تھی لیکن فی الحال میں کوئی فیصلہ دینے کے حق میں نہیں ہوں لاہور سے واپسی پر اس کے متعلق بات ہو گی، بلکہ اس سلسلے میں کمپنی کے ڈائریکٹرز کی میٹنگ کرنا پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے سر!" انوارالحق جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں آج آپ کی پرانے کوٹھی کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔"

اور عمار نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"بیٹھو، کیسی ہو؟" خلاف توقع آج اسوہ کو آفاق صاحب کے چہرے پر میٹھی میٹھی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہوں سر!" کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے رائٹنگ پیڈ گود میں رکھ لیا تھا۔

"ایسا کرو پہلے دو کپ کافی کا بتا دو؟"

"دو کپ؟" اسوہ نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں، آج تمھارے ساتھ گپ شپ کرنا ہے تو ساتھ کافی بھی پی لیں گے۔"

اسوہ نے انٹر کام اٹھا کر کہا۔ "سر!.... آپ کے لیے بتا دیتی ہوں۔ میں ذرا کافی کم ہی پسند کرتی ہوں۔"

"تو چائے کا کہہ دو۔" آفاق مصر ہوا۔

”سر!.... آپ کے ساتھ چائے پیتے ہوئے کچھ عجیب سا لگے گا۔“ اسوہ کو اس کا نرم رویہ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”کم آن اسوہ!....“ آفاق نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔ تم شاید میرے گزشتہ چند دن کے رویے پر شاکی ہو ۔مجھے بس ذہنی طور پر تھوڑی پریشانی تھی اس لیے میں کچھ تلخ سا ہو رہا تھا۔ ورنہ یقین مانوں میں اتنا سخت باس نہیں ہوں۔“

اسوہ، انٹر کام پر دو چائے کا بتا کر پوچھنے لگی۔ ”کیسی پریشانی سر!.... خیریت تو ہے نا؟“

”بس کیا بتاؤں، والدین بھی اولاد کو جانے کس جھنجٹ میں پھنسا دیتے ہیں۔“

اسوہ کی آنکھوں میں اپنے والد کا پیارا چہرہ لہرایا اور وہ جلدی سے بولی۔ ”والدین تو ہمیشہ اولاد کے بھلے ہی کا سوچتے ہیں سر“!

”ہاں، ان کی نیت تو ٹھیک ہوتی ہے لیکن بعض اوقات فیصلے غلط کر دیتے ہیں۔ اب دیکھو نا زندگی میں نے گزارنا ہے تو اپنی شادی کا فیصلہ کرنے کا اختیار بھی میرے پاس ہونا چاہیے۔ لیکن اس معاملے میں والدین خواہ مخواہ اپنی منواتے ہیں نتیجتاً شادیاں عموماً ناکام ہوتی ہیں اور زوجین یا تو جلد ہی علاحدگی اختیار کر لیتے ہیں یا ساری عمر منافقت بھری زندگی گزار دیتے ہیں۔“

اسوہ چونکہ خود پسند کی شادی کرنا چاہتی تھی اس لیے آفاق کی تردید کرنا اسے مناسب نہ لگا۔ اور وہ بے ساختہ پوچھنے لگی۔ ”کیا آپ نے بھی والدین کی مرضی پر شادی کی تھی سر“!

آفاق نے اپنے لہجے میں دنیا جہاں کا دکھ سموتے ہوئے کہا۔ ”ہاں نا، ابو جان کے دباؤ میں آ کر کی تھی۔ اور یقین کرو اب زندگی جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ نہ بیوی کی سمجھ میں میری بات آتی ہے اور نہ وہ ایسی کوشش ہی کرتی

ہے۔میری ترجیحات، خواہشیں، پسند اور جذبات اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔بس وہ اپنی ہی دنیا میں مگن رہتی ہے۔"

"کیا آپ کسی اور کو پسند کرتے تھے؟" اسوہ کو اس کی بات سن کر افسوس ہوا تھا۔

"نہیں، خیر ایسی تو کوئی بات نہیں تھی، میں بس کسی آئیڈیل کی تلاش میں تھا۔" اس نے معنی خیز انداز میں اسوہ کے چہرے پر نگاہ دوڑائی۔

اس کی بات پر اسوہ کو عمار یاد آگیا تھا۔وہ گہرا سانس لیتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔"کبھی کبھی آئیڈیل انسان کے بہت قریب ہوتے ہیں مگر انسان انھیں نظر انداز کر دیتا ہے اور جب وہ نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو زندگی بھر ہاتھ ملنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔"

"بالکل صحیح کہا۔" آفاق جیسے اس کی بات پر پھڑک اٹھا تھا۔"واقعی آئیڈیل کبھی کبھی بالکل آس پاس ہی نظر آنے لگتے ہیں، اس وقت انسان کو انھیں اپنانے میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور آفس بوائے نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"آجاؤ۔" آفاق نے کہا۔

آفس بوائے ٹرے میں چائے کا سامان لیے اندر داخل ہوا۔

"ٹرے یہاں رکھ دو۔" اسوہ نے اپنے سامنے پڑی میز کی طرف اشارہ کیا۔"اور تم جاؤ میں چائے بنالوں گی۔"

"جی میڈم!" کہہ کر وہ ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"چینی سر!" اسوہ نے دونوں پیالیوں میں گرم دودھ اور پتی کا ساشے ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ایک چمچ۔" آفاق نے زبان سے کہتے ہوئے غیر ارادی طور پر انگلی اٹھا کر بھی اشارہ کر دیا تھا۔

چینی ڈال کر اس نے پیالی اٹھا کر آفاق کے سامنے رکھی اور اپنی پیالی میں چینی ڈال کر چمچ ہلانے لگی۔

چائے کی چسکی لے کر آفاق نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔"مس اسوہ!.... تم نے بالکل ٹھیک کہا آئیڈیل بہت قریب ہوتا ہے اور انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔

اسوہ نے بے ساختہ پوچھا۔"کیا آپ بھی اپنا آئیڈیل گنوا چکے ہیں سر"!

"آپ بھی کا کیا مطلب؟" آفاق نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "کہیں تم بھی اس حادثے کا شکار تو نہیں ہوئیں؟"

اسوہ ہونٹ بھینچتے ہوئے خاموش ہو گئی۔یوں بھی آفاق کے ساتھ وہ اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ عمار کا ذکر لے بیٹھتی۔

"خاموش کیوں ہو گئیں۔" اسے کچھ نہ کہتے دیکھ کر آفاق نے تحریک دی۔

"سر!....کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بانٹی نہیں جا سکتیں۔"

"ہونہہ!...." کہہ کر آفاق نے اثبات میں سر ہلایا۔"ویسے میں سوچ رہا ہوں تمھاری تنخواہ بڑھا دوں۔" چائے کی ادھ بھری پیالی میز پر رکھتے ہوئے وہ کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔

"آپ کی مہربانی ہو گی سر!" وہ خوش گوار حیرت سے بولی۔کیونکہ اسے آفاق سے ایسی مہربانی کی توقع نہیں تھی۔

”نہیں اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔“ وہ ٹہلتے ہوئے اس قریب آیا۔ ”ہر جگہ کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر کام چلتا ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے اسوہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک لمحے کے لیے تو وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ آفاق کا ہاتھ کندھے سے پھسل کر اس کے ساتھ مزید کوئی گستاخی کر پاتا وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی، چائے کے کپ نے چھلک کر اس کی قمیص کے دامن کو داغ دار کر دیا تھا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ اس کے لہجے میں خوف و ہراس، غم و غصہ، نفرت و حقارت اور جانے کیا کیا پنہاں تھا۔

”یقیناً تم بچی نہیں ہو۔“ آفاق کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مکروہ قسم کی مسکراہٹ ابھری۔ ”میں اپنی بیوی سے خوش نہیں ہوں اور سکون کی تلاش میں مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔“

”شاید تمھاری بیوی بھی تم سے خوش نہ ہو، کیا ایسی حرکت کی اجازت تم اسے بھی مرحمت فرماؤ گے۔“ اسوہ آپ سے تم پر آتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولی۔

”شٹ آپ، جانتی ہو کس سے بات کر رہی ہو؟“ آفاق غصے سے دھاڑا۔

اسوہ رسان سے بولی۔ ”ایک کم ظرف گھٹیا اور پنچ انسان سے۔“

”محترمہ!.... یہ پارسائی کے دعوے کسی اور کے سامنے بیان کرنا، تمھیں یہ نوکری شکل و صورت کے بل پر ملی ہے اور ورنہ تم جیسی ڈگری ہولڈر بھکاریوں سے بھی زیادہ تعداد میں کراچی کی سڑکوں پر پھر رہی ہیں۔“

”میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی نوکری پر اور تم جیسوں کو تو یقیناً اپنی ماں بہن کی پارسائی میں بھی شک ہو گا۔“

اسوہ کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے وہ چیخا۔ ”بکواس بند کرو۔“

اسوہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ ڈگمگا کر گرنے والی تھی لیکن میز کا سہارا لے کر اس نے خود کو گرنے سے بچا لیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ جوابی کارروائی کا سوچتی یا اسے کوئی جواب دیتی دروازہ کھول کر کمپنی کا منیجمنٹ ڈائریکٹر ارسلان اندر داخل ہوا۔ وہ آفاق کا برادر نسبتی بھی تھا۔

”سر!.... خیریت آپ کی آواز کافی دور تک جا رہی ہے۔“

اسے کوئی جواب دیے بغیر آفاق نے ایک دم پینترا بدلتے ہوئے اسوہ پر بہتان تراشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے یہ سوچا بھی کیسے ؟.... ذرا سی صورت کیا اچھی ہوئی مجھی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے، واہیات عورت“!

”شرم آنا چاہیے تمھیں جھوٹ بولتے ہوئے۔“ اسوہ جیسے غصے سے ابل پڑی تھی۔ ”اگر تم یہ سوچ رہے ہو اس طرح بچ جاؤ گے تو یہ تمھاری خام خیالی ہے میں تم پر کیس کروں گی بے حیا انسان۔“

”بڑے شوق سے، رستا کھلا ہے روکا کس نے ہے۔ البتہ تم بھی کسی خوش فہمی میں نہ رہنا، ایک بار تھانے جا کر دیکھ لو کیا درگت بنتی ہے تمھاری۔ یعنی حد ہو گئی ہے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ تم جیسی آوارہ عورتوں سے بہت پالا پڑا ہے میرا۔ چند ٹکوں کے لیے اپنی عزت کی بھی پروا نہیں کرتی ہو۔“ آفاق نے غصے سے منہ سے جھاگ اڑاتے ہو کہا۔

ارسلان نے جلدی سے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ ”سر!.... آپ غصہ تھوکیں، اصل معاملہ کیا ہے مجھے بتائیں؟“ اسی وقت چند اور افراد بھی دفتر میں گھس آئے تھے۔

"محترما کو مارکیٹنگ آفیسر یا اکاؤنٹ آفیسر کی سیٹ چاہیے، بدلے میں محترما میری ہر قسم کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔" آفاق کو جھوٹ پر جھوٹ بولنے میں کوئی خوف دامن گیر نہیں تھا۔

وہاں موجود تمام افراد اسوہ کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

"جھوٹ بول رہا ہے، بکواس کر رہا ہے۔" اسوہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔

وہ تمام بچے نہیں تھے کہ اصل بات تک ان کی رسائی نہ ہو پاتی۔ اسوہ کی قمیص کا داغ دار دامن واضح طور پر اعلان کر رہا تھا کہ قصوروار کون ہے۔ اگر آفاق کی بات سچ ہوتی تو اسے اپنی کرسی پر بیٹھا ہونا چاہیے تھا یا زیادہ سے زیادہ کھڑا ہوتا مگر ہوتا اپنی کرسی کے نزدیک۔ اب تو وہ دروازے کی جانب کھڑا تھا گویا وہ چل کر اسوہ کے قریب آیا تھا۔ سب سے بڑھ کر مرد چاہے جتنا بھی پارسا ہو کسی عورت کی ایسی آفر پر یوں چراغ پا نہیں ہوا کرتا۔ کہ چیخنے چلانے لگے۔ وہ آرام سے اسوہ کو دفع ہو جانے کا حکم سنا سکتا تھا۔ مگر وہ تمام آفاق کے ملازم تھے اور انھوں نے آگے نوکری بھی کرنا تھی۔ اسوہ کی طرف داری کر کے وہ خود کو آفاق کے عتاب کا شکار نہیں بنا سکتے تھے۔ کسی غیر لڑکی کے لیے کون اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا چاہتا ہے۔ اور پھر ان میں سے کسی کا اسوہ کی طرف داری کرنا اسوہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس واقعے کا چشم دید گواہ نہیں تھا ۔سب سے پہلے ارسلان نے زبان کھولی تھی۔

"مس اسوہ!.... اب اس بات کو جانے دیں، غلطی انسان ہی سے ہو جاتی ہے۔ آپ آفاق صاحب سے معذرت کر لیں تاکہ معاملہ یہیں رفع دفع کر دیا جائے۔ نہ آپ کی بدنامی ہو اور نہ آفاق صاحب کی عزت پر کوئی حرف آئے۔"

اسوہ گلوگیر لہجے میں بولی۔"ایک ظالم کی طرف داری کرتے ہوئے آپ کو خدا کا خوف کرنا چاہیے۔"

"ارسلان صاحب!....اسے کہو یہاں سے دفع ہو جائے میں اس کی منحوس شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ایسی آوارہ عورت کے لیے میری کمپنی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"پر نخوت لہجے میں کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

اسوہ جانتی تھی کہ وہاں بحث و تکرار اور رونے دھونے سے اسے کچھ ملنے والا نہیں تھا۔اندھے کے سامنے رونا اشکوں کا ضیاع اور بہرے کے سامنے گڑ گڑانا الفاظ زیاں ہے جبکہ گونگے سے اپنے حق میں گواہی دلانا پاگل پن ہے۔اور اس وقت وہاں پر موجود تمام افراد بہرے گونگے اور اندھے تھے۔ان کی آنکھوں پر اپنی نوکری بچانے کی پٹی بندھی تھی۔ان کی زبان پر اپنے باس کے خوف کے تالے پڑے تھے اور ان کے کان اپنی مجبوریوں کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔وہ آفاق کے ملازم تھے اور آفاق ہی طرف داری ان کا مذہب تھا۔

دل پر منوں بوجھ لیے وہ وہاں سے باہر نکل آئی۔انسپکٹر راحیل سے بھی شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا ۔اتنے بڑے بزنس مین پر وہ بغیر کسی ثبوت کے ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔بلکہ ایسے لوگ تو ثبوت کو بھی آسانی سے جھٹلا سکتے ہیں۔اور یہ بات اسوہ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔کبھی وہ بھی تو ایک کال کر کے کسی کو حوالات کے حوالے کر دیا کرتی تھی اور اس کے پاس سب سے بڑا ثبوت یہی ہوتا تھا کہ وہ کہہ رہی ہوتی۔اس وقت اس کے کہے کو کوئی جھوٹ نہیں گردان سکتا تھا۔اور وہی اسوہ تھی کہ حق پر ہوتے ہوئے بھی آواز بلند نہیں کر سکتی تھی ۔

"میری وجہ سے بھی تو کوئی بے گناہ ایسی ہی اذیت سے گزرا تھا۔"اچانک اس کی آنکھوں میں عمار کا مغموم چہرہ لہرایا۔دولت کے زعم،امارت کے گھمنڈ،خوب صورتی کے غرور اور انوکھے پن کے خیال نے اس سے یہ

احساس ہی چھین لیا تھا کہ وہ کسی پر ظلم وزیادتی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ آج اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر وہ چیخ اٹھی تھی۔ اس کا انگ انگ زخم بن گیا تھا۔ لیکن وہ تو اس وقت خاموش رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کہا تھا اس نے ۔نہ اس وقت کوئی شکوہ کیا تھا اور نہ بعد میں کوئی شکایت کی تھی۔

جانے کتنی دیر وہ انھی خیالات میں ڈوبی چلتی رہی۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب وہ گھر کے سامنے تھی۔ بے خیالی میں وہ پیدل ہی وہاں تک پہنچ گئی تھی۔ غم وغصے کی کیفیت اور اپنی ذلت آمیز توہین نے اسے تھکنے کا احساس ہی نہیں دیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اسوہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ذہنی طور پر وہ اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر گھستی چلی گئی۔ اسماء تکیے سے ٹیک لگائے انہماک سے کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھی ۔دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔ اسوہ کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ارے آج بڑی جلدی آگئی ہو؟" کتاب بند کر کے ایک جانب رکھتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔ دوبارہ اسوہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ "خیریت تو ہے؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اسے جواب دیے بغیر اسوہ بیڈ پر بیٹھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی ہمت جواب دے گئی۔ کافی دیر سے رکے ہوئے آنسو دوبارہ بہنے لگے۔

”کیا ہوا میری جان!“ اسماء نے نزدیک ہو کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ مگر اسوہ اسے کوئی جواب دیے بغیر آنسو بہاتی رہی۔

”مجھے پریشانی ہو رہی ہے اسوہ!.... آخر کچھ تو بتاؤ آخر ہوا کیا ہے؟“

”آفاق، ایک گھٹیا، کمینہ اور بد خصلت شخص ہے۔ دنیا جہان کا جھوٹا، چال باز اور بد فطرت انسان۔“ سسکیاں لیتے ہوئے بہ مشکل اس کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ یہ آفاق ہے کون جس کی اتنی خوبیاں گنوا رہی ہو؟“ اسماء نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کمینہ میرا باس تھا۔“

”ہونہہ!.... اب ذرا اس کمینے کی کمینگی پر بھی روشنی ڈالو۔“

جواباً وہ گلوگیر آواز میں اسے تفصیل بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی.... ”اس بد خصلت نے مجھے اسی لیے اپنی پرسنل سیکرٹری رکھا تھا۔ کیا میں اتنی سستی ہوں، کیا کسی لڑکی کا مفلس ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بھی اوباش مرد اسے اپنی آغوش میں گھسیٹ سکتا ہے؟“

”ایسا بالکل بھی نہیں ہے میری جان!.... تمام مرد ایسے نہیں ہوتے۔ اور پھر تمھاری جیسی موہنی شکل وصورت والی کسی بھی مرد کی ماتحت ہو گی تو لازماً اس کی مت تو ماری جائے گی نا؟“ مؤخر الذکر بات اسماء نے مذاق کے انداز میں کہی تھی۔

”گویا اصل قصوروار میں ہوں؟“ اسوہ نے شاکی لہجے میں پوچھا۔

”ایسا میں نے کب کہا ہے؟“ اسماء جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا مطلب تھا کہ بدخصلت مرد جب کسی لڑکی کو مجبوری کی حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کی فطرت میں چھپی خباثت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اور جب آگے کسی مضبوط کردار کی لڑکی سے واسطہ پڑ جائے تو پھر اسی طرح آئیں بائیں شائیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یقین جانو اس کے جتنے بھی ماتحت وہاں موجود ہوں گے تمام کو سو فیصد پتا ہو گا کہ اصل قصوروار کون ہے۔ بے شک ظاہری طور پر وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہوں گے۔“

”مگر کمپنی کا ایم ڈی ارسلان صاحب تو مجھے کہہ رہا تھا کہ اس کمینے سے معذرت کر لوں۔“

”تو اور کیا کہتا۔ اس نے نوکری نہیں کرنا تھی۔ اور بالفرض وہ تمھاری طرف داری کرتا تب بھی تمھیں تو کوئی فائدہ نہیں تھا الٹا وہ غریب بھی تمھاری طرح نوکری سے جاتا۔ مصلحت سے کام لے کر اس نے نوکری بچالی ۔البتہ ان تمام کے سامنے تمھارے باس کا گھناؤنا کردار کھل کر سامنے آگیا ہو گا۔“

”اس کا مطلب ہے اب میں جہاں بھی نوکری کرنے جاؤں گی مجھے اسی قسم کے حالات سے پالا پڑے گا ۔“ تشویش کے ساتھ اسوہ کے لہجے میں گہرے دکھ کی بھی آمیزش تھی۔

”ضروری تو نہیں کہ ہر مرد آفاق کی طرح اوباش فطرت کا مالک ہو۔“

”نوکری کا پہلا تجربہ ہی اتنا تلخ اور بھیانک ہے کہ جی ہی کھٹا ہو گیا ہے نوکری سے۔“

”تو نہ کرو نوکری۔ اللہ پاک کا دیا بہت کچھ ہے۔ جو روکھی سوکھی ہم کھا رہے ہیں تم بھی کھاتی رہنا۔“ اسماء نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا۔

”ساری زندگی پرائے در پر کون پڑا رہ سکتا ہے؟“ اسوہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

”گویا تم ہمیں پرایا سمجھتی ہو؟“ اسماء نے ناراضی بھرے لہجے میں پوچھا۔

اسوہ صاف گوئی سے بولی۔”بلاشبہ تم میری سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر ہو، مگر سگی بہنوں کے گھر میں بھی تو ہمیشہ نہیں رہا جا سکتا۔“

”اگر سگا سمجھتیں تو یوں نہ کہتیں۔“ اسماء نے خفا ہونے کے انداز میں کہا۔

"اب تم بھی ناراض ہو جاؤ۔" اسوہ دوبارہ آنسو بہانے لگی۔

"ارے مذاق کر رہی تھی پاگل!" اسماء جلدی سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

"میں بہت کمزور ہو گئی ہوں اسماء۔ اب میں پہلے والی اسوہ نہیں رہی۔ دکھوں کی مسلسل یلغار نے میری قوت ارادی، حوصلے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو تہس نہس کر دیا ہے۔"

اسماء اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "نہیں، تم پہلے سے بہت زیادہ دلیر اور بہادر ہو گئی ہو۔ حالات کا یوں ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ یقین مانو اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو پاگل ہو گئی ہوتی۔"

"اچھا چھوڑو اس بحث کو اور مجھے اچھی سی چاے پلا دو۔ سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔"

"دو منٹ میں لائی۔" اسماء چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔ "تم جلدی سے تازہ دم ہو جاؤ۔"

اسوہ سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اسماء کی تسلی آمیز باتوں سے وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ ماں سے اپنے زخمی احساسات چھپا سکے۔ ورنہ تو گھر میں داخل ہوتے وقت اس کی جو کیفیت تھی اسے دیکھتے ہی ماں کو پتا چل جاتا کہ وہ کسی کے ساتھ لڑ کر آ رہی ہے۔ اور پھر مجبوراً اسے کئی ناپسندیدہ سوالات کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔

☆☆☆

ہیلو عمار صاحب!.... میں غزالہ ہوں، احسان علی شاہ کی صاحب زادی۔" ایک خوب صورت اور شوخ و شنگ لڑکی نے اس کی طرف مصافحے کے لیے اپنا نرم و نازک گورا ہاتھ بڑھایا۔ اس کا لباس کچھ زیادہ ہی فیشن ایبل تھا۔ لیکن ایسی پارٹیوں میں اس قسم کی خواتین سے اس کا کئی بار پالا پڑ چکا تھا اس لیے اسے حیرانی نہیں ہوئی تھی۔

اس کا نرم و گداز ہاتھ تھامتے ہوئے وہ دھیمی مسکراہٹ سے بولا۔ ”شکریہ مس غزالہ!.... آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”اچھا!.... یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔“ اس نے مخمور نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ، بناوٹ، گھنی پلکوں کی جھالر اور خوب صورت بھنووں نے اسے کسی خاص شخصیت کی یاد دلا دی تھی۔ اسوہ کی آنکھیں وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ بس فرق تھا تو اتنا کہ اسوہ کی آنکھوں میں اسے ہر وقت برہمی جھلکتی نظر آتی اور غزالہ کی آنکھوں میں نرمی و شوخی۔

لاہور سے واپسی کے دوسرے دن وہ ایک بزنس مین کی طرف سے دیے گئے عشائیے میں شریک ہوا تھا۔ اس وقت کھانا شروع ہو گیا تھا۔ وہ پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد اور دو تین روسٹ بوٹیاں لے کر صوفے پر آن بیٹھا تھا جب غزالہ صاحب کا نزول ہوا۔ جانے وہ اس کے نام سے کیسے واقف تھی۔ خود عمار اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یوں بھی جب سے اس نے اس قسم کی محافل میں شمولیت اختیار کرنا شروع کیا تھا اس کا حلقہ احباب وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ البتہ اس کے والد احسان علی شاہ کو وہ جانتا تھا۔ احسان علی شاہ کا شمار بڑے بزنس مینوں میں ہوتا تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے میدان میں وہ ایک جانا پہچانا نام تھا۔ بہت سی غیر ملکی کمپنیوں سے اس کے روابط تھے۔۔ لیدر جیکٹس، زنانہ و مردانہ انڈر گارمنٹس اور شرٹس وغیرہ کی برآمدات میں وہ عمار کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

”پلیز بیٹھیں۔“ اس نے سامنے پڑے صوفہ سیٹ کی جانب اشارہ کیا۔ مگر وہ سامنے بیٹھنے کے بجائے اس کے پہلو میں براجمان ہو گئی۔

"اتنا کم کھانا، کیا ڈائٹنگ کر رہے ہو؟" وہ اس کی پلیٹ میں پڑی ہوئی دو تین چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کی طرف اشارہ کر کے مسکرائی۔

"کیا آپ کو لگ رہا ہے کہ مجھے ڈائٹنگ کی ضرورت ہے۔" عمار بھی تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"اسی وجہ سے تو مجھے حیرانی ہو رہی تھی۔" اس نے ایک اور مسکراہٹ اچھالی۔ ہنستے ہوئے اس کے سرخ و سفید گالوں میں خوش کن گڑھے پڑ جاتے تھے، جو اس کے حسن میں اضافے کا باعث بنتے تھے۔ اور حسین نظر آنا تو اس قسم کی لڑکیوں کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ اس لیے اسے ہنسنے کے لیے ہلکے سے بہانے کی تلاس رہتی تھی ۔ البتہ اسوہ کے گالوں میں اس طرح گڑھے نہیں پڑتے تھے۔ غزالہ کا رنگ سرخ و سفید تھا جبکہ اسوہ کا دودھیا سفید تھا۔ اس کی آنکھوں اور پیشانی کے علاوہ باقی چہرے کی بناوٹ اسوہ سے بالکل مختلف تھی۔ البتہ سر کے بالوں کا رنگ اور گھنا پن بھی بالکل اسوہ جیسا تھا۔ عمار کو یقین تھا کہ اگر وہ آنکھوں کے علاوہ باقی چہرہ نقاب میں چھپا لیتی تو چہرے کی حد تک بالکل اسوہ نظر آتی۔

عمار نے پوچھا۔ "اور خود آپ خالی ہاتھ ہیں اس بارے بھی کچھ ارشاد فرمائیں نا؟"

"ہا....ہا....ہا" اس کا نقرئی قہقہہ گونجا۔

"گویا آپ کا قہقہہ ہی میرے سوال کا جواب ہے۔" عمار برجستہ بولا۔ اور اس مرتبہ بھی اسے ایک اور قہقہے سے محظوظ ہونا پڑا۔ وہ مصنوعی قہقہہ بھی اس خوب صورتی سے لگا رہی تھی کہ اس پر حقیقت کا گمان گزر رہا تھا۔

"ویسے آپ باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہیں عمار صاحب"!

عمار نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ "کوئی خود دلچسپ ہوتا ہے اور کسی کو دلچسپ باتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔"

"اچھا...." وہ اپنی معنی خیز نظریں اس کے چہرے پر دوڑانے لگی۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ کھانے سے پرہیز کیوں کر رہی ہیں؟" اس کی معنی خیز اچھا کی جواب میں عمار پرانے موضوع کی طرف لوٹا۔

"شام کو چند مہمان آ گئے تھے اور ان کا ساتھ دینے کے لیے چند سینڈوچز پر میں نے بھی ہاتھ صاف کر لیا کہ اس وقت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ بس اسی وجہ سے اب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔"

"اور آج کل کیا کر رہی ہیں؟" اس نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

"ماسٹر کر رہی ہوں۔"

"تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمھاری تلاش میں جانے کہاں کہاں پھر رہا ہوں۔" ایک جواں سال لڑکا اچانک آ کر ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔ عمار نے اس کی جانب دیکھا۔ کالی جینز پر تنگ بنیان پہنے ہوئے وہ اپنے صحت مند بازوؤں کی مچھلیوں کی نمائش میں فراخ دلی سے کام لے رہا تھا۔ اس نے عمار کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

"ہاں میں عمار صاحب سے گپ شپ کر رہی تھی۔" سرسری انداز میں کہتے ہوئے وہ عمار کو مخاطب ہوئی۔ "عمار صاحب!.... ان سے ملیے زوہیب حسن میرے کزن ہیں۔"

"اسلام علیکم!" عمار اس کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے نخوت بھرے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ عمار کے لیے بھی وہ کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اس قسم کے گنوار شخص سے اس نے کوئی واسطہ نہیں رکھنا تھا۔ وہ خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوا اور ایک بوٹی سے زور آزمائی میں مصروف ہو گیا۔

"آؤ بیٹھو نازوبی!" ان دونوں کی سرد مہری محسوس کرنے کے باوجود وہ اسے دعوت دینے سے باز نہیں آئی تھی ۔یا شاید اسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ اس کی دعوت قبول نہیں کرے گا۔

"نہیں غزالو!....چلتے ہیں۔" زوہیب عرف زوبی نے چاہت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر آپ جائیں میں تھوڑی دیر مزید بیٹھنا پسند کروں گی۔" غزالہ کے لہجے میں بے اعتنائی در آئی تھی۔

عمار کو غزالہ کی زوہیب کی ذات میں عدم دلچسپی واضح نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ ان دونوں سے بے پروا پلیٹ کو خالی کرنے میں مصروف رہا۔ کون کس میں دلچسپی لے رہا تھا اور کون کسے نظر انداز کر رہا تھا اس بات کی پروا کم از کم اسے نہیں تھی۔ غزالہ کو بھی اس نے احسان علی شاہ کی وجہ سے تھوڑی سی توجہ دی تھی اور کچھ اس کی آنکھوں نے اسے متاثر کیا تھا جو اسوہ کے مشابہ تھیں۔ سب سے بڑھ کر وہ خود چل کر اس کے پاس آئی تھی۔ ورنہ عورت ذات میں اس دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسے اپنی اسوہ کی یادیں کافی تھیں۔ آج تک اس کی نظر میں اسوہ سے زیادہ تو کیا اس کے برابر کی بھی کوئی لڑکی نہیں گزری تھی۔ یہ پہلی لڑکی تھی جس میں اسے اسوہ کی ہلکی سی شباہت نظر آئی تھی۔ اگر بالفرض کوئی اسوہ سے خوب صورت یا اس جیسی تھی بھی سہی تب بھی اسے نہیں لگتی تھی۔ وہ دشمن جاں سب سے الگ، سب سے جدا، سب سے انوکھی اور سب سے پیاری تھی۔

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" زوہیب نے قدرے غصے سے پوچھا تھا۔

"تو کیا میں تمھاری وجہ سے عمار صاحب کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں، تہذیب بھی کوئی چیز ہوتی ہے، اخلاق بھی کوئی معنی رکھتے ہیں۔" غزالہ کے الفاظ ہی نہیں لب و لہجہ بھی ہتک آمیز تھا۔ اس کے بعد بھی زوہیب کا وہاں پر کھڑا رہنا اس کی کسی مجبوری ہی کا مظہر ہو سکتا تھا۔

وہ غزالہ کے توہین آمیز رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "چلو نا، مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔"

غزالہ اطمینان سے بولی۔ "ضروری بات بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔"

عمار کو اپنی ذات کی وجہ سے ان کی تکرار کسی صورت گوارا نہیں تھی۔ پلیٹ سے آخری بوٹی کا صفایا کر کے وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مس غزالہ!.... چند منٹ کی رفاقت کا شکر گزار ہوں۔ آپ لوگ گپ شپ کرو میں ذرا مزید کھا پی لوں۔ روسٹ کیا ہوا چکن کچھ زیادہ ہی لذیز ہے۔"

"ارے میں آپ کے لیے بیٹھی ہوں اور آپ چل دیے، یہ اچھی رہی۔" وہ زوہیب کو نظر انداز کر کے عمار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس کے لہجے میں لگاوٹ بھری ناراضی تھی۔

"وہ آپ کے کزن کو کچھ بات چیت کرنا تھی تو مجھے بہتر یہی لگا کہ درمیان سے نکل جاؤں۔" عمار نے صفائی سے جان چھڑانا چاہی۔

"چھوڑ اسے۔" غزالہ بے پرواہی سے بولی۔ "اس کے فضول کام کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے۔"

"اچھا آپ بیٹھیں۔ میں کچھ کھانے کو لے لوں۔" عمار جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔ کسی کا رقیب بننے میں اسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فقط آنکھوں اور پیشانی کی شباہت سے وہ اسوہ کی جگہ تو نہیں لے سکتی تھی۔

"جلدی آنا۔" وہ بادل نخواستہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ عمار نے ڈائننگ ٹیبل کے قریب جا کر پلیٹ رکھی اور پلٹ کر دیکھا ۔غزالہ زوہیب کی طرف متوجہ ہو کر اسے کوئی جواب دے رہی تھی۔ وہ جلدی سے لوگوں کے ہجوم میں گھل مل گیا۔ جلد ہی اسے ایک اور شناسا نظر آ گیا تھا۔ نوید بٹ صاحب جس کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور وہ مستقل کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ موٹا تازہ نوید بٹ خاصا خوش خوراک تھا۔

"ارے نوید صاحب!.... آج تو کشتوں کے پشتے لگا رہے ہیں آپ۔" عمار نے اس کی ہاتھ میں تھامی چبائی ہوئی ہڈیوں سے بھری پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"عمار صاحب!.... آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم دشمن کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنے کے عادی ہیں اور ہماری بٹ برادری کا تو مشترکہ دشمن گوشت ہی ہے، چاہے چکن ہو، چاہے مٹن یا بیف، بس اچھا پکا ہونا چاہیے۔"

"آپ کی لڑائی تو میرا خیال ہے کافی دیر جاری رہے گی، کیوں نہ بیٹھ کر اس معرکے میں حصہ لیا جائے۔" عمار نے صوفوں کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کا مشورہ دیا۔

"نہیں جی۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "بیٹھ کر تو صرف صلح کے مذاکرات ہوتے ہیں اور وہ سویٹ کے ڈونگے کی موجودی میں ہوں گے۔"

عمار کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے بازو پر کسی کا لمس محسوس ہوا اس کے ساتھ اس کے کانوں میں غزالہ کی آواز پڑی۔ "یہ خوب رہی، مجھے وہاں انتظار کی سولی پر لٹکا کر خود یہاں گپیں ہانکنے لگے۔"

عمار نے بہ ظاہر خفت بھرے انداز میں کہا۔ "معذرت خواہ ہوں نوید صاحب نظر آگئے تھے دو منٹ ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔"

"اسلام علیکم انکل!...." غزالہ نے اپنے سر کو خفیف سا جھکاتے ہوئے نوید بٹ کو سلام کہا۔

"وعلیکم اسلام بیٹی!.... کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔ انکل!.... اگر آپ اجازت دیں تو میں عمار صاحب کو ساتھ لے جاؤں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" اسے خوش دلی سے کہتے ہوئے وہ عمار کی جانب متوجہ ہوا۔ "ایسکیوزمی عمار صاحب!" کہہ کر وہ ڈائینگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلیٹ میں فقط ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔

"ہونہہ۔" کہہ کر وہ غزالہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کا کزن کہاں غائب ہو گیا؟"

وہ مسکرائی۔ "اس کی خاطر خواہ عزت کر دی ہے اب اتنی جلدی نہیں آنے والا۔"

"ویسے معاملہ کیا ہے؟" عمار نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ اسی کو پتا ہو گا۔" غزالہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی۔

"ویسے آپ کو بھی معلوم ہونا چاہیے۔"

"چھوڑو اسے آؤ بیٹھ کر گپ کرتے ہیں۔" غزالہ نے قریب پڑے صوفے کی طرف کھینچا۔ وہاں پہلے سے ایک جوڑا بیٹھا مصروفِ گفتگو تھا۔

وہ عشائیہ سلطان بشیر الدین اپنی کوٹھی کے وسیع لان میں دے رہا تھا۔لان کے وسط میں لمبی چوڑی ٹیبل مختلف قسم کے لوازمات سے بھری پڑی تھی۔خالی ہونے والے ٹرے،ڈونگے اور سیفن ڈشوں کو مستعد بیرے سرعت سے بھر دیتے تھے۔کچھ لوگ تو گھومتے پھرتے گپ شپ کرتے کھانے پینے میں مصروف تھے جبکہ اکادکا ڈائینگ ٹیبل کے اطراف میں ترتیب سے رکھی فوم کے نرم گدوں والی کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھے کھانا کھانے کو ترجیح دے رہے تھے۔

وہ غزالہ کے ساتھ قریب پڑے تین سیٹ والے صوفہ سیٹ پر ٹک گیا۔

”آپ کے والد صاحب نظر نہیں آرہے ؟“غزالہ کے بالکل قریب بیٹھنے پر وہ تھوڑا سا کنارے کی طرف کھسک کر اس سے مستفسر ہوا۔

”انھیں ایک ضروری کام تھا کافی دیر ہوئی وہ چلے گئے ہیں۔“

”بس میں بھی رخصت لوں گا،کافی دیر ہو گئی ہے۔صبح آفس بھی جانا ہوتا ہے۔“

”کیا اجازت مانگنے کے لیے ہی یہاں تک آئے تھے۔“غزالہ نے منہ بنا کر کہا۔اس کے انداز پر عمار کو ہنسی آ گئی تھی۔

”اب میرے پاس تو کوئی خاص بات ہے نہیں اور عورتوں سے باتیں کرنے کا طریقہ تو مجھے یوں بھی نہیں آتا۔“

”میں آپ کو عورت نظر آرہی ہوں۔“

”تو کیا آپ مرد ہیں؟“عمار نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

"میں لڑکی ہوں عمار صاحب!...." غزالہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"ہا....ہا....ہا" عمار نے قہقہہ لگایا۔ "میں تو ڈر ہی گیا تھا۔

"آپ اتنے بڑے ہو گئے اور آپ کو لڑکی اور عورت کا فرق ہی نہیں معلوم۔"

"کہا تو ہے اس معاملے میں بہت نالائق ہوں۔"

"اچھا میں سکھا دوں گی۔" غزالہ اس کی جان بخشی کرتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔

"چلیں سکھا دینا، مگر اب اجازت چاہوں گا۔" عمار گھڑی پر نگاہ دوڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا پھر کب ملو گے؟" وہ بھی بادل نخواستہ اس کی تقلید میں کھڑی ہو گئی۔

"کیا کہہ سکتا ہوں۔" عمار نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اب غزالہ کے ساتھ اس کا کوئی ایسا رشتا تو تھا نہیں کہ ملاقاتیں طے ہونا شروع جاتیں۔

"کل شام کا کھانا میرے ساتھ کھانے کے بارے کیا ارادہ ہے؟" غزالہ نے جھٹ ملاقات کا وقت طے کر دیا تھا۔

"مجھے خوشی ہوتی، مگر میں دفتر سے کافی دیر سے اٹھتا ہوں۔ آج بھی بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے۔"

"انکل سلطان کے لیے وقت نکل سکتا ہے اور میرے لیے نہیں۔" غزالہ منہ پھلاتے ہوئے بولی۔

"اس کے ساتھ میرے کاروباری روابط ہیں مس غزالہ!....اور اس کی دعوت ٹھکرانا میرا خیال ہے مناسب نہیں تھا۔" عمار نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔

"اور میرے ساتھ تو بس چند منٹ کی شناسائی ہے، ہے نا؟" اس نے عمار کی سوچ کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا۔

عمار نے صاف گوئی سے کہا۔ "آپ کی بات کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔"

"اچھا سنڈے نائیٹ کو تو مل سکتے ہیں نا۔" عمار کے واضح انکار کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

"اگر فارغ ہوا تو آپ کی دعوت سے ضرور لطف اندوز ہوں گا؟" عمار نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اسی بہانے اپنا سیل فون نمبر ہی دے دیں تاکہ میں آپ سے پوچھنے کے بہانے دو منٹ بات ہی کر لوں ۔" غزالہ اس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آرہی تھی۔

"یہ لو میر اوزٹنگ کارڈ رکھ لو۔" اپنی جیب سے کارڈ نکال کر غزالہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے چل پڑا۔ مس غزالہ تو پکی گلے ہی پڑ گئی تھی۔ وہ اسے سختی سے جھڑکنا نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کا ارادہ غزالہ کے والد احسان علی شاہ کے ساتھ روابط بڑھانے کا تھا اور اس کی بیٹی کے ساتھ دشمنی کر کے شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ پھر اپنی اسوہ کی مشابہ آنکھیں بھی اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھیں۔

اپنے میزبان سلطان بشیر الدین کے پاس جا کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے جانے کی اجازت مانگی۔

"بہت بہت شکریہ عمار صاحب!.... کہ آپ نے میری پارٹی کو رونق بخشی۔ سلطان نے جواباً شکریہ ادا کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

عمار اس سے الوداعی مصافحہ کر کے باہر کی طرف چل پڑا۔

غزالہ اسی جگہ پر بیٹھی عمار کی جانب نگران تھی۔ اسے گیٹ کی طرف بڑھتا دیکھ کر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ اسی وقت اس کی نظر زوہیب پر پڑی جو عمار کے پیچھے گیٹ سے نکل رہا تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ میزبان سے اجازت لیے بغیر تیز قدموں سے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مہمانوں نے اپنی گاڑیاں کوٹھی کی سامنے کی دیوار کے ساتھ ہی ترتیب سے پارک کی ہوئی تھیں۔ کیونکہ اتنی زیادہ گاڑیوں کا کوٹھی کے اندر پارک کرنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ کچھ خصوصی مہمانوں کی گاڑیوں کو کوٹھی کے اندر کھڑا کرنے کی اجازت ملی تھی۔

عمار اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک مانوس آواز پڑی۔

”بات سنو مسٹر عمار“!

وہ حیرانی کے عالم میں پیچھے مڑا۔ زوہیب کو دیکھ کر اس کی حیرانی دوچند ہو گئی تھی۔

”جی؟“ اس نے مختصراً پوچھا۔

”مسٹر عمار!.... تمھارے لیے بہتر یہی ہو گا کہ غزالہ سے دور رہو۔“ اس نے فلمی ہیرو کے انداز میں کہا۔

”میں اس کے قریب کب ہوا ہوں محترم؟“ عمار نے استہزائی لہجے میں پوچھا۔

”تو یہ کیا تھا، آج پارٹی میں پورا وقت تم اس کے آگے پیچھے گھومتے رہے۔“

”میں یا وہ۔“ عمار نے اسی انداز میں پوچھا۔

”شاید تمھیں میری تنبیہہ مذاق لگ رہی ہے۔“ زوہیب نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”انداز تو ایسا ہی ہے تمھارا۔“ عمار کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اب وہ کوئی گیا گزرا مفلس نہیں تھا۔

”تم جیسوں کو سیدھا کرنا مجھے آتا ہے۔“ زوہیب غصے سے بپھر گیا تھا۔

”زوہیب کیا مسئلہ ہے تمھارے ساتھ؟“ عمار اسے جواب دینے کے لیے لب ہلانے ہی لگا تھا کہ اس کے کانوں میں غزالہ کی آواز پڑی۔ وہ ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

”کچھ نہیں یونھی عمار صاحب سے کوئی کام تھا۔“ اسے دیکھ کر زوہیب ایک دم آپے میں آ گیا تھا۔

”مسٹر زوہیب!.... میں نے تمھاری باتیں سن لی ہیں اور میں تمھاری حیثیت بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔ جس شخص کو تم دھمکا رہے ہو اگر وہ چاہے تو شاید اگلے گھنٹے ایک میں تم کہیں حوالات میں بند نظر آؤ۔ اپنی حیثیت کو پہچانو۔ میں تمھیں پہلی اور آخری بار متنبہ کر رہی ہوں اس کے بعد اگر تم عمار صاحب کے آس پاس پھٹکتے نظر آئے تو انجام کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“ غزالہ کا تلخ و ترش لہجہ عمار کو بھی ششدر کر گیا تھا۔

زوہیب صفائی پیش کرتا ہوا بولا۔ ”مگر میں نے تو عمار صاحب کو نہیں دھمکایا۔“

”مسٹر زوہیب!.... انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہییں اور اپنی حیثیت کے مطابق خواب دیکھنے چاہییں۔ تمھارے دل میں جو خواہش پل رہی اس کا پورا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس لیے میرے کم کہے کو مکمل جان کر یہاں سے غائب ہونے کی کرو۔“

”ایک اجنبی شخص کے لیے آپ میرے ساتھ یوں بیگانوں کی طرح پیش آ رہی ہیں۔“ زوہیب شکوہ کناں ہوا۔

”تمھیں، میرے کسی شناسا کے ساتھ اس طرح بات کرنے کا حق کس نے دیا اور یہ غلط فہمی دماغ سے نکال دو کہ عمار صاحب میرے لیے اجنبی شخص ہیں۔“

”آپ اچھا نہیں کر رہی ہیں۔“ مدافعاتی انداز میں کہتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے دور ہٹنے لگا۔

”میں معذرت خواہ ہوں عمار صاحب!“ اس کے غائب ہوتے ہی وہ عمار کو مخاطب ہوئی۔ ”میں نے اسے آپ کے تعاقب میں آتے دیکھ لیا تھا۔ اور کوشش کے باوجود اس کے بکواس کرنے سے پہلے یہاں نہ پہنچ پائی۔ بہ ہر حال میں اس کے رویے پر معافی کی خواست گار ہوں۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے یونھی اسے اتنا زیادہ ڈانٹ دیا۔ نہ میں موم کا بنا ہوں کہ اس کی دھمکیاں میرے لیے کوئی اہمیت کی حامل ہوتیں اور نہ میرے دل میں کوئی ایسی بات ہے کہ جس قسم کی غلط فہمیاں وہ دل میں پالے گھوم رہا ہے۔“

”اچھا چھوڑو اس بحث کو۔“ وہ عمار کی بات سن کر ملول سی ہو گئی تھی۔ ”کیا آپ مجھے گھر تک لفٹ دے سکتے ہیں “؟

”آپ آئی کس کے ساتھ تھیں؟“

”پاپا کے ساتھ آئی تھی اور مجھے واپس لے جانا اس نے زوہیب کے ذمہ لگایا تھا۔ لیکن اب میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔“

”میرا خیال ہے چھوڑیں جھگڑے کو اس غریب سے کوئی اتنا بڑا قصور بھی سرزد نہیں ہو گیا کہ آپ اس سے تعلق ہی توڑ دیں۔“

"گویا آپ کو مجھے میرے گھر تک لفٹ دینے میں کوئی خاص حرج محسوس ہو رہی ہے؟" غزالہ نے خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جادوئی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں۔اگر آپ میرے ساتھ ہی جانے پر مصر ہیں تو آئیں بیٹھیں مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" ان آنکھوں کے حکم پر اسے ہاں کرتے ہی بنی۔غزالہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور "شکریہ ۔" کہتے ہوئے بے تکلفی سے اگلی نشست کا دروازہ کھول کر براجمان ہو گئی۔

عمار نے کار ریورس کر کے باقی کاروں کے درمیان سے نکالی اور غزالہ سے اس کے گھر کا پتا پوچھ کر کار اس طرف بڑھا دی۔

"آپ خفا تو نہیں ہیں؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد غزالہ مستفسر ہوئی۔

عمار نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ مجھے خفا ہونے کی ضرورت پڑے؟"

"زوہیب میرے تایا کا بیٹا ہے۔نکما، نکھٹو، چھچھورا اور اول نمبر کا ڈھیٹ۔تایا جان بھی اس سے سخت نالاں ہیں ۔خود تایا جان ایک چھوٹی سی ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک ہیں۔بس گزر بسر ہو جاتی ہے۔جبکہ موصوف کے سٹائل اور فیشن ختم ہونے میں نہیں آتے۔مر مر کے تھرڈ ڈویژن بی اے پاس کی اور آگے پڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔مجھ سے محبت کا دعوے دار ہے۔دو تین بار پہلے بھی اس کی کلاس لے چکی ہوں لیکن جیسے بتایا ہے نا کہ کافی ڈھیٹ ہے تو اتنی جلد سدھرے والا نہیں۔اب مجھ سے تو اظہار محبت نہیں کرتا مگر میرے بوائے فرینڈز کی ٹو میں رہتا ہے اور میری غیر موجودی میں ان سے بکواس کرنے سے باز نہیں آتا۔آج کا واقعہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔"

”آپ نے بغیر بتائے کافی تفصیل بتادی ہے اس کے لیے شکریہ۔شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔“

”ضرورت تو تھی۔اس احمق کی وجہ سے میں خواہ مخواہ ایک اچھے دوست سے محروم ہو جاتی۔“

”آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟“

”مجھے خوشی ہو گی۔“خوش گوار لہجے میں کہتے ہوئے غزالہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”کسی بھی لڑکی کے ہونٹوں سے بوائے فرینڈ کے الفاظ سن کر مجھے سخت حیرانی ہوتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“غزالہ ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو گئی تھی۔

عمار کو محسوس ہوا کہ اس کی بات کا غزالہ نے کافی برا مانا تھا۔مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا وہ بغیر لگی لپٹی کہنے لگا ۔”شریف اور اچھی لڑکیوں کی دوستیاں لڑکیوں سے ہوتی ہیں۔“

”گویا میں شریف نہیں ہوں۔“غزالہ نے طیش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں نے ایک مجمل بات کی ہے۔کسی کو شرافت کے سرٹیفکیٹ دینے والا میں کون ہوتا ہوں۔البتہ اپنی تہذیب، ثقافت اور شریعت کے مطابق آپ کو میری بات غلط نہیں لگے گی۔“

”پلیز گاڑی روکیں۔“غزالہ نے خشک لہجے میں کہا۔

”کیا ہوا؟“عمار نے بے ساختہ پوچھا۔

”میں نے کہا کار روکو۔“عمار کی بات کا جواب دیے بغیر اس نے اپنی بات دہرائی۔

اور عمار نے انڈیکیٹر دے کر کار کو سڑک کے ایک کنارے کی طرف کر کے بریک لگا دی۔

وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر نیچے اتری اور دروازہ بند کرنے کے بجائے اس کی جانب متوجہ ہو کر بولی ۔"مسٹر عمار!.... غلطی میری تھی کہ آپ کی ذات میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگ گئی تھی۔ آئندہ کسی شخص کا مزاج جانے بغیر اس سے بات چیت سے گریز کروں گی اور مجھے میری اوقات یاد دلانے کا شکریہ۔بہت مہربانی کہ آپ نے یہ جتادیا کہ آپ کی نظر میں میرا کردار کیا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے دھڑام سے دروازہ بند کیا اور ٹیکسی کی تلاش میں دائیں بائیں نظریں دوڑانے لگی۔

عمار کو ہلکی سی خفت محسوس ہوئی کیوں کہ اس کے بات کرنے کا مقصد ہرگز وہ نہیں تھا جو غزالہ اخذ کر رہی تھی ۔ مگر زیادہ وضاحتیں پیش کرنا اسے مناسب نہ لگا۔ جس گاؤں نہ جانا ہو اس کا پتا معلوم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سر جھٹکتے ہوئے اس نے کار آگے بڑھا دی اور سو دو سو میٹر آگے جا کر یوٹرن سے کار واپس موڑلی کہ اس کا گھر مخالف سمت میں تھا۔

☆☆☆

رات کو کھانے کی میز پر اسوہ مدثر کو مخاطب ہوئی۔"مدثر بھائی!.... اگر ہو سکے تو کل دفتر سے واپسی پر تین چار اخبار لیتے آنا۔"

اسماء ہنسی۔"ضرور کل آجائیں گے۔"

"کیا مطلب؟" اسماء نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

”ہفتہ ہو گیا ہے دو رسالے کہے تھے اور روزانہ صبح یاددہانی بھی کرادیتی ہوں مجال ہے کہ نہ لانے پر کوئی ندامت محسوس ہوتی ہو۔“

”خیر یہ تو جھوٹ ہے کہ محترما ہفتے بھر سے کہہ رہی ہیں۔ پرسوں کہا تھا مصروفیت کی وجہ سے نہ لا سکا۔“ مدثر نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

”چلو دیکھ لیتے ہیں کون سچا ہے۔“ اسماء نے منہ بناتے ہوئے بحث کا گلا گھونٹا۔

”ہماری بیگم صاحبہ کو سوائے باتوں کے اور آتا کیا ہے؟“ مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے مدثر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

مدثر کی والدہ اور نسرین بھی کھانے کے میز سے اٹھ کر ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگیں۔ جبکہ اسوہ برتن سمیٹنے میں اسماء کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اسماء کے کئی بار منع کرنے کے باوجود وہ شام کو برتن سمیٹنے اور دھونے میں اس کا ہاتھ ضرور بٹاتی۔

برتن دھوتے ہوئے وہ اسماء کو کہنے لگی۔ ”کل سے مجھے روٹیاں بنانا سکھانا ہے، جب تک کوئی نوکری نہیں مل جاتی یہ تو سیکھ لوں۔“

”ضرورت ہی کیا ہے۔“ اسماء نے قہقہہ لگایا۔ ”جب نوکری ہی کرنا ہے تو اس کام پر شوہر کو لگا دینا۔“

”شوہر ہو گا تو روٹیاں پکائے گا نا۔“

”مل جائے گا یار!.... مجھے امید ہے کہ تم زیادہ عرصہ انتظار نہیں کر پاؤ گی۔“

"بھول ہے تمھاری۔" اسوہ عزم سے بولی۔"عمار کا انتظار میں اس وقت کروں گی جب تک بالوں میں چاندی نہیں اتر آتی۔"

"اور اس کے بعد؟" اسماء نے بے ساختہ پوچھا۔

اسوہ اطمینان سے بولی۔"اس کے بعد یوں بھی اس بڑھی کھوست کو کسی نے منہ نہیں لگانا۔

"شدت پسندی اسی کو کہتے ہیں۔"

"شدت پسندی نہیں وفاداری کہو۔" اسوہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"کسی وعدے وعید کے بغیر وفاداری؟" اسماء نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"اس نے تو وعدہ کیا تھا ناں، کہ وہ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔"

کیا جواباََ تم نے اسے امید دلائی تھی کہ وہ اپنے وعدے پر کاربند رہ پاتا؟"

"نہیں کیونکہ اس کا دعوا یک طرفہ تھا۔میرے کسی اظہار کے بغیر اس نے یہ دعوا کیا تھا۔اور اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے لیے کیا ہے۔اور یقین مانو اب میں خود کو اس کے وعدے کا گرفتار سمجھتی ہوں۔"

اسماء نے دکھی لہجے میں کہا۔"سچ کہتے ہیں خوش فہمیاں انسان کو برباد کر دیتی ہیں۔"

"ایسی بربادی پر ہزاروں آبادیاں بھی قربان۔" اسوہ نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

اور اسماء افسوس بھرے انداز میں سر ہلا کر برتن دھونے کی طرف متوجہ ہو گئی۔اسوہ کو سمجھانے کی اس کی ہر کوشش ناکام گئی تھی۔

صبح کی نماز پڑھتے ہی اسوہ باورچی خانے میں گھس کر چائے بنانے لگی۔ صبح کی نماز کے بارے اسماء کا ہاتھ تھوڑا تنگ ہی تھا۔ مدثر مسجد سے نماز پڑھ کر لوٹتا اور پھر دفر جانے تک وہ اسماء کو جگاتا ہی رہتا تاکہ وہ اس کے لیے ناشتا بنادے۔ اکثر تو وہ طوعن وکرہن اٹھ کر ناشتا بنادیا کرتی۔ مگر کبھی کبھار عمار کو خود اپنے لیے چائے بنا کر توس ڈبل روٹی وغیرہ کھا کر دفتر جانا پڑ جاتا۔ البتہ جب سے اسوہ آئی تھی وہ اپنے اور ماں کے ساتھ اس کے لیے بھی چائے بنادیا کرتی۔

”چائے، مجھے بھی مل جائے گی؟“ روزانہ کی طرح آج بھی اس باورچی خانے میں جھانکتے ہوئے اس نے آواز دی۔

”چائے تو مل جائے گی پر اٹھے وغیرہ کے لیے اسماء بہن کو آواز دینا پڑے گی۔“

”اسے جگانا سر درد ہی ہے۔“ کہتے ہوئے وہ واپس مڑ گیا اسوہ بھی مسکرادی تھی۔

وہ بہ مشکل چائے بنا کر فارغ ہوئی تھی کہ اسماء جمائیاں لیتی ہوئی باورچی خانے میں آ گھسی۔

بے چاری عورتیں بھی کتنی مجبور ہوتی ہیں کہ ہر وقت شوہر کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے۔“ اسوہ اسے چڑانے کے لیے افسوس بھرے انداز میں سر ہلانے لگی۔

”جی....جی معلوم ہے۔“ اسماء منہ بنا کر فرج سے گوندا ہوا آٹا نکالنے لگی۔

”اسی لیے تو میں شادی نہیں کرتی۔“ خاطر خواہ جواب نہ ملنے پر اسوہ نے اسے دوبارہ چھیڑا۔

"جس کا انتظار کر رہی ہو وہ تو محترما کو کو سلا کر لوری سنایا کرے گا نا؟"

"اس میں شک ہی کیا ہے، بستر ہی پر ناشتا لا کر اپنے ہاتھوں سے کھلائے گا۔"

"کچھ ایسے ہی دعوے تمھارے مدثر بھائی نے مجھے شادی پر راضی کرنے کے لیے کیے تھے۔"

"ہا....ہا....ہا۔" اسوہ نے قہقہہ لگایا۔ "مدثر بھائی تو اتنے اچھے ہیں ورنہ اس کی جگہ کوئی سخت مزاج شوہر ہوتا تو دیتا کھینچ کر کان کے نیچے دو اور پوچھتا اب تک ناشتا تیار کیوں نہیں ہوا۔ تب دیکھتی کہ محترما کتنی دیر بستر پر پڑی اینڈتی رہتی ہے۔"

"مجھے ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔" اسماء تنک کر بولی۔

"ڈرا ڈرا کر خون خشک کیا ہوا ہے بے چارے شوہر کا۔ ایسی بیوی بھی خدا کسی کو نہ دے۔" اسوہ ایک دم اپنی بات سے پھر گئی تھی۔

"یہ ساری شوخیاں شادی تک ہی ہیں بی بی!" چولھے پر توا رکھ کر وہ گوندھے ہوئے آٹے کے گول گول پیڑے بنانے لگی۔

"اچھا چھوڑو فضول بحث کو، مجھے بھی پراٹھے بنانا سکھا دو تا کہ جب تک میں یہاں موجود ہوں تمھاری صبح کے ناشتے سے جان چھوٹی رہے۔" اور اسماء خوش دلی سے اسے سکھانے لگی۔

والد کی وفات سے پہلے تو اسوہ کو کبھی باورچی خانے میں جا کر روٹی بنتے دیکھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ البتہ والد کی وفات کے بعد متعدد بار وہ اپنی ماں کو دیکھ چکی تھی۔ لیکن کبھی خود اس نے روٹی بنانے میں دلچسپی نہیں لی تھی ۔ابھی ایک دم اسے یہ شوق چرایا اور وہ اسماء کے سر ہو گئی۔

"اسوہ!...." دفتر سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اسوہ کو آواز دی۔

وہ اس وقت اسماء کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "مدثر بھائی شاید مجھے آواز دے رہے ہیں۔" اسماء بھی اس کی تقلید میں چل پڑی تھی۔

"جی مدثر بھائی!" اس نے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

مدثر نے بغل میں دبایا ہوا اخبارات کا بنڈل نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ "یہ لو، کل تم اخبار مانگ رہی تھیں نا۔"

اخبارات کا بنڈل اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ بولی۔ "شکریہ مدثر بھائی۔"

"واہ جی، بہن کی فرمائش تو نہیں بھولی۔" اسماء نے طنزیہ انداز میں کہا۔

مدثر اس کی جانب ایک رسالہ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تمھارا بھی ایک رسالہ تو لے آیا ہوں، دوسرا اس بک سٹال پر دستیاب نہیں تھا۔"

"تو شہر میں یہی ایک بک سٹال ہے کیا۔" اسماء نے منہ بناتے ہوئے اس کے ہاتھ سے رسالہ پکڑا اور کمرے کے جانب مڑ گئی۔ اسوہ پہلے ہی اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔ مدثر پانچ مختلف اخبارات لے کے آیا تھا۔ تمام اخبارات کے اشتہارات پڑھنے کے بعد اسے اپنے مطلب کے فقط دو اشتہار نظر آئے تھے۔ گو دونوں پوسٹیں

اس کی تعلیم سے میل نہیں کھاتی تھیں مگر اچھی نوکوری کے انتظار میں وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتی تھی ۔کچھ نہ ہونے سے ہونا بہت بہتر تھا۔اس طرح کم از کم اسے جاب کا تجربہ تو حاصل ہوتا رہتا۔انٹرویو کے لیے دو دن بعد کی تاریخ دی گئی تھی۔تاریخ اور وقت اپنے پاس نوٹ کر کے وہ اہم سرخیوں اور خبروں پر نظر دوڑانے لگی۔

☆☆☆

انٹر کام کی گھنٹی بجتے ہی عمار نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ٹیلی فون آپریٹر تھی۔

”سر!.... مس غزالہ بات کرنا چاہتی ہیں۔“

”جی ملاؤ۔“اس نے قدرے حیرانی سے کہا۔دو دن پہلے اس کے ساتھ جس قسم کی بد مزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد اس کا بات کرنا حیران ہی تھا۔

آپریٹر نے کال تھرو کر دی تھی۔”اسلام علیکم!.... عمار بات کر رہا ہوں۔“اس نے اپنے لہجے میں پرانی تلخی کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیا تھا۔

”وعلیکم اسلام عمار صاحب!.... پہچانا میں غزالہ احسان ہوں۔“اس کی چہکتی ہوئی آواز عمار کے کانوں میں پڑی۔

”جی فرمائیں۔“اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”میں نے بہت بڑا گلا کرنے کے لیے کال کی ہے۔“وہ بے تکلفانہ لہجے میں کہنے لگی۔

”سن رہا ہوں۔“وہ مختصرا ًبولا۔اسے پچھلی ملاقات بھولی نہیں تھی۔

"آپ نے اس دن مجھے جو وزٹنگ کارڈ تھمایا تھا اس میں آپ کا سیل فون نمبر ہی درج نہیں ہے اور میں نے آپ سے موبائل فون نمبر مانگا تھا۔"

"مقصد مجھ سے رابطہ کرنا ہی تھا نا، اور میرا خیال ہے آپ مجھی سے بات کر رہی ہیں۔"

"مجھے آپ کا سیل فون نمبر چاہیے ابھی اور اسی وقت۔" اس نے لاڈ بھری ہٹ دھرمی سے کہا۔

"کیا کرو گی؟ یوں بھی میر سیل فون عموماً بند ہی رہتا ہے۔ میں اسی نمبر پر صبح آٹھ بجے سے شام پانچ چھے بجے تک دستیاب ہوتا ہوں۔ واپسی پر کچھ لمحات گھر والوں کے ساتھ گزارنا پڑتے ہیں اس کے بعد یوں بھی آرام کا وقت ہوتا ہے۔ تو یقیناً میرا سیل فون نمبر اس نمبر سے بھی کم دستیاب ہو گا۔" اس نے جان چھڑانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

"آپ کی یہ ساری تقریر بے فائدہ رہی کیونکہ میں اب بھی اپنے مطالبے سے دست بردار نہیں ہوئی۔" اس کا اصرار جاری رہا۔

عمار نے انکار میں لب ہلانے چاہے مگر پھر جانے کیا سوچ کر اس نے اپنا موبائل فون نمبر بتا دیا۔ شاید اس کی آنکھیں یاد آ گئی تھیں جو اسوہ کی طرح روشن، سرمگیں اور پرکشش تھیں۔

"شکریہ جی!.... میں موبائل فون پر کال کر رہی ہوں۔" اس نے عمار کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کیا۔ اگلے ہی لمحے ایک انجان نمبر سے کال آنے لگی۔ موبائل فون کان سے لگا کر اس نے اٹنڈنگ نمبر پریس کیا۔

"جی اب بات کریں۔" وہ غزالہ ہی تھی۔

"آپ ہی کو کوئی کام تھا۔" اس نے قدرے بے زاری سے کہا۔ کیونکہ غزالہ کا بے تکلف ہونا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب سے اس نے ایسی محافل میں شرکت کرنا شروع کی تھی اس طرح کی لڑکیوں سے اس کا پالا پڑتا رہتا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بھی غزالہ کی طرح ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے نہیں پڑی تھی۔ یوں بھی وہ ایسی لڑکیوں سے گھلنے ملنے سے اس لیے پرہیز کرتا کہ اکثریت اس کی دولت کی وجہ سے اس کی جانب مائل ہوتی تھیں۔ گو اپنا شمار وہ خوش شکل مردوں میں کر سکتا تھا مگر اس کی خوب صورتی کوئی اتنی بھی انوکھی بھی نہیں تھی کہ ہر لڑکی اس پر مر مٹتی۔ البتہ وہ جوان تھا یو اے گروپ آف کمپنیز کا مالک تھا۔ یہ بات یقیناً نوجوان لڑکیوں اور ان کے والدین کے لیے حد سے زیادہ کشش کا سبب تھی۔

وہ بولی۔ "میں نے معذرت کے لیے کال کی تھی۔"

"معذرت، مگر کس بات پر؟"

"اس دن میں ذرا جذباتی ہو گئی تھی۔ حالانکہ آپ کی بات بالکل درست تھی۔

"میری نظر میں وہ بات اتنی اہمیت کی حامل نہیں کہ اس پر معذرت کی جائے اور یوں بھی ہر آدمی کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے۔ اور میں اپنے خیالات کسی پر ٹھونسنا پسند نہیں کرتا۔"

"چاہے کسی کے نزدیک وہ خیالات بہت زیادہ قیمتی اور اہمیت کے حامل ہوں۔"

عمار طنزیہ ہنسی سے گویا ہوا۔ "جی ہاں، اس دن مجھے اپنے خیالات کی اہمیت نظر آ گئی تھی۔"

"ہاہاہا۔" اس کے نقرئی قہقہے نے عمار کے کانوں میں رس گھولا۔ "معافی چاہتی ہوں عمار صاحب!.... میں ذرا جذباتی لڑکی ہوں۔ فائدے نقصان کی بات دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔"

”ٹھیک ہے معاف کر دیا۔ اب اجازت دو کیونکہ بہت کام کرنا ہے۔“

”شکریہ، اب بس یہ بتادیں کہ کتنے بجے تک آپ میرے پاس پہنچ جائیں گے۔“

”کہاں، کیوں؟“ عمار کی سمجھ میں اس بات نہیں آئی تھی۔

”افوہ، کتنے بھلکڑ ہیں آپ بھی۔ اس دن وعدہ جو کیا تھا کہ سنڈے نائیٹ کو آپ میرے ساتھ ڈنر کریں گے۔“

”میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔“ عمار نے روکھے پن سے جواب دیا۔

”ایسی ہی بات ہوئی تھی اور آپ کو آنا پڑے گا۔“

عمار نے بحث کرنے کے بجائے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس سے بہتر اسے کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔ اس کے بعد ایک دو بار گھنٹی بجی اور اس نے موبائل فون آف کر کے ٹیلی فون آپریٹر کو بھی بتادیا کہ اگر غزالہ نام کی کسی لڑکی کال آئے تو اسے تھرو نہ کرے۔ اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ پانچ بجے باقی سٹاف کی چھٹی ہوئی مہ جبین بھی اجازت مانگ کر چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد عبدالحکیم اس کی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اور جب عمار چھٹی کرتا تو وہ اسے گھر ڈراپ کرتا جاتا۔ چھے ساڑھے بجے وہ عمار کے لیے خود چائے تیار کر کے لے جایا کرتا۔

اس دن بھی وہ چائے بنانے کے لیے اٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک خوب صورت سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ یقیناً اس نے چوکیدار سے عمار کے دفتر کی جگہ معلوم کر لی تھی کہ سیدھا اسی طرف آئی تھی۔

”انکل!.... عمار صاحب سے ملنا ہے۔“

”یہ سامنے دروازہ ہے بیٹی!“ عبدالحکیم نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"شکریہ انکل!....اس نے ایک دلکش ہنسی اس کی جانب اچھالی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ جبکہ عبدالحکیم چائے بنانے کے لیے چل دیا کہ اب تو مہمان آ گئی تھی۔

عمار نے تھکے تھکے انداز میں ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگائی اور سکرین پر لکھے اعداد و شمار کو گھورنے لگا۔ دروازہ ہلکے سے بجا۔

"یس۔"اس نے سوچا شاید عبدالحکیم ہے۔

دروازہ کھول کر غزالہ اندر داخل ہوئی۔ سفید شلوار قمیص اور سر پر اوڑھے دوپٹے نے اس کی دلکشی میں چار چاند لگا دیے تھے۔

"ارے آپ۔"وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

"جی ہاں میں۔"اپنے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے وہ آگے بڑھی۔"آپ کا کیا خیال تھا کہ رابطہ منقطع کر کے آپ مجھ سے جان چھڑا لیں گے۔"

"دیکھ لیں اب تک کام میں مصروف ہوں۔"عمار سے اور کوئی بات نہیں بن پائی تھی۔

"لڑکیوں کا لڑکوں سے ہاتھ ملانا یقیناً آپ کو ناگوار گزرتا ہے اس لیے میں ہاتھ نہیں ملاؤں گی البتہ آپ مجھے بیٹھنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔"اس نے یہ الفاظ اس انداز میں کہے کہ عمار کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔"پلیز بیٹھیں۔"اس نے ہاتھ سے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

"اور ہاں میرے کپڑوں اور دوپٹے کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں، آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ کو میرا یہ لباس پسند آیا ہے۔"

"صحیح کہا۔ لڑکیاں، لڑکیوں کے لباس ہی میں اچھی لگتی ہیں۔"

"میں نے آپ کو اتنے سرپرائز دیے ہیں اب ایک سرپرائز دینا تو آپ کا حق بنتا ہے نا؟" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے آج کا ڈنر میری جانب سے ہو گا۔" عمار کو اس کا دل توڑنا مناسب نہ لگا۔ وہ اسے کسی مناسب طریقے سے سمجھانا چاہتا تھا۔ یوں بھی وہ اس کے والد سے اچھے تعلقات کا خواہاں تھا۔

"زندہ باد۔" غزالہ نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ "ویسے مجھے یقین تھا کہ میں آپ کو راضی کر لوں گی۔"

اسی وقت عبدالحکیم دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے میں چائے کی تین پیالیاں رکھی تھیں۔

"میرا خیال ہے انکل جی آپ کے سیکرٹری ہیں۔" غزالہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"نہیں۔" عمار نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری سیکرٹری مہ جبین ہے۔ چچا عبدالحکیم تو میرے سرپرست ہیں۔ جب سیکرٹری چھٹی کرتی ہے تو چچا میرا خیال رکھنے کے لیے بیٹھے رہتے ہیں۔"

"واہ، یہ کیسی سیکرٹری ہے جو باس سے پہلے چھٹی کر لیتی ہے، یقیناً آپ نے سیکرٹری کو کافی سر پر چڑھایا ہوا ہے۔" غزالہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات، مہ جبین بہت اچھی لڑکی ہے مگر میں روزانہ دیر سے اٹھتا ہوں اور اس کا کوئی خاص کام ہوتا نہیں اس لیے اس وقت تک اسے پاس بٹھانا مناسب نہیں لگتا۔"

چائے کے کپ ان کے سامنے رکھ کر عبدالحکیم باہر جانے لگا۔ عمار کے ساتھ مہمان بیٹھا ہونے کی صورت میں وہ وہاں بیٹھنے سے گریز کیا کرتا تھا۔

"چچا جان!.... آپ کہاں چل دیے؟" عمار نے اسے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"آپ گپ شپ کر رہے تھے تو میں نے سوچا"....

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ بیٹھیں۔" عمار نے قطع کلامی کر کے کہا۔ اسے غزالہ کے ساتھ اکیلا بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

عبدالحکیم ٹرے میز پر رکھ کر چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔

"اچھا آپ کس وقت چھٹی کریں گے؟" غزالہ مستفسر ہوئی۔

دیوار پر ٹنگی گھڑی پر نگاہ دوڑا کر اس نے جواب دیا۔ "گھنٹا بھر تو لگ ہی جائے گا۔"

"آج پہلے چھٹی کر لو نا؟" وہ لاڈ بھرے انداز میں مصر ہوئی۔

"اگر پہلے بھی چھٹی کر لوں تب بھی آپ کے ساتھ جانے سے تو رہا۔ ڈنر تو کہیں رات نو دس بجے ہی کریں گے۔"

"ڈنر بے شک بارہ بجے کر لیں گے، مگر آپ کو آنا آٹھ بجے ہی پڑے گا، مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

عمار نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ "ٹھیک ہے آپ چلیں، میں بھی چھٹی کرتا ہوں۔ اور یہ بتاتی جانا کہ آپ ڈنر کس ہوٹل میں کرنا پسند کریں گی؟"

"ہوٹل وغیرہ کوئی نہیں جانا۔ بہ قول آپ کے شریف لڑکیاں رات کو ہوٹلز میں نہیں گھومتیں۔" شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ "ڈنر تو آپ کے گھر آکر کروں گی۔"

عمار نے گھبرا کہا۔ "نہیں گھر میں نہیں۔" کیونکہ وہ جانتا تھا کہ غزالہ اس کے گھر آجاتی تو اس کی ماں اسے بہو کے طور پسند کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگاتی۔ یوں بھی وہ بہت زیادہ خوب صورت تھی۔

"کیوں، بیوی سے ڈر لگتا ہے؟" غزالہ نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

"بیوی سے نہ ڈرنے والا کوئی کنوارا ہی ہو سکتا ہے۔" اس نے غزالہ کی بات کی تردید یا تصدیق کیے بغیر ایسا ذو معنی جواب دیا کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر گھبرا کو مستفسر ہوئی۔

"کیا مطلب، کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" اس کے چہرے پر چھائی خوب صورت مسکراہٹ پس منظر میں چلی گئی تھی۔

"پتا نہیں لوگ مجھے کیوں غیر شادی شدہ سمجھتے ہیں۔" اس مرتبہ بھی وہ ذو معنی لہجے میں بولا تھا۔

"مگر مجھے تو بتایا گیا تھا کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔" غزالہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ " ویسے آپ کی شادی کب ہوئی ہے؟"

"یہ بھی اسی سے پوچھ لینا جس نے میرے غیر شادی شدہ ہونے کے متعلق آپ کو اطلاع دی ہے۔" عمار نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"معافی چاہتی ہوں سر!.... آپ کا وقت ضائع کیا۔" وہ چائے کی ادھ بھری پیالی میز پر رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی ۔"میں جانا چاہوں گی۔"

"چائے تو پی لیں۔" عمار نے بے ساختہ امڈ پڑنے والی ہنسی کو ہونٹوں میں دبا کر کہا۔

"شکریہ عمار صاحب!...." کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اس کے دفتر سے نکل گئی۔

عبد الحکیم نے ہلکی آواز میں قہقہہ لگایا۔"عمار صاحب!.... کمال ہے بغیر جھوٹ بولے بے چاری کو بھگا دیا۔"

"چچا جان!.... یونھی میرا اور اپنا وقت ضائع کر رہی تھی۔"

"ویسے بچی تھی تو بہت پیاری، اگر آپ مجھ سے مشورہ لیتے تو میں اس رشتے کی تائید ضرور کرتا۔"

"صحیح کہا چچا جان!.... خوب صورت تو بہت زیادہ ہے خاص کر اس کی آنکھیں تو بالکل اس کے مشابہ ہیں جس سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی خوب صورت ہی نہیں ہے۔" عمار نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"ویسے یہ کب سے پیچھے پڑی ہے؟" عبد الحکیم نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"اس دن سلطان صاحب کے ہاں عشائیے پر ملاقات ہوئی تھی۔ بلکہ ملاقات کیا خود میرے پاس آئی اور بے تکلف ہونے لگی۔ واپسی پر مجھے مجبور کیا کہ اسے گھر تک لفٹ دے دوں۔ پھر رستے میں میری چھوٹی سی بات پر خفا ہو کر کار سے اتر گئی۔ آج پرانی خفگی بھلا کر پھر نازل ہو گئی۔"

"کسی جاننے والے کی بیٹی ہے کیا؟"

"کوئی خاص جاننے والا تو نہیں کہہ سکتے، بس سلام دعا ہی ہے۔ احسان نام ہے امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ بلکہ سچ کہوں تو اس کے والد سے تعلقات بڑھانے کی تو میری اپنی کوشش ہے کیونکہ کافی ممالک میں وہ سامان برآمد کرتا ہے۔ اس کی وساطت سے نئی کمپنیوں تک ہم اپنی لیدر جیکٹس اور انڈر گارمنٹس کا سامان برآمد کر سکتے ہیں۔" عمار نے تفصیلی جواب دیا۔

"مطلب اسی لیے آپ نے واضح طور پر انکار کرنے کے بجائے غلط فہمی میں مبتلا کر کے ٹرخا دیا۔"

عمار ہنسا۔ "چچا جان!.... یہ بات نہیں ہے۔ جلد یا بدیر اسے معلوم ہو جانا ہے۔ میں نے بس وقتی طور پر جان چھڑائی ہے، کیونکہ آج کام کافی زیادہ بقایا ہے اور وہ کسی صورت ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی!.... آپ پھر کام کریں میں باہر بیٹھتا ہوں۔" عبدالحکیم کھڑا ہو کر چائے کے کپ سمیٹنے لگا۔ جبکہ عمار دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی سکرین کافی دیر سے چھیڑ خانی نہ ہونے پر تاریک ہو چکی تھی۔

"یہ لیں مدثر بھائی!" اسوہ نے مدثر کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھی۔

"ویسے بڑی جلدی سیکھ گئی ہیں آپ۔" عمار اس کے بنائے ہوئے پراٹھے کو دیکھ کر تحسین آمیز لہجے میں بولا۔

"جلدی کیسے ہے مدثر بھائی!.... پچھلے ایک ہفتے سے اسماء بہن کی جان کو آئی ہوئی ہوں۔"

"یقیناً اس نے بھی محنت سے کام لیا تا کہ اس جان صبح کے ناشتے سے بچ جائے۔"

اسوہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔"

اس دن اسماء کی آنکھ اتفاقاً کھل گئی تھی گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ مدثر کے لیے ناشتا بنانے کا وقت ہو گیا تھا۔ آج نہ جانے کیوں وہ اسے جگانے نہیں آیا تھا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی اس کے کانوں میں اسوہ کے زور زور سے ہنسنے کی آواز پڑی۔ وہ اور مدثر کھانے کی میز پر بیٹھے ناشتا کرتے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے ۔ جانے کیوں اسے وہ منظر بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ دو تین منٹ دروازے پر کھڑے ہو کر وہ انھیں گھورنے لگی۔

"اس دن انٹرویو کا کیا بنا؟" مدثر پوچھ رہا تھا۔

اسوہ کہنے لگی۔ "اب تک تو کوئی چھٹی، کال وغیرہ نہیں آئی۔ پرسوں بھی ایک جگہ جانا ہے اللہ کرے گا جلد کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔"

"ویسے میرا مشورہ تو یہی ہے کہ چھوڑو نوکری کو، گھر بیٹھو جو روکھی سوکھی ہم کھا رہے ہیں آپ بھی کھاتے رہنا ۔" مدثر نے بالکل وہی بات کی تھی جو وہ خود بھی دو تین بار اسوہ کو کہہ چکی تھی، مگر مدثر کا کہنا اسے عجیب سا لگا تھا ۔

"نہیں مدثر بھائی!.... میں آپ لوگوں پر اتنا زیادہ بوجھ نہیں ڈال سکتی۔ بس آپ دعا کریں کہ مجھے کوئی اچھی سی جاب مل جائے۔"

مدثر کے جواب دینے سے پہلے وہ گلا کھنکھار کر باہر نکلی۔ مدثر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”چشم بد دور، ہماری بیگم بغیر کسی کے جگائے اٹھ گئیں۔“

”بڑا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔“ وہ اس کے ساتھ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

”حقیقت بیان کر رہا ہوں بیگم صاحبہ!.... اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب اسوہ نے ناشتا تیار کرنا سیکھ لیا ہے۔ انڈہ بھی تم سے اچھا فرائی کر لیتی ہے۔ اس لیے آج کے بعد مزے کرو کوئی تمھیں جگائے گا نہیں ۔“

”مہربانی۔“ کہہ کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”ناشتا تو کر لو۔“ اسوہ نے اسے آواز دی۔

”شکریہ۔“ کہہ کر وہ خواب گاہ میں گھس گئی۔ مگر بستر پر لیٹنے کے بعد بھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ عجیب قسم کے اندیشے اس کے دل میں کروٹیں لے رہے تھے۔ وہ بیڈ پر لیٹی ان دونوں کی باتوں پر کان دھرے رہی۔ گاہے گاہے مدثر یا اسوہ کے ہنسنے کی آواز بھی اس کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ پھر مدثر کمرے میں آکر دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے دفتر جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی ۔ یہاں تک کہ اسوہ نے آکر اسے بستر سے نکالا۔ دوپہر تک اسوہ کے ساتھ گپ شپ کرنے پر اس کے موہوم اندیشے غائب ہو گئے تھے۔ لیکن سہ پہر کو مدثر کی آمد کے ساتھ اس کے جذبات کو نئی تحریک مل گئی۔ اس وقت وہ ٹی وی پر کوئی ڈراما دیکھ رہی تھیں کہ مدثر اندر گھسا اس نے ہاتھوں میں دو تین شاپنگ بیگ پکڑے ہوئے تھے ۔

”معزز خواتین!.... دیکھو تو آپ لوگوں کے لیے کیا تحفہ لایا ہوں۔“ اس نے ہاتھ می ں پکڑے شاپنگ بیگ ان کے سامنے رکھ دیے۔

”یہ کیا ہے؟“ اسماء نے حیرانی سے پوچھا۔ جبکہ اسوہ نے اپنا ہاتھ شاپنگ بیگ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”دیکھو تو سہی۔“ مدثر نے اسے دیکھنے کی دعوت دی۔

انھوں نے شاپرز کھول کر دیکھے وہ کاٹن کے خوب صورت زنانہ لباس تھے۔

”کس خوشی میں لائے ہیں؟“ اسماء مستفسر ہوئی۔

”آج ایم ڈی صاحب نے کچھ زنانہ و مردانہ سوٹ نمونے کے طور پر منگوائے تھے۔ مجھے کپڑا اور اس کے رنگ کافی پسند آئے اور آپ لوگوں کے لیے خرید لیے۔ دو سوٹ اسوہ کے ہیں اور دو آپ کے۔“

”مدثر بھائی!.... میرے پاس تو پہلے ہی کپڑوں کا اتنا ڈھیر لگا ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ یہ آپ آنٹی کو دے دینا۔“

اسماء خاموش بیٹھی رہی۔ مدثر جلدی سے بولا۔ ”اس میں تکلیف کی کیا بات ہے، اسماء کے لیے لا رہا تھا تو مناسب سمجھا کہ آپ کے لیے بھی لیتا جاؤ ں۔ باقی یہ رنگ ایسے نہیں کہ بزرگ خواتین انھیں پسند کریں۔ اور دیکھا آپ کے دونوں سوٹوں کا رنگ آپ کا پسندیدہ رنگ ہے۔ آپ کالا اور گلابی رنگ پسند کرتی ہیں نا؟“

واقعی یہ میرے پسندیدہ رنگ ہیں۔“ اسوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ بہ ہر حال شکریہ مدثر بھائی“!

”تمھیں پسند نہیں آئے محترما!“ وہ اسماء کو مخاطب ہوا۔

"نہیں ٹھیک ہیں۔" وہ اپنے اندیشوں کو دبانے کی کوشش کرتی خاوب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے کپڑے اس نے وہیں چھوڑ دیے تھے۔ وہ بہ مشکل دروازے پہنچی تھی کہ اسوہ کی آواز اسے مزید سلگا گئی۔ "مدثر بھائی !.... چاے لے آؤں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" مدثر چہکا اور اسوہ سر ہلاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ مدثر وہیں ڈرائینگ میں بیٹھ گیا تھا۔

اپنی خواب گاہ میں گھستے ہی وہ مضطرب انداز میں ٹہلنے لگا۔ جانے کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اسوہ، مدثر کو اس سے چھین رہی ہے۔ وہ خطرناک حد تک خوب صوت تھی۔ کسی بھی مرد کی عقل کو خبط کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اور اب جس طرح مدثر اس کی ذات میں دلچسپی لے رہا تھا وہ مستقبل قریب و بعید میں کوئی خطرناک صورت بھی پیدا کر سکتا تھا۔ وہ اسوہ کو گھر لانے کے فیصلے پر پچھتانے لگی۔ اسوہ درخت سے ٹوٹا ہوا پتا تھی۔ اس کے عمار صاحب کا بھی کوئی پتا نہیں تھا کہ کب ملتا۔ مدثر کی مسلسل ہمدردیاں اس کے دل میں مدثر کی ہمدردی کو کسی اور روپ میں ڈھال سکتی تھیں۔ وہ خود بھی تو عمار کی محبت میں مبتلا رہ چکی تھی اور اب مدثر کو پانے کے بعد عمار کی محبت اسے ایک مذاق سے بڑھ کر کچھ نہیں لگتی تھی۔ اسوہ بھی تو اسی کی طرح ایک لڑکی ہی تھی اور اس وقت جن حالات سے گزر رہی تھی ایسے حالات میں تو کسی لڑکی کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت بالکل صفر رہ جاتی ہے۔

"مگر اسوہ ایسی نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی میری پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپے گی۔" ایک مثبت سوچ نے اس کے اندیشوں کو زائل کرنا چاہا۔

"ہر شخص پہلے اپنے بارے سوچتا ہے بعد میں کسی دوسرے کا نمبر آتا ہے۔" اس کے اندیشے تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ اسوہ کا خوب صورت و پرکشش چہرہ کسی بھی مرد کے حواسوں پر قابض ہو سکتا تھا۔ وہ انھی سوچوں میں غلطاں تھی کہ مدثر خواب گاہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"کیا بیگم صاحبہ کو میرے خریدے ہوئے لباس پسند نہیں آئے؟" اس نے کپڑوں کا شاپر بیڈ پر پھینک کر مزاحیہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بہت اچھے ہیں۔" وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر مدثر اس کی بات سنے بغیر تازہ دم ہونے کے لیے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

صبح بھی اسماء کی آنکھ خود بہ خود کھل گئی تھی۔ مدثر اس وقت بستر پر موجود نہیں تھا۔ اسوہ اسے چولھے کے سامنے کھڑی پراٹھا بناتی نظر آئی۔ قدموں کی چاپ سن کر وہ پیچھے مڑی اور اسوہ کو دیکھتے ہی مسکرانے لگی۔ "آج جلدی اٹھ گئیں۔" اس نے عام سے لہجے میں پوچھا مگر جانے کیوں اس کا لہجہ اسماء کو طنزیہ لگا۔

"مدثر خفا ہو رہا تھا کہ میں نے صبح کا ناشتا مستقل اس کی بہن کے متھے مار دیا ہے۔" اسماء نے صفائی سے بات بنائی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مدثر بھائی نا بس یونھی الٹا سیدھا سوچتے رہتے ہیں۔" اسوہ نے منہ بنایا۔ "مجھے کہہ رہے تھے کہ بہت اچھے پراٹھے بناتی ہوں اور ساتھ ہی تم سے بھی شکایت کر دی۔"

"اب یہ بات ان کے سامنے نہ پھوٹ دینا۔" اسماء اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ نہ ہو وہ خفا ہی ہو جائیں۔"

اسوہ نے کہا۔ "پاگل تھوڑی ہوں۔"

اسی وقت اسماء کے کانوں میں مدثر کی آواز پڑی۔ "اسوہ بہن!.... ناشتا تیار ہے کہ انتظار کرنا پڑے گا۔"

اس کی بات سن کر اسماء کے اندر تلخی سی پھیل گئی تھی۔ کوئی عورت بھی اپنے شوہر کا دوسری عورت میں دلچسپی لینا برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ مدثر شروع دن سے نماز پڑھ کر ناشتا کرنے کا عادی تھا۔ اسماء کبھی تو اٹھ کر اس کے لیے ناشتا تیار کر دیا کرتی اور کبھی نہ اٹھ پاتی تو مجبوراً وہ خود چائے بنا کر ساتھ توس، بسکٹ یا ڈبل روٹی وغیرہ سے ناشتا کر لیا کرتا۔ اب اسوہ کی صورت اس کے ہاتھ ناشتا بنانے والی آگئی تھی تو یہ فطرتی بات تھی کہ اس نے اسی کو آواز دینا تھی۔ لیکن اسماء کے دماغ میں اسوہ کی خوب صورتی پھانس بن کر اٹک گئی تھی۔

اس کے بولنے سے پہلے اسوہ نے جواب دیا۔ "آپ بیٹھیں مدثر بھائی!.... میں ناشتا لا رہی ہوں۔" پراٹھا توے سے اتار کر وہ انڈہ فرائی کرنے لگی۔

"آپ کے لیے بھی انڈہ فرائی کر دوں؟" اس نے اسماء سے پوچھا۔ کیونکہ اسماء دیر سے ناشتا کرتی تھی اس لیے اسے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

"نہیں۔" اسماء نے نفی میں سر ہلا کر ٹرے میں ناشتے کے لوازمات ڈالے اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔ مدثر باورچی خانے کے دروازے ہی کی جانب متوجہ تھا۔ اسماء کو دیکھتے ہی وہ حیرانی سے بولا۔

"آواز مجھے اسوہ کی آ رہی تھی، ناشتا آپ لا رہی ہیں۔"

"کیوں میرا ناشتا لانا اچھا نہیں لگ رہا۔" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ مدثر کو اس کے الفاظ اور انداز پر اچنبھا ہوا تھا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں آپ ناشتا کریں۔“ اس کے سامنے ٹرے رکھ کر وہ بیٹھ گئی۔ اسی وقت اسوہ بھی اپنا ناشتا لیے وہاں پہنچ گئی۔

”آپ دونوں خفا خفا سے لگ رہے ہیں بھئی!“ ان دونوں کے درمیان چھائی سرد مہری اسوہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکی تھی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اسماء نے جلدی سے تردید کی۔

”آج آپ نے انٹرویو کے لیے بھی جانا ہے نا؟“ مدثر اس سے پوچھنے لگا۔

”ان شاء اللہ۔“ اسوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اس کی باتیں بڑا یاد رہتی ہیں حضرت کو۔“ اسماء کے اندر پھر تلخی گھل گئی تھی۔

اس کی سوچوں سے بے خبر مدثر، اسوہ کو مخاطب ہوا۔ ”کتنے بجے انٹرویو شروع ہے۔“

اسوہ نے جواب دیا۔ ”آٹھ بجے کا وقت لکھا تھا اشتہار میں۔“

”اگر پسند کرو تو میں ڈراپ کر دوں گا۔“ مدثر نے پر خلوص لہجے میں آفر کی۔

”نہیں بھائی!“ اسوہ نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی۔ میں رکشے میں چلی جاؤں گی۔“

”چلو، جیسا مناسب سمجھو۔“ مدثر نے اصرار نہیں کیا تھا۔

اسوہ کے انکار پر اسماء کو اطمینان سا محسوس ہوا تھا ورنہ ان دونوں کا بائیک پر ایک ساتھ جانا اسے کسی صورت گوارا نہ تھا۔ اسے مدثر کی سوچ پر غصہ آنے لگا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسماء بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔ برتن سمیٹنے کی زحمت اس نے نہیں کی تھی۔

اس کے رویے پر اسوہ کو تھوڑی حیرانی تو ہوئی مگر پھر سر جھٹک کر وہ برتن سمیٹنے لگی۔

"کمرے میں داخل ہوتے ہی اسماء سخت لہجے میں بولی۔ "آپ کا دماغ درست ہے۔"

"کیا ہوا میرے دماغ کو۔"

"تم اسوہ کو کس رشتے سے اپنے ساتھ بیڈ پر بیٹھنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ایک لڑکی آپ کے ساتھ بائیک پر گھومے گی۔"

"وہ میرے بہن جیسی ہے۔"

"ہاں، مگر بہن نہیں ہے سمجھے۔ آئندہ اس کی قسم کی آفر اپنے پاس رکھنا۔"

"اسماء!.... تمھارا دماغ درست ہے نا۔ دو تین دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں تم کچھ اکھڑی اکھڑی لگ رہی ہو۔"

"آپ اپنے دماغ کا معائنہ کرائیں۔" اسماء طنزیہ لہجے میں کہتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی جبکہ مدثر افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اسے گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

اسوہ کا انٹرویو نہایت کامیاب رہا تھا اسے اسسٹنٹ اکاؤنٹ آفیسر کی پوسٹ مل گئی تھی۔اسماء اور مدثر نے اس خبر پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔اگلی صبح اسوہ نے نوکری پر جانا تھا۔اسوہ نماز پڑھ کر باورچی خانے میں گئی تو اسماء ناشتا تیار کر چکی تھی۔ناشتا کر کے وہ دفتر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

دفتر میں اس کا پہلا دن اپنا کام سیکھتے گزرا۔اکاؤنٹ آفیسر بڑی دلچسپی اور شوق سے اسے کام کے بارے بتاتا رہا ۔دو دفعہ کمنی کے ایم ڈی نے بھی اس کے پاس چکر لگا کر خیر خیریت دریافت کی۔اسی طرح کمپنی کے چیئرمین نے بھی دفتر آتے ہی اسے اپنے پاس بلایا اور تسلی دینے کے ساتھ ساتھ کچھ انمول نصیحتیں اس کے گوش گزار کیں۔وہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں تھی کہ ان سارے التفات کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آتا۔لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی مجبوری بھی سمجھتی تھی۔کسی کی نگاہوں پر قدغن لگانا یا خیالات پر پہرے بٹھانا اس کے بس میں نہیں تھا۔البتہ اپنی حد تک اس کی کوشش تھی کہ کسی سے فالتو بات نہ کرے۔وہ نقاب تو نہیں کرتی تھی البتہ عموماً اپنا چہرہ دوپٹے سے ڈھانپ کر ضرور رکھتی۔لیکن دیکھنے والوں کے لیے اس کی ہوش ربا آنکھوں کی دید ہی کافی تھی۔چوری چھپے کئی نظریں اس کے چہرے کی دید میں مصروف رہتیں۔اچھی صورت بھی بعض اوقات کئی قسم کے مسائل کھڑے کر دیتی ہے۔کبھی کبھی تو اتنا تنگ آجاتی کہ اپنے چہرے کو تیزاب سے داغ دار کرنے کا سوچنے لگ جاتی۔مگر پھر عمار کی افسردہ چہرہ اس کی آنکھوں میں گھومنے لگتا۔اگر اتفاقاً وہ اسے مل جاتا اور اس کا منتظر بھی ہوتا، جیسا کہ اس کا وجدان کہتا تھا۔تو وہ اسے کیا جواب دیتی کہ اتنے عرصے کے انتظار کے بعد بھی اسے اس کی پسندیدہ صورت کا تحفہ نہ دے سکی۔پھر اسے گناہ کا احساس بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا کہ خدا کی دی ہوئی صورت کو بگاڑنے کا حق اس کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

اس دن شام کو مدثر دفتر سے لوٹا تو خوشی سے اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ”آج شام کا کھانا باہر کھائیں گے۔“ اس نے ڈرائنگ روم میں گھستے ہی اعلان کیا۔

اسوہ چند منٹ پہلے ہی دفتر سے لوٹی تھی۔ اور ماں کے ہاتھ کی بنی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسماء بھی وہیں بیٹھی ٹی وی پر کوئی ڈرما دیکھ رہی تھی۔

”بڑے خوش نظر آ رہے ہو مدثر بھائی!“ اسوہ نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، کیونکہ آج میں کار والا ہو گیا ہوں۔“

”مبارک ہو بھائی!“ اسوہ نے کہا۔ اسوہ کی ماں نے بھی۔ ”مبارک ہو بیٹا!“ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔ مدثر کی اپنی ماں نے تو باقاعدہ آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔ اسماء نے۔ ”مبارک ہو تو کہا مگر اس کے لہجے میں خوشی کا عنصر عنقا تھا۔

”ویسے آپ نے ڈرائیونگ کب سیکھی ہے؟“ مبارک باد کے ساتھ ہی اسماء نے سوال داغ دیا۔

”ابھی سیکھ لوں گا نا۔ ڈرائیور گھر ہی میں موجود ہے۔ میرا مطلب ہے اسوہ بہن کو تو ڈرائیونگ آتی ہے نا۔“ مدثر اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

”کیوں نہیں بڑی خوشی سے۔“ اسوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”گویا اسوہ کے قرب کے حصول کے لیے محترم نے کار بھی خرید لی۔“ اسماء نے بد گمانی سے سوچا۔

”آؤ نا، کار دیکھو گے نہیں۔“ اس نے تمام کو کار دیکھنے کی دعوت دی۔

کار یہاں تک لایا کون ہے؟" اسماء نے پوچھا۔

مدثر نے جواب دیا۔ "ایک دوست چھوڑ گیا ہے۔"

"وہ تمام گلی میں نکل آئے۔ سفید رنگ کی سوزکی کار بھی اسوہ کو بہت قیمتی نظر آئی۔ رکشے اور بس کے مسلسل سفر نے اسے کار کی اہمیت جتا دی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ اس طرح کی کار میں شاید وہ بیٹھنا بھی پسند نہ کرتی۔ مگر اب وہ وقت گزر گیا تھا۔

"یہ تو بالکل نئی ہے۔" مدثر کی ماں نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔ "بہت مہنگی ہو گی۔"

"مہنگی تو ہے، مگر ضرورت کی چیز ہے ناماں جی!.... اور میں نے کون سا نقد خریدی ہے۔ کمپنی کی طرف سے آسان اقساط پر ملی ہے۔"

"ایک بار پھر مبارک ہو مدثر بھائی!" اسوہ نے دوبارہ خلوص دل سے اسے مبارک باد دی۔

"شکریہ اسوہ بہن!" کہہ کر مدثر نے کار کی چابی اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا کار کو گھر کے اندر بھی کھڑا کر دو۔"

اسوہ نے سر ہلاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چابی لی اور کار میں بیٹھ گئی۔ اس چھوٹے سے مکان میں صحن تو موجود نہیں تھا البتہ گیراج مدثر نے بنوایا ہوا تھا۔ اسوہ نے کار گیراج میں کھڑی کر دی۔ رات کو کھانے کے لیے جاتے وقت بھی اسوہ ہی ڈرائیو کر کے لے گئی تھی۔ کار سیکھنے کی غرض سے مدثر بھی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر مدثر نے اسوہ کو کہا۔" اسوہ بہن!....ایسا ہے کہ جب تک میں کار چلانا نہیں سیکھ لیتا آپ مجھے دفتر ڈراپ کر دیا کریں اور واپسی پر بھی ساتھ لے آیا کریں۔"

مدثر کی بات پر اسماء خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔ لیکن وہ کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھی۔

اسوہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ٹھیک ہے بھائی!....یوں بھی ان شاءاللہ آپ دو تین دن میں کار چلانا سیکھ لیں گے۔"

"سیکھ تو لوں گا مگر لائسنس بنوانے کے لیے وقت تو لگے گا نا؟ دفتر کے ساتھی کافی لمبی کارروائی بتا رہے تھے۔"

"ہاں قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے دو تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔"اسوہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

مدثر جھٹ بولا۔"تو بس تب تک آپ میرے ڈرائیور کی ڈیوٹی سرانجام دیں گی۔"

"اور میری تنخواہ؟"اسوہ نے مزاحیہ لہجے میں پوچھا۔

اس کی فکر نہ کریں۔"مدثر نے بھی جوابی مسکراہٹ اچھالی۔'وہ باقاعدگی سے ملا کرے گی۔

"موصوف کو تو تمھاری خدمت کا بہانہ چاہیے بی بی۔"اسماء نے حسب عادت بدگمانی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

دفتر سے واپسی پر مدثر نے سڑک کے کنارے بنی آئس کریم کی دکان دیکھ کر اسوہ کو آئس کریم کھانے کی دعوت دی۔ جو قدرے تکلف سے اس نے قبول کر لی۔ آئس کریم کھا کر مدثر نے اسماء کے لیے بھی اس کے پسندیدہ فلیور کا ایک کپ پیک کرا لیا تھا۔ گھر کے دروازے پر اتر کر اس نے اسوہ کے لیے گیٹ کھولا اور اس کے کار اندر

لاتے ہی گیٹ بند کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسوہ کے کار بند کرنے تک وہ کمرے میں داخل ہو گیا تھا
۔

"یہ لیں جی بیگم صاحبہ!.... ٹھنڈی یخ آئس کریم سے لطف اندوز ہوں۔" اس نے آئس کریم کا کپ اسماء کی جانب بڑھایا۔

"مجھے پہلے سے معلوم تھا۔" اسماء نے کپ کی جانب ہاتھ بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"کیا پہلے سے معلوم تھا؟" مدثر نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے لچھن، آپ کا ایک دم کار خریدنا، اسوہ بی بی کو چابی پکڑانا، روزانہ ساتھ لے جانے کا پکا بندوبست کرنا اور پھر کار سیکھنے کے بہانے زیادہ سے زیادہ اس کے قرب میں رہنے کی کوشش کرنا۔" اسماء نے کئی دنوں سے اپنے اندر جمع ہونے والے زہر کو الفاظ کی شکل میں ڈھالا۔

"کیا کہا، تمھارا دماغ جگہ پر ہے۔" مدثر ششدر رہ گیا تھا۔ اور اسوہ جو مدثر کو کار کی چابی دینے آ رہی تھی اسماء کی بات سنتے ہی غیر ارادی طور پر دروازے پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور اسماء کی مکمل بات ہوتے ہی اس کے قدموں سے جیسے جان نکل گئی۔ اس نے بہ مشکل دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں اسماء کا گزشتہ چند روز کا اکھڑا اکھڑا رویہ واضح ہو گیا۔

وہ اس کے رویے کو مدثر کے ساتھ جھگڑے پر محمول کرتی رہی تھی۔ مگر یہاں وجہ ہی کوئی اور تھی۔

سماعتوں پر پہرہ نہیں بٹھایا جا سکتا ورنہ شاید وہ کبھی بھی اسماء کے منہ سے ایسی باتیں سننا کبھی گوارا نہ کرتی۔ اس کے کانوں میں تواتر سے اسماء کی تلخ و ترش باتیں پہنچ رہی تھیں۔

"بالکل ٹھیک ہے میرا دماغ۔" اسماء نے دبے لہجے میں کہا۔ لیکن وہ اس بات سے ناواقف تھی کہ جس سے وہ بات چھپانا چاہتی تھی وہ اس سے دو تین گز کے فاصلے پر دروازے پر کھڑی ہے۔ اسماء کا زہر اگلنا جاری رہا۔" اس دن آپ نے اسوہ بی بی کو بائیک پر لفٹ دینے کی پیش کش کی جو سیٹھ زادی نے نخوت سے ٹھکرادی اور آپ نے کار خریدنے میں دیر نہ لگائی حالانہ میں گھر کی خریداری سے پہلے کا تمھیں منتیں کر رہی ہوں۔"

"نیک بخت!.... ایسی کوئی بات نہیں۔" مدثر سر پکڑ بیٹھ گیا تھا۔" اسوہ ایک باکردار اور غیرت مند لڑکی ہے۔ اگر وہ اتنا ہی سستی ہوتی تو ارشد کا ہاتھ تھام کر دوبارہ عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھی۔ اور پھر تمھیں مجھ پر تو اعتبار کرنا چاہیے۔"

"ہونہہ، اعتبار۔" اسماء طنزیہ لہجے میں بولی۔" دو دن ہوئے اسے پراٹھا بنائے سیکھے ہوئے اور آپ کو اس کے ہاتھ سے بنے پراٹھے مجھ سے بھی اچھے لگنے لگے۔ اس کے لیے دو دو سوٹ اکھٹے خریدے جانے لگے۔ حد ہوتی ہے مدثر برداشت کی بھی۔"

"بہ خدا ایسی بات نہیں ہے۔ ایسا میں نے صرف اس کے تالیف قلب کے لیے کہا تھا۔ وہ ہماری ملازما نہیں کہ صبح صبح میرے لیے ناشتا بنانے کے لیے باورچی خانے میں گھسی رہے۔ اور پھر مجھے تمھاری نیند و آرام کا خیال بھی تھا۔ کچھ بھی ہو تم مجھے ہر عورت ہر لڑکی سے زیادہ عزیز اور پیاری ہو۔ میں تمھیں شروع دن سے چاہتا ہوں۔ بلکہ ہماری شادی بھی سراسر میری کوشش اور جستجو کی بہ دولت ہو پائی ہے۔ کیا میری محبت اتنی سستی، ناپائیدار اور عارضی ہے کہ ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھتے ہی ختم ہو جاتی۔"

مدثر کا خلوص بھرا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ اسماء کی سمجھ میں بات نہ آتی۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے معاف کر دو، میں غلطی پر تھی، مگر کیا کروں مدثر!.... میں تمھیں بہت زیادہ چاہتی ہوں اتنا کہ تمھاری سوچ سے بھی بڑھ کر۔ میں ڈر گئی تھی۔ اسوہ بہت خوب صورت ہے اور میں آپ کی توجہ میں ذرا سی کمی دیکھ کر ہی مر جاتی۔" اسماء کی آنکھیں بہنے لگ گئی تھیں۔

"پاگل نہ ہو تو۔" مدثر نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا گھیر اتنگ کرتے ہو کہا۔ "اسوہ تو کیا اس سے ہزار گنا زیادہ خوب صورت لڑکی بھی آجائے وہ اس دل سے میری اسماء کی محبت کو کم نہیں کر سکتی۔"

”جانتی ہوں۔“ اسماء نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

میاں بیوی کے شکوے دھل گئے تھے۔ ان کی غلط فہمی بھاپ بن کر اڑ گئی تھی۔ مگر اسوہ کے دل میں جو تیر پیوست ہوا تھا اس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ وہ اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔ اسماء کو وہ سگی بہن کی طرح سمجھتی تھی اور مدثر کو اس نے ہمیشہ بھائی ہی سمجھا تھا مگر اسماء اس کے لیے اتنا غلط گمان پالے ہوئے تھی یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ ریزہ ریزہ احساسات اور لہولہان سوچیں لیے واپس پلٹی اور دبے قدموں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ کمرے میں اپنی ماں کو موجود نہ پا کر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ کپڑے تبدیل کیے بغیر وہ بستر میں گھس گئی۔ چادر میں منہ چھپاتے ہی آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے زخم اور اذیتیں سہنا ابھی تک باقی تھا۔ محبت کے دعوے دار، سچے، ہمدرد اور مخلص لوگوں کی طرف سے ذرا سی بدگمانی بھی انسان کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہاں تو اس کی سہیلی نے اس کے کردار پر انگلی اٹھائی تھی۔ جسے وہ اپنا سب سے بڑا خیر اخواہ اور وکیل سمجھ سمجھتی تھی۔ وہ تو اپنی سوچوں اور اپنے چھپے خیالات تک سے اسے آگاہ رکھتی تھی۔ اگر اسماء کے دل میں بھی کوئی ایسی بات تھی تو وہ اسے براہ راست بھی کہہ سکتی تھی۔ مگر وہ تو غیروں کی طرح دل ہی دل میں اسوہ سے متنفر ہوتی رہی۔ یہ تو آج اس نے اتفاقاً یہ ساری گفتگو سن لی تھی ورنہ تو وہ ساری زندگی اس بات سے لاعلم رہتی۔ شام تک وہ اپنے جذبات پر قابو پا چکی تھی۔ اسماء یہ باور کرا کے شرمندہ کرنا اسے مناسب معلوم نہ ہوا۔

کھانے کی میز پر اسماء خوب چہک رہی تھی۔ یقیناً مدثر کی طرف سے صفائی ملنے پر اس کے دل سے اندیشے محو ہو گئے تھے، مگر اسوہ کے دل میں جو گرہ پڑی تھی وہ اب کھلنے والی نہیں تھی۔ اسوہ زبردستی مسکراتی رہی۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اسماء کے گھر کو چھوڑ دینا ہی اس کے لیے مناسب تھا۔

صبح نماز پڑھ کر وہ دوبارہ لیٹ گئی تھی یہاں تک کہ اسماء نے اسے آواز دی۔"اسوہ!....ناشتا کرلو دفتر نہیں جانا ؟"

"بس طبیعت ذرا مضمحل تھی اس لیے نماز پڑھ کر لیٹ گئی تھی۔" زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے وہ کھانے کی میز کی طرف بڑھ گئی۔ یقیناروتے دل کے ساتھ ہونٹوں پر ہنسی چپکانا ایک مشکل اور تکلیف دہ عمل ہے مگر عورت ذات کی ساری عمر اس تکلیف دہ عمل سے گزرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ کبھی شوہر کی زیادتیوں پر ہنسی کا مرہم چپکا کر اپنے ماں باپ کو سب اچھا کی رپورٹ دینا تو کبھی ساس نند کی طرف سے دی گئی تکالیف کو پڑوسنوں سے چھپانے کے لیے ہزار جتن کرنا۔

مدثر ناشتا کر کے جا چکا تھا۔ کچھ کھانے پینے کو اس کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا مگر اسماء کو دکھانے کے لیے اس نے دو تین نوالے زہر مار کیے اور برتن سمیٹ کر دفتر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

رستے میں وہ مدثر سے عام لہجے میں بات چیت کرتی رہی۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اسے دفتر اتار کر وہ اپنے دفتر پہنچی اور اکاؤنٹ آفیسر عابد قریشی سے چند گھنٹے کی رخصت مانگ کر باہر نکل آئی۔ اس کی کار کا رخ انسپکٹر راحیل کے تھانے کی طرف تھا۔

"اسلام علیکم چچا جان!" اس نے دفتر میں داخل ہوتے ہی سلام کہا۔

"وعلیکم اسلام!" اسے دیکھ کر انسپکٹر راحیل کھل اٹھا تھا۔ "ارے واہ، آج تو میری بیٹی اسوہ آئی ہے۔" اس نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

"چچا جان!.... کیسے ہیں آپ؟" وہ اس کے اشارے پر اس کے سامنے پڑی نشست سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”بالکل ٹھیک، اپنی سناؤ؟“ وہ خدمت گار سپاہی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجانے لگا۔

”جی سر!“ ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔

”اچھی سی چائے اور ساتھ کچھ کھانے کو بھی۔“

”نہیں چچا جان!.... صرف چائے، یقین مانو ابھی ناشتا کر کے آ رہی ہوں۔“

انسپکٹر نے ہاتھ کے اشارے سپاہی کو جانے کا اشارہ کیا، گویا اس نے اسوہ کی بات کو قابلِ اعتنا نہیں جانا تھا۔

”اور سناؤ دن کیسے گزر رہے ہیں اور آج کیسے بھول پڑیں؟“

”کیا کسی کام کے بغیر میں نہیں آ سکتی؟“ اسوہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”آ کیوں نہیں سکتیں، لیکن شاید کام کے بغیر آئی نہیں ہو۔“

”ہاہاہا۔“ اسوہ نے خفت بھرا قہقہہ لگایا۔ ”ویسے آپ صحیح کہہ رہے ہیں چچا جان!“

”تو پھر پہلے کام کی بات ہو جائے۔“

”مجھے کرائے کا گھر چاہیے۔ کوئی ایسا خاندان جو اپنے ہاں ہم دو عورتوں کو ایک کمرہ کرائے پر دے سکے۔“

”کیا مطلب، میرا گھر موجود ہے نا۔“ انسپکٹر راحیل نے ناراضی بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں چچا جان!.... میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ ورنہ جس گھر میں میں اب رہ رہی ہوں وہ بھی میرے جانے سے خوش نہیں ہوں گے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور دل ہی دل میں کہا۔ "سوائے میری عزیز از جان سہیلی کے۔" آخری فقرے کو ہونٹوں سے ادا کرنے کی ہمت وہ اپنے اندر مفقود پاتی تھی۔

"گویا یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟" انسپکٹر راحیل نے بادل نخواستہ پوچھا۔

"آخری سے بھی آخری چچا جان!.... اور یقین مانیں مجھے جب بھی ہلکی سی بھی ضرورت محسوس ہوئی میں اسی طرح آپ کے پاس دوڑی چلی آؤں گی، جیسے آج آئی ہوں۔"

انسپکٹر راحیل نے انٹر کام اٹھا کر ایک حوالدار کو اپنے پاس بلایا اور اس کے ذمہ اسوہ کا کام لگانے لگا۔ ساری تفصیل بتا کر وہ آخر میں کہہ رہا تھا۔ "جو نہی مذکورہ مکان ملتا ہے مجھے مطلع کرو میں منتظر ہوں۔" اور حوالدار سیلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ گھنٹے بھر بعد وہ حوالدار اجازت مانگ کر اندر داخل ہوا اور ایک کاغذ انسپکٹر راحیل کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ چار گھروں کے پتے ہیں سر!.... اور یہاں کرایہ کے لیے ایک اور دو کمرے دستیاب ہیں۔" اس نے وہ ساری معلومات فون پر بیٹھ کر ہی اکھٹی کی تھی۔

وہ کاغذ ہاتھ میں پکڑ کر انسپکٹر راحیل اٹھتے ہوئے اسوہ کو مخاطب ہوا۔ "چلو لگے ہاتھوں چاروں مکان دیکھ لیتے ہیں۔" اور اسوہ سر ہلاتے ہوئے اس کے ہمراہ ہولی۔ اپنی کار وہیں تھانے میں چھوڑ کر وہ انسپکٹر راحیل کی کار میں بیٹھ گئی۔ اگلے دو گھنٹوں میں وہ چاروں گھروں کا جائزہ لے چکے تھے۔ ان میں سے دو گھر اسوہ کو پسند آئے تھے۔ نسبتاً اپنے دفتر سے نزدیک پڑنے والے گھر کا انتخاب اس نے کر لیا۔ اس گھر میں میاں بیوی اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ گھر کے دو پورشن تھے۔ نیچے والا پورشن ان کے اپنے استعمال میں تھا دوسری منزل پر

ایک کمرہ، بیت الخلاء مع غسل خانہ اور چھوٹا سا باورچی خانہ موجود تھا۔ دوسرا پورشن مالک مکان نے بنایا ہی اس مقصد سے تھا کہ کسی کو کرایہ پر دے سکے۔ یوں بھی بڑے شہروں میں یہ رواج عام ہے کہ جن گھروں میں دوسرا پورشن موجود ہو مالک مکان وہ کرایہ پر چڑھا دیتے ہیں۔

مالک مکان کو ایڈوانس ایک ماہ کا کرایہ دے کر انھوں نے مارکیٹ کا رخ کیا تھا۔ اسوہ کے منع کرنے کے باوجود وہ کرایہ انسپکٹر راحیل نے اپنے پلے سے ادا کیا تھا۔ مارکیٹ میں اسوہ نے دو چار پائیاں بستر، روزمرہ استعمال کے چند برتن، کچھ کھانا پکانے کا سامان، آٹے کا تھیلا وغیرہ خرید کر ایک ریڑھے والے کے ہاتھ عبید الرحمن کے گھر بھجوا دیا تھا۔ کیونکہ یہ سامان پہلے ان کے پاس موجود نہیں تھا۔

تھانے پہنچ کر اسوہ نے انسپکٹر راحیل کا شکریہ ادا کیا اور ان سے اجازت لے کر واپس دفتر چل پڑی۔ چار بجے چھٹی کر کے وہ مدثر کے دفتر پہنچی وہ اسی کا منتظر تھا۔ اسے ساتھ لے کر وہ گھر آ گئی۔

رات کے کھانے پر اس نے دھماکا کر دیا۔

"مدثر بھائی، اسماء بہن اور آنٹی شکیلہ!.... ہم آپ لوگوں کی بہت شکر گزار اور ممنون ہیں کہ آپ نے ہمیں مشکل وقت میں سہارا دیا۔ آپ لوگوں کا یہ احسان اور مہربانی ہمیشہ یاد رہے گی۔ اب اللہ پاک کے فضل و کرم سے مجھے کرائے کا ایک مناسب گھر مل گیا ہے۔ کوئی غلطی کوتاہی ہوئی ہو تو درگزر کر دینا۔"

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" اسماء نے حیرانی سے پوچھا۔ خود اسوہ کی ماں بھی حیرانی بھری نظروں سے اسے گھورنے لگی تھی۔

"ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا؟" مدثر نے شاکی لہجے میں پوچھا۔اس کے دل میں اپنی بیوی اسماء کی گزشتہ کل کی گفتگو تازہ ہو گئی تھی۔اسے یقین کی حد تک گمان تھا کہ وہ گفتگو اسوہ نے بھی سن لی تھی۔اور اگر یہ سچ تھا تو وہ کبھی بھی وہاں رکنے پر آمادہ نہ ہوتی۔

"ایسی کوئی بات نہیں مدثر بھائی!.... مگر ہم یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتے نا۔"

"کیوں نہیں رہ سکتے؟" اسماء نے بپھر کر پوچھا۔اس کے دل کا چور بھی اسے شک میں مبتلا کیے ہوئے تھا کہ اسوہ اس کی مدثر سے ہونے والی گفتگو سن چکی تھی۔

"کیونکہ بعض رشتے بہت نازک ہوتے ہیں اسماء بہن!" اسوہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔"اور ایسے رشتوں کو قرب کی گرمی فنا کر دیتی ہے۔ایسے رشتوں کے لیے فاصلے آب حیات کا کام دیتے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ ہمارا بہت زیادہ قریب ہونا،ہمارے درمیان ایسی بدگمانیاں پیدا کر دے کہ ہماری محبت نفرت میں بدل جائے۔تو کیوں نہ میں اس محبت کو باقی رکھنے کے لیے تھوڑا دور ہو جاؤں۔" اسوہ نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ دیا تھا۔

"غلط فہمیاں ہمیشہ تو باقی نہیں رہا کرتیں۔" اسماء نے نادم انداز میں کہا۔

" صحیح کہا بہن!.... مگر کسی غلط فہمی کا ایک بار دور ہونا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ وہ غلط فہمی یا بدگمانی دوبارہ پیدا نہیں ہو گی۔"

"ٹھیک ہے اسوہ بہن!.... جیسے آپ کی مرضی۔بس یہ یاد رکھنا کہ اس گھر کے دروازے ہمیشہ آپ کے لیے کھلے رہیں گے۔"

''شکریہ مدثر بھائی!....'' وہ ممنونیت سے بولی۔ ''اور مجھے اس بارے کوئی شبہ نہیں یہ گھر میری بہن اور بھائی کا ہے، ہم یہاں آتے جاتے رہیں گے۔''

اسماء کچھ نہیں بولی بس نادم انداز میں سر جھکا کر کھانا زہر مار کرنے لگی۔ وہ اسوہ سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسوہ مدثر سے زیادہ اس کے قریب تھی اور اسی کے بھروسے پر وہ اس گھر میں آئی تھی۔ اور اب اسی کی بدگمانی کا زخم کھا کر وہ اس گھر کو چھوڑنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ اتنا تو اسماء بھی جانتی تھی کہ اس کی زہریلی باتوں کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسوہ کے دل پر لگے زخموں میں ایک گھاؤ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایسے گھاؤ وقت کی دھول پڑنے سے مندمل تو ہو جاتے ہیں مگر ان سے اٹھنے والی ٹیسیں تاحیات باقی رہتی ہیں۔ اسوہ اعلاظرف تھی کہ اسماء کے ایسے الزامات سن کر بھی خاموش رہی تھی۔ اور اسے کوئی صفائی دیے بغیر اسے کوئی گلہ شکوہ کیے بغیر اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی تھی۔

''کب شفٹ ہونا ہے؟'' مدثر نے پوچھا۔

اسوہ نے کہا۔ ''ان شاءاللہ کل۔'' اور ساتھ ہی وضاحت کرنے لگی۔ ''کیونکہ کل اتوار ہے، اگر ایک دو دن انتظار کیا تو پھر دفتر سے چھٹی کرنا پڑے گی اور نئی نئی نوکری میں چھٹیاں نیک شگون نہیں ہوتیں۔'' آخری فقرہ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

مدثر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے دل میں اسوہ کی ہمدردی تھی، وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا، مگر اب اس کی بیوی نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا۔

اپنے کمرے میں جاتے ہی نسرین بیٹی سے گھر چھوڑنے کی وجہ دریافت کرنے لگی۔

"کوئی وجہ نہیں ماں جی!" "آخر پرائے گھر میں کب تک ٹکے رہیں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں پرائے محل سے اپنی جھونپڑی ہزار گنا زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ عزت نفس اور خودداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے، خدانخواستہ کبھی غلطی سے اسماء یا مدثر بھائی کے منہ سے کوئی ناگوار کلمہ ادا ہو گیا تو ہمیشہ کی ناراضی کا باعث بنے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائیں، غیروں کے سہارے پوری زندگی نہیں بتائی جا سکتی۔"

"مجھے سچ سچ بتاؤ کیا اسماء بیٹی نے کوئی بات کی ہے؟" نسرین اسے کریدنے پر تلی تھی۔

"نہیں ماں جی!.... اسماء میری سگی بہن کی طرح ہے، مگر یہ بھی دیکھیں نا کہ مدثر میرا منہ بولا بھائی ہونے کے باوجود ایک غیر مرد ہی ہے۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے اس سے ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ اگر اسماء بہن کے دل میں ذرا سی بدگمانی پیدا ہو گئی یا خود مدثر یا میں کسی بشری تقاضے سے مغلوب ہو کر کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے۔ تو آپ خود سوچیں کیا ساری زندگی میں اسماء سے آنکھیں ملانے کے قابل ہو پاؤں گی۔ اپنی بہنوں جیسی سہیلی کو میں کھونا نہیں چاہتی اسی وجہ سے چچا راحیل کو کہہ کر ایک کرائے کے گھر کا بندوبست کیا ہے۔"

"شاید تم بتانا نہیں چاہتیں۔" نسرین بیٹی کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"امی جان اگر کوئی بات ہوتی تو مجھے بتانے میں کون سا امر مانع تھا۔ بہ خدا مجھے اسماء نے کوئی بات نہیں کی نہ مدثر ہی نے کچھ کہا ہے۔ اور آپ جانتی ہیں میں جھوٹ نہیں بولتی۔" یوں بھی حقیقت یہی تھی کہ اسے مدثر یا اسماء نے براہ راست کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ تو اتفاقاً اس نے ان کی گفتگو سن لی تھی۔ جو گھر چھوڑنے کا باعث بن رہی تھی۔ اور اب وہ اپنی ماں کے سامنے بھی اپنی سہیلی کی کردار کشی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اتنا اندازہ تو اسے

بھی تھا کہ اسماء ایک کمزور، وفاشعار مشرقی عورت تھی جو اپنے شوہر کے قریب رہنے والی ہر نا محرم عورت کو شک کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور اسوہ بھی مدثر کی سگی بہن تو نہیں تھی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ مدثر کے لائے ہوئے دونوں سوٹ بھی اس نے ماں کی نظر بچا کر الماری ہی میں چھوڑ دیے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ اسماء کی باتوں کو بھلا نہیں پا رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کے دماغ میں اسماء کی زہریلی گفتگو گونجنے لگتی۔

سامان تیار کرتے ہی اس نے مدثر کو ٹیکسی لانے کی درخواست کی۔

”کار میں چلے جائیں گے۔“ مدثر نے مشورہ دیا۔

”ہونہہ!“ وہ ہنسی۔ ”کار واپس کون لائے گا؟ مجھے دوبارہ لوٹنا پڑے گا اور پھر یہاں سے ٹیکسی کرا کر جانا پڑے گا ۔تو کیوں نہ ابھی سے ٹیکسی کرا لوں۔“

مدثر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”صحیح کہا اسوہ بہن!“ اور وہ ٹیکسی لانے کت لیے چلا گیا۔ اسماء اپنے کمرے میں تھی اسوہ نے اس کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی نہ اس کا دل ہی چاہ رہا تھا۔ جب مدثر ٹیکسی لے آیا تب اپنی ماں کے ہمراہ وہ اسماء کو ملنے کے لیے اس کے کمرے میں گھس گئی۔ اس نے بجھے دل سے اسوہ کو خدا حافظ کہا۔ مدثر کی ماں شکیلہ بیگم اور مدثر کو الوداع کہہ کر ماں بیٹی ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑیں۔

مالک مکان عبید الرحمن کسی پرائیویٹ کمپنی میں کلرک تھا۔ اس کی بیوی فرخندہ ایک گھریلو خاتون تھی۔ خاوند کے دفتر جانے کے بعد وہ بچوں کو تیار کر کے سکول بھیجتی اور پھر سارا دن گھر میں بور ہوتی رہتی۔ اسوہ کی ماں کا سہارا اسے بہت غنیمت لگا تھا۔ کیونکہ خود اسوہ بھی نوکری کرنے والی تھی۔

فرخندہ اور عبید الرحمن نے انھیں خوش آمدید کہا۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے وہ گھر ہی پر موجود تھا۔ میاں بیوی نے چائے اور لوازمات سے ان کی خاطر تواضع کی اور پھر وہ اپنے کمرے میں آ گئیں۔ ریڑھے والا وہاں سامان رکھ گیا تھا۔ چار پائیاں سیدھی کر کے وہ ان پر بستر لگانے لگیں۔ کمرے میں الماری کا وجود ناپید تھا البتہ دیوار کے ساتھ کپڑے لٹکانے کے ہینگر ضرور لگے ہوئے تھے۔ ضرورت کے کپڑے ہینگر کے ساتھ لٹکا کر باقی کپڑے انھوں نے بیگز میں رہنے دیے تھے۔ دوپہر کا کھانا عبید الرحمن اور اس کی بیگم نے بھجوا دیا تھا رات کو وہ چولھے کے سامنے کھڑی دال بگھار رہی تھی۔ نئی زندگی کی شروعات ہو گئی تھی۔

"بیٹی ایک بات کہوں ناراض تو نہیں ہو گی۔" بستر پر لیٹتے ہوئے اس کی ماں نے پوچھا۔

"آپ کے علاوہ میرا ہے کون ماں جی"!

"اس میں تو شک نہیں، مگر ناراض بھی تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے نا؟"

"اپنوں سے ناراض ہوا جاتا ہے، رہا نہیں جا سکتا۔" اسوہ نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "اس لیے آپ بے جھجک ہو کر کہیں۔ ناراض ہو بھی گئی تو کب تک رہ پاؤں گی۔"

"ویسے بڑی بڑی باتیں کرنا آ گیا ہے میری گڑیا کو۔"

"دکھ اور آزمائش کہاں کسی کو چھوٹا رہنے دیتے ہیں ماں جی!.... اور میں تو یوں بھی بچی نہیں رہی میری ہم عمر تو خود بچوں والی بن چکی ہیں۔"

"اچھا میں پوچھنا یہ چاہ رہی تھی کہ کسی کے انتظار میں کب تک ٹھوکریں کھاتی رہو گی۔ اتنی اچھی صورت دی ہے رب نے کوئی بھی بھلا آدمی تمھارا ہاتھ تھامنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ تو کیوں نہ تم شادی کے متعلق سوچ لو۔ اگر اس نے آنا ہوتا تو اب تک آ چکا ہوتا۔ وہ کیا خوب کہا ہے احمد فراز نے....

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک

جو تمھیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

"سب سے پہلے تو اسے بے وفا کہنے والی بات غلط ہے ماں جی!.... دوسرا اس میں بھی سچائی نہیں ہے کہ وہ مجھے بھول چکا ہے۔ اور آخری بات....

جو ہوتی کانچ کا برتن

محبت توڑ دیتی میں

یہ بس میں تھوڑا ہوتا ہے امی جان!.... آپ کی ذات کے علاوہ اس کی یادیں ہی تو میرے جینے کا سہارا ہیں اور جینے کے سہارے سے کون جان چھڑانا چاہے گا۔"

"آخر کوئی حد بھی تو ہونی چاہیے؟" نسرین بیگم ماں کے بجائے اس کی سہیلی بن کر محو گفتگو تھی۔

"محبت حدود سے ماورا ہوتی ہے امی جان"!

"مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس لڑکے کی شادی ہو چکی ہو گی۔ کیا تم اس کی دوسری بیوی بننا گوارا کر لو گی؟"

"اگر اس کی شادی ہو چکی ہوئی اور اس نے ایسا چاہا تو اس سے بھی انکار نہیں کروں گی۔ کیونکہ اپنی اور اس کی مجرم میں ہوں۔ میں نے ہی اسے خود سے دور جھٹکا ہے اور اور میں ہی اس جدائی کا سبب بنی ہوں۔" یہ الفاظ اسوہ کے ہونٹوں پر تھے کہ بجلی چلی گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ پنکھے کے بند ہوتے ہی مچھروں کی فوج حملہ آور ہو گئی۔ اس قسم کی صورت حال سے پہلی بار ان کا واسطہ پڑ رہا تھا۔ کیونکہ ان کی کوٹھی میں تو ایک چھوڑ دو دو یو پی ایس اور جنریٹر وغیرہ موجود تھے۔ اس کے بعد انسپکٹر راحیل اور مدثر کے گھر میں بھی یو پی ایس سسٹم لگے ہوئے تھے۔ اس گھر میں بھی یو پی ایس تو موجود تھا مگر اس کا کنکشن نچلے پورشن میں تک محدود تھا۔ یہ بات مالک مکان انھیں پہلے بتا چکا تھا۔

ساری رات بجلی کی آنکھ مچولی جاری رہی۔ لیکن اب ان کا شمار مفلس اور غریب لوگوں میں ہوتا تھا۔ اور یو پی ایس جیسی عیاشی کا تصور کرنا ہی ان کے لیے محال تھا۔

صبح ناشتے میں اس نے چائے کے ساتھ رات کی بچی باسی روٹی گرم کر کے کھائی اور گھر سے باہر نکل آئی۔ اس کی ماں یوں بھی صبح ایک پیالی چائے ہی لیتی تھی۔

بس سٹاپ پر کھڑے ہجوم میں شامل ہو کر وہ بھی اپنے روٹ کی بس کا انتظار کرنے لگی۔ دوپٹا اس نے بڑے سلیقے سے چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ دفتر پہنچتے ہی روز مرہ کا شروع ہو گیا۔ اکاؤنٹ آفیسر عابد قریشی اس کی ذات میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینا شروع ہو گیا تھا۔ اشاروں کنائیوں میں اس نے کئی بار اسوہ تک اپنے دل کی بات پہنچانے کی کوشش کی مگر وہ ہمیشہ نظر انداز کر دیتی تھی۔ ایک دن وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

"مس اسوہ!.... آخر مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے کہ میں آپ کے التفات سے آج تک محروم ہوں؟"

"آپ کے کتنے بچے ہیں قریشی صاحب!" اس نے مدہم لہجے میں پوچھا۔

"ایک.... بس ایک ہی بیٹی ہے۔" وہ گڑبڑا گیا تھا۔

"تو آپ اپنی بیٹی کے لیے کوئی ایسا ہی بر ڈھونڈیں گے نا جو اس سے کم از کم دس پندرہ سال بڑا ہونے کے ساتھ پہلے سے شادی شدہ بھی ہو؟"

اسوہ کا جواب سن کر وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ اسے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولی۔

"اچھا یوں کریں اپنی بیگم کا موبائل فون نمبر مجھے دیں تاکہ میں اس سے مشورہ کر سکوں کہ بہ طور شوہر آپ کیسے ہیں، آخر شادی سے پہلے مجھے تحقیقات کا حق تو حاصل ہے نا؟"

گلا کھنکار کر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور کھسیاتے ہوئے بولا۔ "آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ میں تو بس یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی شعبہ میں ہیں تو کبھی کبھار ہنس کر بات چیت کر لیا کریں۔"

"ہنسنے کی شرط تو خیر فضول ہے۔ اب میں آپ پر ہنستی ہوئی اچھی تو نہیں لگوں گی۔ اور جہاں تک بات چیت کا تعلق ہے تو دن میں بیسیوں بار ہو جاتی ہے۔"

"اکاؤنٹ کے مسائل کے علاوہ آپ نے مجھے کبھی مخاطب ہی نہیں کیا؟"

"تو اکاؤنٹ کے شعبے سے متعلق ہونے کے ناتے ہم اسی بارے ہی باتیں کریں گے نا؟ اب سبزی فروش تو ہم ہیں نہیں کہ آلو پیاز کی کا ذکر کریں۔"

"ہا.... ہا.... ہا۔ ویسے آپ باتیں بڑی مزاحیہ کرتی ہیں۔" اس نے زبردستی کا قہقہہ لگایا۔

"بالکل۔" اسوہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مزاحیہ باتوں کی طرح مجھے گالیاں بکنے میں بھی مہارت حاصل ہے ۔کسی کی بے عزتی کرتے وقت میں مخاطب کا عہدہ، رتبہ اور عمر مد نظر نہیں رکھ پاتی۔"

اس مرتبہ اس کے حملے کی تاب قریشی صاحب نہیں لا سکا تھا۔ اور کان دبائے اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ اس دن کے بعد قریشی صاحب تو محتاط ہو گیا تھا۔ البتہ چیئرمین کے التفات جاری تھے۔ ایک دن اسے کام کے سلسلے میں اپنے آفس میں بلا کر اس نے اسوہ کے کام کی تعریف کرتے ہوئے اسے شاباش دی اور پھر مدعا پر آتے ہوئے بولا۔ "ویسے مس اسوہ!.... میرا خیال ہے اب قریشی صاحب کو فارغ کر دینا چاہیے۔ یقیناً آپ اس سے بہتر اور احسن طریقے سے اکاؤنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں گی۔"

"میں اس بارے کیا کہہ سکتی ہوں سر!" اس نے محتاط انداز اپنایا۔

"بس طے ہو گیا، میں ایک دو دن میں قریشی صاحب کو فارغ کر دیتا ہوں تم ذہنی طور تیار رہو اکاؤنٹ آفیسر کی سیٹ سنبھالنے کے لیے۔"

"اس میں تیاری کیسی سر"!

"اچھا وہ تو ہوتا رہے گا، یہ بتاؤ تم شام کو کیا کر رہی ہو؟" اس مرتبہ چیئرمین فرزند علی کے لہجے میں خباثت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا سر!" وہ بے ساختہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"ہی ہی ہی.... اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔ آج میں شالیمار ہوٹل میں تمھارا منتظر رہوں گا، بلکہ یوں کرنا آٹھ بجے تک تیار ہو جانا میرا ڈرائیور تمھیں گھر سے پک کر لے گا۔"

اس کی کھلی ڈلی باتیں سن کر اسوہ کے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔بڑی مشکل سے خود پر جبر کر کے وہ ان جان بنتے ہوئے بولی۔

"شکریہ سر!....میں رات کو گھر سے نہیں نکلتی اور نہ ہوٹلز پر کھانا پینے میں کوئی دلچسپی رکھتی ہوں۔"

"مس اسوہ!....ترقی کے حصول کے لیے اپنے اصل قربان کرنا پڑتے ہیں۔"اس نے گویا اسوہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"سر!....جو ترقی اصولوں کو قربان کر کے حاصل ہو اسے ترقی نہیں بھیک یا بخشش کہتے ہیں جبکہ بھیک بھکاری اور بخشش طوائف کو ملا کرتی ہے۔میں الحمد اللہ نہ بھکارن ہوں نہ طوائف۔"

"تم تشریف لے جاسکتی ہو۔"چیئرمین نے منہ بگاڑ کر کہا اور وہ خاموشی سے اس کے دفتر سے نکل آئی۔اس کے بعد کمپنی کے مالک کو اس کے کام میں کیڑے نظر آنے لگے۔عابد قریشی یوں بھی اس کے خلاف تھا۔مہینے کے اختتام پر تنخواہ وصول کرتے ہی اس نے استعفادے دیا۔اس کا دل تو بہت پہلے ایسا کرنے کو چاہ رہا تھا مگر وہ اپنے مہینے بھر کی محنت پر پانی نہیں پھیرنا چاہتی تھی۔ایک بات پھر اس نے نوکری کی تلاش کی جدوجہد شروع کر دی۔دو تین پرائیویٹ سکولوں میں بھی وہ نوکری کی تلاش میں گئی مگر تنخواہ کے نام پر ملنے والی حقیر رقم اتنی کم تھی کہ وہ مشکل گھر کا کرایہ ادا کر پاتی۔ان کے بینک اکاؤنٹ میں پس انداز رقم ختم ہو چکی تھی۔بس اکاؤنٹ کو کلوز کرنے کا کام باقی تھا۔

ماں بیٹی کے کھانے پینے کا خرچ اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن گھر کا کرایہ،بجلی اور گیس کا بل،دفتر آنے جانے کا کرایہ اور اسی طرح چھوٹے موٹے خرچ مل کر اچھی خاصی رقم کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ہفتے دس دن کی تلاش کے

بعد اسے ایک بار پھر پرسنل سیکرٹری کی جاب مل گئی مگر وہ وہاں دو دن بھی نہیں ٹک پائی تھی۔نئے باس سے چند دن بھی صبر نہیں ہو سکا تھا۔دوسرے ہی دن اس نے اپنی مذموم خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔نوکری پر تھوک کر وہ واپس آگئی۔بس میں بیٹھے وہ کھڑکی سے گزرنے والے مناظر کو دکھی دل کے ساتھ دیکھتی رہی۔اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخر کب تک اس نے ان آزمائشوں کا شکار رہنا تھا۔کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ماں کی بات مان کر کسی کھونٹے سے بندھ جائے اس طرح کم از کم روزروز کی اذیت سے تو اس کی جان چھوٹے گی۔اوباش مردوں کی گندی نگاہوں سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔مگر اس کے ساتھ جب عمار کی یاد اس کے دل میں چٹکی لیتی تو یہ عارضی اذیتیں اسے بھول جاتیں۔

اپنے سٹاپ پر اتر کر گھر جاتے ہوئے اس نے حسبِ معمول دو تین اخبار خریدے اور چل پڑی۔اخبار کی خریدار ی بھی اس کے لیے اضافی خرچ کا باعث تھے۔

گھر جا کر وہ اپنے لیے چائے بنانے لگی۔اس کی ماں مالک مکان کی بیوی فرخندہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔کام کاج تو کوئی تھا نہیں وہ بس اس کے پاس جا کر گپ شپ کرتی یا دونوں ٹی وی پر کوئی ڈراما وغیرہ لگا کر دیکھنے لگتیں۔

اسوہ نے کبھی بھی ماں کو دفتر میں پیش آنے والا کوئی واقعہ نہیں بتایا تھا۔پچھلی نوکری کیوں چھوڑ یا نئی نوکری پر جانا کیوں شروع کیا۔یہ اس کے ذاتی مسائل تھے۔ماں کو حصہ دار بنا کر وہ انھیں دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔چائے پینے کے ساتھ وہ نوکری کے اشتہار بھی تلاشتی رہی۔آخر اسے اپنے مطلب کا ایک اشتہار مل ہی گیا۔خوش قسمتی سے انٹرویو کی تاریخ بھی اگلے دن ہی کی تھی۔

حاجی قاسم ایک باشرع اور نفیس شخص تھا۔ انٹرویو میں جچے تلے چند سوالات پوچھ کر اس نے اسے نوکری پر رکھ لیا۔ اسوہ نے اگلے ہی دن سے نوکری پر جانا شروع کر دیا تھا۔ تنخواہ بس گزارے لائق ہی تھی کہ جس سے وہ بہ مشکل زندگی کی گاڑی گھسیٹ پاتی۔ مگر دفتر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ خاص کر حاجی قاسم اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کرتا۔ اسوہ کو پہلی بار اطمینان سے کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور پھر اسے وہاں کام کرتے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ حاجی قاسم کے پاس کام ملنے کے بعد اس نے اشتہار دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ ایسا مالک اور سٹاف اسے پھر نہ ملتا۔

اس دن چائے کی بریک میں اس نے دفتر میں آئے ہوئے اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑائی۔ اس کی نظر پھسلتی ہوئی فرنٹ پیج کے نیچے دیئے ہوئے نمایاں اشتہار پر پڑی۔ لیڈیز سٹاف کی ضرورت کا اشتہار تھا۔ جو کسی یو اے کمپنی کی طرف سے دیا گیا تھا۔ پرسنل سیکرٹری، پرچیزنگ اور سیلنگ ڈائریکٹر، اکاؤنٹ آفیسر کی ویکنسیاں تھیں۔ تعلیم ایم بی اے اور ایم کام کی شرائط تھیں۔ پہلے بھی کسی کمپنی میں کام کرنے کو ترجیحی بنیاد پر فوقیت دی گئی تھی۔ سب سے خوب صورت لائن تنخواہ کے بارے تھی جو ابتدا ہی میں پچاس ہزار کا ہندسہ عبور کر رہی تھی۔ انٹرویو تین دن بعد تھا۔

مقدر آزمانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ یوں بھی حاجی قاسم کے مشفقانہ رویے نے اس کے دماغ سے مردوں کی خباثت اور اوباش فطرت کا تاثر زائل کر دیا تھا۔ جس طرح پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح انسانوں کی فطرت اور رویوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اشتہار کو اخبار سے کاٹ کر وہ دوبارہ اس کے مندرجات کا جائزہ لینے لگی۔ خاص کر کمپنی کے مونوگرام میں بنا ہوا "یو" اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ بھی اپنے دستخط کرتے وقت "یو" کو اسی انداز میں لکھتی تھی۔

"سر میں نوکری چھوڑنا چاہتی ہوں۔" مہ جبین روزانہ کے احکامات نوٹ کرنے کے بعد عمار کو مخاطب ہوئی۔

”خیریت ؟“عمار نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”میرے منگیتر کو میرا نوکری کرنا پسند نہیں ہے۔“وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔

”منگیتر....“عمار حیرانی سے بولا۔”یعنی چوری چوری،نہ مٹھائی،نہ کوئی پارٹی“....

”کیا بتاتی سر!“اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

”کم از کم اطلاع تو دی جاسکتی تھی۔“

”سر!....لڑکیوں کو اپنی منگنی کی بات کرنا عجیب سا لگتا ہے۔“

عمار ہنسا۔”اچھا پھر ہمیں کتنے دنوں کی مہلت دو گی ؟“

”سر!....بس یکم تک ہوں۔“مہ جبین دھیمے لہجے میں بولی۔

”یعنی ایک ہفتا ہے۔“عمار نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔”اچھا شادی کے بارے تو اطلاع دو گی نا؟“

”اگر ضروری ہے تو دے دوں گی۔“مہ جبین نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”بالکل اور بہت ضروری ہے۔“عمار نے مسکرا کر کہا۔”پوری یو اے کمپنی آپ کی شادی میں شرکت کرے گی ۔کھانے کا انتظام و انصرام اور واجبات کمپنی کے ذمہ ہو گے۔“

”سر جی!....یہ تو کچھ زیادہ نہیں ہو جائے گا۔“

”زیادہ کیسے ؟.... آپ نے اتنا عرصہ کمپنی کی خدمت کی ہے اب اتنا حق تو ہمارا بھی بنتا ہے۔“

"اللہ پاک آپ کو عزت دے سر!" مہ جبین ممنونیت سے بولی۔

"اچھا یوں کرو کہ شمائلہ اور انوار الحق صاحب کو بلا لو وہ بھی کافی دنوں سے کچھ نئے سٹاف کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔"

"جی سر!" کہہ کر مہ جبین نے انٹر کام اٹھا کر ٹیلی فون آپریٹر کو شمائلہ اور انوار الحق کو عمار کے پاس بھیجنے کا بتانے لگی۔

چند منٹ بعد وہ دونوں وہاں موجود تھے۔

"آپ دونوں نئے سٹاف کا مطالبہ کر رہے تھے؟"

"جی سر!...." انوار الحق نے کہا، شمائلہ نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"آپ کو کیا مسئلہ پیش آ رہا ہے؟" عمار نے شمائلہ سے پوچھا۔

"سر!.... میں کٹنگ اور ڈیزائینگ میں مصروفیت کی وجہ سے باقی امور پر توجہ نہیں دے سکتی اس لیے یا تو اس شعبے کے لیے کسی اور لڑکی کو سینئر بانٹا جائے یا مجھے دوسری کارروائیوں سے سبک دوش کیا جائے۔ اسی طرح خواتین کے لیے ایک علاحدہ خاتون اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے تاکہ انھیں اپنے مسائل کے لیے کسی مرد کے پاس نہ جانا پڑے۔"

"ہونہہ!" کہہ کر عمار نے اثبات میں سر ہلایا اور انوار الحق کی طرف متوجہ ہوا۔

”یوں کرو انوار بھائی!.... میرے لیے پرسنل سیکرٹری خواتین کے شعبے کے لیے لیڈی اکاؤنٹ آفیسر ،لیڈیز سیلنگ اور پرچیزنگ ڈائریکٹر اور اس کے علاوہ آپ کو جتنا مردانہ سٹاف درکار ہو اس کا ایک اشتہار شائع کرادو۔ اشتہار ذرا نمایاں ہونا چاہیے۔ اور سوموار کو بارہ بجے انٹرویو کا وقت مناسب رہے گا۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ انوار الحق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میری بات مکمل ہوئی۔ اگر آپ لوگوں نے کچھ کہنا ہے تو پلیز“....

”مہ جبین کہاں جا رہی ہیں؟“ شمائلہ نے پوچھا۔

”مہ جبین کی شادی ہو رہی ہے۔“ عمار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا.... یعنی چوری چوری۔“ شمائلہ مہ جبین کی طرف متوجہ ہوئی جو شرما کر نیچے دیکھنے لگی تھی۔

”مبارک ہو بیٹی!“ انوار الحق نے کہا۔

”شکریہ سر!“ مہ جبین دھیرے سے بولی۔

”انوار صاحب!.... یاد رہے، مہ جبین کی شادی کے دن مکمل چھٹی ہوگی، پورے سٹاف اور لڑکے والوں کو کھانا یوائے کمپنی دے گی۔“

”ٹھیک ہے سر!“ انوار الحق خوش دلی سے بولا۔ عمار نے سر ہلا کر انھیں جانے کی اجازت دی اور وہ دفتر سے نکلتے چلے گئے۔

ان گئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ عمار کے موبائل فون پر ماں کی کال آنے لگی۔

”جی امی جان!“ اس نے کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”بیٹا!.... تمھارے ابو کی طبیعت سخت خراب ہو گئی ہے، میں ڈرائیور کے ساتھ ہسپتال کی طرف جا رہی ہوں۔“

”کیسے، کیا ہوا ان کو؟“ عمار بے ساختہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا۔

”پتا نہیں بیٹا شاید دل میں تکلیف ہوئی ہے۔ اب بھی آنکھیں بند کیے سیٹ پر لیٹے ہیں۔“

”میں آ رہا ہوں امی جان!“ عمار نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر کے باہر کی طرف دوڑ لگا دی ۔اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی کو بتا سکتا۔ مہ جبین کو بھی اس نے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی ۔یوں بھی اسے دوڑتے دیکھ کر مہ جبین کو سوال کرنے کی جرّات نہیں ہوئی تھی۔

اپنی کار پارکنگ سے نکالتے ہی وہ تیز رفتاری سے اپنے فیملی ہسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ بہت زیادہ تیزی کرنے کے باوجود اسے ادھ پون گھنٹا رستے میں لگ گیا تھا۔ رستے میں انوار الحق کی کال آئی اور اس نے مختصر لفظوں میں اپنے والد کی طبیعت کے خراب ہونے کا بتا دیا۔

ہسپتال کی پارکنگ میں کار روک کر وہ قریباً بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ استقبالیہ پر بیٹھی نرس اس سے اچھی طرح واقف تھی۔ عمار کے استفسار پر وہ خود اس کی رہنمائی کے لیے ساتھ ہو لی۔

اس کے والد کو علاحدہ کمرے میں لٹا کر ڈاکٹر اس کی چیکنگ کر رہا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب!.... کیا ہوا؟“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں عمار صاحب!" ڈاکٹر بشاشت سے اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ "ہلکا سا اٹیک ہوا ہے۔ اب تو بالکل ٹھیک ہیں بشیر بھائی"!

"یار!.... آپ خواہ مخواہ پریشان ہو کر بھاگتے چلے آئے اتنی جلدی تمھاری جان مجھ سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔"

"ابو جان!" عمار پریشانی کے عالم میں اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"یار چھوڑو اس ڈرامے بازی کو۔" بشیر عمار کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر مزاحیہ لہجے میں بولا۔ مگر عمار اتنا پریشان تھا کہ ہنس بھی نہیں سکا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!.... آپ ہی اسے کچھ بتائیں۔" بشیر احمد ڈاکٹر کی جانب متوجہ ہوا۔

"عمار صاحب!.... فکر کی کوئی بات نہیں۔ اب تو آپ کے والد صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔ بس تھوڑے بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ وہاں موجود نرس کی طرف ایک کاغذ بڑھاتا ہوا بولا۔ " یہ دائیاں لے آؤ اور نسخے کے مطابق بشیر صاحب کو کھلاتی رہو۔ شام کو یہ واپس جاسکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ عمار کی پیٹھ تھپ تھپاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"تم یونھی پریشان ہو رہے ہو یار!.... بس تمھاری ماں سے شرط لگی تھی کہ بیٹا میری بیماری کی خبر سن کی کتنی دیر میں ہسپتال پہنچتا ہے۔"

مگر عمار اس بار بھی والد کی مزاحیہ بات پر مسکرا نہیں سکا تھا۔ اس کی ماں سکینہ بیگم بھی مغموم سی بیٹھی تھی۔

"اچھا ایک بات بتاؤ؟" عمار کو سنجیدہ دیکھ کر بشیر احمد بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"جی ابو جان!" عمار بیڈ کی پائینتی کی طرف بیٹھ کر والد کے پاؤں دبانے لگا۔

"بیٹا!.... جانتے ہو شادی سے پہلے میں نے تمھاری ماں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی لیکن دیکھ لو ہماری شادی کتنی کامیاب ہوئی۔ اگر مجھ سے کوئی دنیا کے کامیاب ترین شادی شدہ جوڑے کا نام پوچھے تو بے جھجکے میں اپنا نام پیش کر دوں۔ یاد رکھنا بیٹا!.... ایک آئیڈیل تمھاری سوچوں اور دل میں ہوتا ہے اور ایک آئیڈیل اللہ پاک کی ذات بابرکات نے تمھاری قسمت میں لکھ دیا ہوتا ہے۔ اور بہتر اللہ پاک کا فیصلہ ہوتا ہے۔ انتظار کی ایک حد ہوتی ہے، اپنی جوانی کے سنہرے دن یوں گزار دینے اپنے ساتھ تو ناانصافی ہے ہی، ہم بوڑھوں کے ساتھ بھی بہت بڑی زیادتی ہے۔ موت تو ہر وقت گھات میں بیٹھی ہوتی ہے بیٹے اور موت کے پاس مہلت نہیں ہے۔ ایک سیکنڈ کا بھی انتظار نہیں کرتی۔ اور یقین کرو میں موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ اللہ پاک نے مجھے ہر خوشی دی ہے میری ہر خواہش پوری کی ہے اور اب تمھاری محنت کی یہ دولت اتنی دولت اور عیش و آرام بھی دے دیا جو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب بس ایک ہی خواہش باقی ہے کہ میں اس گھر میں ننھے منے بچوں کی قلقاریاں سنوں۔ میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں مانگا، ہمیشہ یہی کوشش کی کہ تمھیں خوشی پہنچاؤں ۔ تمھاری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ تمھاری شادی میں بھی میں اپنی مرضی نہیں چلانا چاہتا۔ لیکن اب بہت دیر ہو گئی ہے بیٹے۔ اس نے ملنا ہوتا تو اب تک آ چکی ہوتی۔ کس چیز کی کمی ہے تمھارے پاس۔ اب مزید دیر نہ کرو بیٹا، یہ نہ ہو تم آئیڈیل تو پالو مگر اس وقت تمھارے والدین باقی نہ رہیں۔"

والد کی باتیں ایسی نہ تھیں کہ عمار کے دل پر اثر نہ کرتیں۔ اسوہ اسے جتنی بھی پیاری ہوتی آخر والدین بھی اس کی زندگی میں کوئی حیثیت تو رکھتے تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسوہ امریکہ یا کنیڈا چلی گئی تھی۔ نامعلوم وہ کب

واپس آتی۔اور واپس آتے ہوئے اگر شوہر اور بچے اس کے ہمراہ ہوئے تو پھر....؟ آخر کب تک وہ لاحاصل انتظار کرتا رہتا۔ہو سکتا ہے وہ ساری زندگی واپس نہ آتی۔اس کے والد کی باتیں بالکل ٹھیک تھیں۔وہ خود تیس سال کا ہو گیا تھا۔یہ بھی ہو سکتا تھا مزید دس پندرہ سال گزارنے کے بعد وہ کسی قابل ہی نہ رہتا۔

نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ بولا۔"ابو جان!....مجھے چند دنوں کی مہلت مل سکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظروں میں غزالہ کا چہرہ در آیا۔آخر اس کی آنکھیں بھی تو اسوہ کی طرح تھیں اور پھر ایک دو ملاقاتوں میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بے باک اور آزاد خیال ہونے کے باوجود اس میں سدھرنے کی اہلیت موجود تھی۔عمار کے ایک بار منہ بھوں چڑھانے پر اس نے اپنے ناشائستہ لباس تو کیا دو تین اور ناپسندیدہ باتوں پر بھی قابو پا لیا تھا۔

بشیر احمد مسکرایا۔"شاید میرے کان بج رہے ہیں۔"

"تو ہسپتال میں تو آئے ہوئے ہیں ڈاکٹر کو دکھا دیں نا؟" عمار ترکی بہ ترکی بولا اور بشیر احمد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا ۔سکینہ بیگم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔اس کے شوہر نے اپنی بیماری کا خوب فائدہ اٹھایا تھا۔اسے لگا انھیں بہت پہلے بیٹے کو جذباتی طور پر بلیک میل کر لینا چاہیے تھا۔

☆☆☆

شام کو والد کو گھر لے جا کر عمار نے اپنے کمرے میں آ کر موبائل فون نکالا اور غزالہ کو کال کرنے لگا۔ پہلی ہی گھنٹی پر کال رسیو کر لی گئی تھی۔

”ہیلو!....“ اس کی آواز میں ناراضی کا گہرا تاثّر تھا۔

”میں عمار بات کر رہا ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”پہچان لیا ہے عمار صاحب!.... کہیے اپنی شادی کی سالگرہ پر بلانے کا ارادہ ہے یا اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوش خبری سنانا چاہ رہے ہیں۔“ غزالہ کے لہجے میں شامل طنز اس بات کا مظہر تھا کہ اسے عمار کے غیر شادی شدہ ہونے کے بارے معلوم ہو گیا تھا۔

”شادی.... کس کی شادی؟....“ وہ ہنسا۔ ”اور میں نے کب کہا کہ میں شادی شدہ ہوں؟“

”میں امتحانات میں مصروف تھی ورنہ آپ کی خبر تو ضرور لیتی۔“ غزالہ شوخ لہجے میں بولی۔ خفی کا اثر اس کے لہجے سے غائب ہو گیا تھا۔

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ میں شادی شدہ ہوں آپ نے خود سے مجھے شادی شدہ سمجھا اور پھر خود ہی بھاگ گئیں، حالانکہ اتنے اخلاقیات تو آپ کو برتنا چاہیے تھے کہ کم از کم میرے چائے کی پیالی ہی پی لیتیں۔“

”جی جی.... میں اتنی فارغ تھی نا کہ ایک شادی شدہ مرد کی ناز برداری کرتی رہوں۔“

”میرے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہونے سے آپ کا کیا تعلق؟“ عمار نے ذو معنی لہجے میں پوچھا۔

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ”عمار صاحب!.... شادی شدہ مرد کسی کی امانت ہوتا ہے۔ اور کسی عورت کا دل دکھانا میرے خیال میں بہت بڑا جرم ہے۔“

”اور غیر شادی شدہ مرد....؟“

”غیر شادی شدہ مرد بھی قابل بھروسا تو نہیں ہوتا بس کسی کسی پر اعتبار کرنے کو جی چاہتا ہے۔“

”آج تک کتنے مرد آپ کی اعتبار کی کسوٹی پر پورے اترے ہیں؟“

وہ ناز سے مسکرائی۔ ”آج تک تو کسی کو اعتبار کے قابل نہیں سمجھا، البتہ اب سوچ رہی ہوں کسی ایک پر اعتبار کر ہی لوں۔“

”اور وہ خوش قسمت ہے کون؟“

”پتا نہیں۔“ غزالہ نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا اس دن تو میں سخت مصروف تھا۔ اگر آج آپ فارغ ہیں تو تگڑا اساڈنر کرا سکتا ہوں۔“

”سچ....“ وہ پرجوش لہجے میں مستفسر ہوئی۔

”میں بھلا جھوٹ کیوں بولنے لگا۔“

وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ ”ہاں جھوت تو آپ نہیں بولتے، لیکن غلط فہمی میں مبتلا ضرور کر سکتے ہیں۔“

اس کی بات پر عمار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"اچھا مجھے تیار ہونے میں آدھا گھنٹا لگے گا۔"

"بس ادھے پون گھنٹے تک میں تمھارے گھر کے سامنے پہنچ جاؤں گا، پھر کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کریں گے۔"

وہ پوچھنے لگی۔"گھر میں کیوں نہیں؟"

عمار نے کہا۔"گھر میں پھر کبھی سہی؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ بولی۔"اچھا ٹھیک ہے، لیکن میری خوشی آپ کے گھر کی دال روٹی کھانے میں تھی۔"

عمار بادل نخواستہ بولا۔"اچھا یونھی سہی، میں تمھیں لینے آرہا ہوں۔"

"شکریہ....بہت بہت بہت شکریہ۔"غزالہ نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اور عمار نے ہنستے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

لباس تبدیل کرنے کا تکلف کیے بغیر وہ اس کے گھر کی جانب چل پڑا۔اس دن پارٹی کے خاتمے پر عمار سے لفٹ لیتے وقت وہ اپنا پتا اسے بتا چکی تھی۔جاتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو ایک مہمان کا بتا دیا تھا تا کہ وہ کھانا تیار کر لے یا کم از کم ہوٹل ہی سے منگوا لے۔ٹھیک ادھ گھنٹے بعد وہ اس کے گھر کے سامنے تھا۔موبائل فون نکال کر عمار نے اس کا نمبر ملایا۔

"جی....جی۔"غزالہ نے کال رسیوی کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"میڈم!....آپ کے دولت کدے کے سامنے کھڑا ہوں۔"

"آپ اندر کیوں نہیں آئے؟"

"نہیں آپ باہر آجائیں۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "اچھا ٹھیک ہے، میں بس ایک منٹ میں آئی۔"

اور اگلے دو منٹ میں وہ اسے اپنے گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ آج بھی اس نے ایسا لباس زیب تن کیا تھا جو اس کے وقار میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ سر پر سلیقے سے اوڑھے ہوئے کالے رنگ کے دوپٹے نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مگر اس کی خوب صورت اور پر کشش شکل وصورت بھی عمار کے جذبات میں کوئی ہلچل پیدا نہ کر سکی۔ وہ اسے عام لڑکیوں کی طرح ہی لگی۔ اسوہ میں جانے کیا بات تھی کہ اس کی طرح عمار کو کوئی بھی نہیں لگتی تھی۔ قریب آکر وہ۔ "اسلام علیکم!" کہتے ہوئے اگلی نشست کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"وعلیکم اسلام"!

"تعریف کرنے کی ضرورت نہیں، تمھاری آنکھوں نے بتا دیا ہے۔" اس نے شوخ لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی۔

"خیر اتنا بھی اچھی نہیں لگ رہی ہو۔" عمار نے کار آگے بڑھاتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

"کیا کیا...." وہ مصنوعی غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔ "دوبارہ اگر ایسا کہا تو اس دن کی طرح رستے ہی میں نیچے اتر جاؤں گی۔"

عمار نے منہ بنایا۔ "یہ اچھی رہی، یعنی زبردستی اپنی تعریف کرائی جائے۔"

"ہاہاہا۔" اس کا نقرئی قہقہہ بلند ہوا۔

"اچھا انکل کو تو بتادیا ہے نا کہ کہاں جارہی ہو؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ پاپا کی اجازت کے بغیر میں دن کو گھر سے نہیں نکل سکتی اب تو رات ہے۔"

"انھیں کیا بتایا ہے؟"

"یہی کہ عمار صاحب نے اپنے گھر ڈنر پر بلایا ہے۔"

"ہونہہ!...." کہہ کر عمار چند لمحے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔"غزالہ ایک بات کہوں برا تو نہیں مناؤ گی۔"

"کہیں۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"میں تم سے محبت نہیں کرتا۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا تھا۔

"اس بات کا بھلا کیا مطلب ہوا؟" وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

"یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ بس امی اور ابو جان مجھ پر زور دے رہے ہیں کہ شادی کر لوں جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ بھی میری جان نہیں چھوڑ رہے مجبوراً مجھے کوئی نہ کوئی لڑکی تو تلاش کرنا تھی۔ پس مجھے تم ہی بہتر لگی ہو۔ سوچا تمھیں اندھیرے میں نہ رکھوں۔"

"آپ یقیناً میری توہین کر رہے ہیں۔" غزالہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"نہیں غزالہ!.... میں نے آج تک عورت ذات کی توہین کا نہیں سوچا۔ عورت ہر لحاظ سے میرے لیے قابلِ احترام ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ میں بہت پہلے ہی کسی کے تیرِ نظر کا شکار ہو گیا تھا اور آج تک اس کا جادو

سر چڑھ کر بول رہا ہے۔اس کو میں دنیا کے بھیڑ میں گم کر چکا ہوں۔اب ساری زندگی اس کے انتظار میں گزارنا چاہتا ہوں مگر امی،ابو جان کے پاس اتنی مہلت نہیں ہے،انھیں بہو چاہیے اب آپ ہی بتائیں ایسی صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے ؟"

"آپ یہ بات مجھ سے چھپا کر بھی تو شادی کی درخواست کر سکتے تھے ؟"غزالہ عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔

"نہیں یہ خیانت ہوتی۔زندگی کے کسی بھی موڑ پر اگر وہ لڑکی مجھے ٹکرا گئی تو یقیناً میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکوں گا ایسی صورت میں تمھیں کیا صفائیاں دیتا۔بہتر یہی لگا کہ آپ کو ابھی سے بتا دوں۔"

"عمار صاحب!.... حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی سچ بیانی سے مجھے اذیت پہنچی،اس کے باوجود میں آپ کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔اور آپ ہی کی وجہ سے مجھے یہ حوصلہ مل رہا ہے کہ میں بھی اپنے دل کی بات اگل دوں ۔میں بھی آپ سے محبت نہیں کرتی بلکہ کسی سے بھی نہیں کرتی۔میں بالکل عملی لڑکی ہوں،یہ عشق محبت مجھے وقت کا ضیاع اور فضول کام لگتا ہے۔حالانکہ کئی لڑکے مجھے پرپوز کر چکے ہیں لیکن کسی کی درخواست کو میں نے قابلِ اعتناء نہیں جانا۔البتہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں اور اپنی پسندیدگی پر سیکڑوں دلائل دے سکتی ہوں۔اب جہاں تک آپ کی ماضی کی محبت کا تعلق ہے تو اس سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں البتہ آپ کو مستقبل کی گارنٹی دینا پڑے گی۔شادی کے بعد آپ کی ساری وفاؤں،محبتوں اور سوچوں کا محور فقط میری ذات ہو گی۔اس طرح میں بھی وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے پسند کے سانچے میں ڈھل جاؤں گی جیسا پہناؤ گے پہنوں گی،جو کھلاؤ گے کھاؤں گی،جیسا رکھو گے رہوں گی،آپ کے والدین کو وہ عزت دوں گی جس کے وہ حق دار ہیں گھریلو خاتون بناؤ گے تو گھر داری کروں گی۔دفتر میں بٹھاؤ تو ورکنگ وومن کا کردار ادا کروں گی۔شوہر کے حقوق پورے کرتے ہوئے بیوی کی ذمہ داریاں نبھاؤں گی اور آپ سے بھی یہی توقع رکھوں گی۔"

اس کی تفصیلی گفتگو سنتے ہی عمار کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی تھی۔ ”گویا یہ شادی اچھے میاں بیوی کی طور پر رہنے کا ایک معاہدہ ہو گا۔“

”جیسا آپ سمجھیں۔ رکاوٹ آپ کی جانب سے ہے۔ میرے دل میں کسی غیر کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ میں نے تو اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا ہے اور پسندیدگی محبت پر فائق ہوتی ہے۔“

”بھلا وہ کیسے؟“ عمار نے دلچسپی سے پوچھا۔

”وہ ایسے جناب کہ محبت، میں محبوب کی خامیاں نظر نہیں آتیں اور جب شادی ہو جاتی ہے، محبت میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ وصل کا تسلسل محبوب کی اہمیت کو گھٹا دیتا ہے اس وقت محبوب کی وہ خامیاں جو پہلے نظر نہیں آئی ہوتیں اچانک ظاہر ہو جاتی ہیں اور محبت ختم ہوتے دیر نہیں لگتی۔ جبکہ پسندیدگی تو فطرت ہوتی ہے۔ جو کبھی نہیں بدلتی۔“

”بہت اچھی بات کی ہے۔“ عمار نے تعریفی انداز میں سر ہلایا اور اپنی کوٹھی کی جانب کار موڑ دی۔

”ارے واہ۔“ کوٹھی دیکھتے ہی غزالہ مبہوت سی ہو گئی تھی۔ ”عمار صاحب!.... اتنی شاندار کوٹھی۔“

”پچھلے دنوں ہی خریدی ہے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ یہ اسی لڑکی کی کوٹھی ہے۔“ پورچ میں کار روکتے ہوئے وہ بے ساختہ بولا۔

””””پلیز عمار صاحب!.... اگر ہو سکے تو اس کا ذکر میرے سامنے نہ کیا کریں۔ وہ ماضی ہے آپ اپنے حال اور مستقبل کو اس کی یاد سے دکھ نہ دیں۔“

"میں کوشش کروں گا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اور ویسے بھی اپنا رشتا ابھی تک درمیان میں ہے آپ کے پاس ابھی تک انکار کی گنجائش موجود ہے۔"

"اتنا سخت جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔" منہ بناتے ہوئے وہ نیچے اتر گئی۔

اس کی ماں نے کافی اہتمام کیا تھا۔ کچھ گھر میں تیار تھا اور ایک دو پکوان اس نے ہوٹل سے منگوا لیے تھے۔ غزالہ کو اس نے بہت اہمیت دی تھی۔ اور کھانے کے دوران ہی اس کے بارے مکمل تفصیل پوچھ چکی تھی۔ یوں بھی شکل وصورت کے لحاظ سے غزالہ لاکھوں میں ایک تھی۔ اسے بہ طور بہو وہ بہت پسند آئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ والد کی خواہش ظاہر کرنے کے چند گھنٹوں بعد عمار اس کی بہو کے لیے ایک لڑکی پسند کر کے لے آئے گا۔ کھانے کے بعد وہ گھنٹا بھر گپ شپ میں مشغول رہیں اور پھر عمار اسے گھر چھوڑ آیا۔ واپسی پر اس کی ماں جلد از جلد غزالہ کے گھر جا کر رشتا مانگنے پر اصرار کرنے لگی۔

"امی جی!.... چند دن دیکھ لیں۔ کسی سے معلوم کر لیں آخر شکل وصورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اس کے گھر کا ماحول بھی دیکھنا پڑے گا۔ اس کے کسی قریبی رشتاداروں سے بھی معلوم کرنا پڑے گا ہفتہ ایک ٹھہر جائیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!.... اگلے جمعہ تک آپ کے پاس مہلت ہے اس کے بعد میں بالکل بھی نہیں رکوں گی۔ مجھے یہ لڑکی بہت پسند آئی ہے۔ میں کوشش کرتی تب بھی اتنی اچھی بہو تلاش نہ کر سکتی۔"

"ہونہہ!...." عمار نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے اسوہ کا چہرہ لہرایا اور اس نے دکھی دل سے سوچا۔ "کاش امی جان!.... آپ نے اسے دیکھا ہوتا، پھر میں پوچھتا۔"

☆☆☆

اتوار کی چھٹی گزار کر وہ دفتر جانے کے لیے تیار تھی۔ناشتا کرتے ہوئے اچانک اس کا موبائل فون بجنے لگا۔

"جی نازیہ!....اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔

"حاجی صاحب کے والد صاحب انتقال فرما گئے ہیں اس لیے تین دن تک دفتر بند رہے گا۔"

"اوہ....بہت افسوس ہوا۔ویسے کیا ہوا انھیں؟"

"کافی عرصے سے بیمار تھے۔ابھی حاجی صاحب کی کال آئی تھی۔کہہ رہے تھے تمام کو دفتر بند ہونے کی اطلاع دے دوں۔"

"شکریہ،نازو۔"اسوہ ممنونیت سے بولی۔

"ویسے تعزیت کے لیے کس وقت جانے کا ارادہ ہے؟"نازیہ نے پوچھا۔

"شاید کل چلی جاؤں۔"اسوہ نے خیال ظاہر کیا۔

"میری مانو تو آج ہی بھگتا لیتے ہیں۔"نازیہ نے مشورہ دیا۔

"اچھا فی الحال تو میں آرام کروں گی۔بجلی نے ساری سونے نہیں دیا۔اگر جانے کا ارادہ ہوا تو آپ کو کال کر لوں گی۔ورنہ پھر کل ہی چلی جائیں گی۔"

"میں منتظر رہوں گی۔"نازیہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔دفتر میں اس کی نشست و برخاست نازیہ کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔وہ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی،شادی شدہ تھی اور اپنے شوہر کی اجازت سے یہ نوکری کر رہی تھی۔

موبائل فون ایک طرف رکھ کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ رات کو بہ مشکل دو تین گھنٹے ہی سو پائی تھی۔ صبح کے وقت مسلسل دو تین گھنٹے بجلی نہیں جاتی تھی۔ اور اسی مہلت کو غنیمت جان کر وہ لیٹ گئی۔ اس کی آنکھ دس بجے بجلی کے جانے پر کھلی۔ نہا کر اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور پینے لگی۔ اس کی ماں نیچے گئی ہوئی تھی۔

گرمی کافی بڑھ گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے پردے ہٹائے باہر جھانک کر گلی میں آنے جانے والے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ ہوا بالکل رکی ہوئی تھی۔ ہاتھ سے جھلنے والا پنکھا اٹھا کر وہ جھلنے لگی۔ مفلسی رہنے کے طریقے سکھا دیا کرتی ہے۔ گھنٹے بعد بجلی آ گئی اور چھت والے پنکھے نے اسے پنکھا جھلانے کی مشقت سے نجات دے دی۔ فارغ بیٹھے اسے کوئی کام نہیں سوجھ رہا تھا۔ نیند بھی اچھی خاصی لے لی تھی۔ اس نے نازیہ کو کال کر کے تعزیت کی غرض سے حاجی قاسم کے ہاں جانے کا سوچا۔ موبائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اچانک اسے انٹرویو کا خیال آیا۔ موبائل کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ اس نے سرعت سے اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھایا۔ اخبار سے کاٹا ہوا اشتہار باہر نکال کر وہ جلدی سے نظریں دوڑانے لگی۔ سوموار کے دن بارہ بجے کا وقت درج تھا۔ سوا گیارہ ہونے والے تھے۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اپنی سی وی اور تعلیمی اسناد اٹھا کر وہ جلدی سے گھر سے باہر نکل آئی۔ وقت بالکل کم رہ گیا تھا۔ بس سٹاپ تک پہنچتے پہنچتے اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ مطلوبہ کمپنی کا بتا کر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس کی خوش قسمتی کہ جب وہ وہاں پہنچی تو بارہ بجنے میں دس منٹ رہتے تھے۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے وہ کمپنی کی عالیشان عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ عمارت کی پیشانی پر "یو اے" کمپنی کا بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ چوکیدار کو اپنی آمد کا مطمح نظر بتا کر وہ اندر داخل ہوئی استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے انتظار گاہ کی طرف اس کی رہنمائی کی۔ وہاں لگے صوفہ سیٹ اور کرسیوں کے علاوہ کافی تعداد میں لکڑی کے بینچ بھی رکھے گئے تھے اس کے باوجود اسے بہ مشکل

بیٹھنے کو جگہ مل سکی۔ وہ ایک بینچ کے کونے پر ٹک گئی۔ امیدواروں کی کثرت کو دیکھ کر ایک بار تو اس کے جی میں واپس لوٹنے کا خیال آیا مگر پھر اس نے قسمت آزمانے میں حرج نہ سمجھا۔ مرد وہاں قلیل تعداد میں آئے تھے کیونکہ مردوں کی فقط دو آسامیاں تھیں۔ خواتین کی البتہ ایک بڑی تعداد جمع تھی۔ ان میں زیادہ تر اسوہ ہی کی ہم عمر یا اس دو تین سال کم و بیش عمر کی لڑکیاں موجود تھیں۔ زیادہ تر نے گہرا میک آپ تھوپا ہوا تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ جلد ہی ایک ادھیڑ کے شخص نے وہاں کر تمام کو متوجہ کیا۔

"میں آپ تمام کو یو اے کمپنی کے منیجمنٹ ڈائریکٹر انوار الحق کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ ابھی چند لمحوں میں آپ کا انٹرویو شروع ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اپنے گروپس کی ترتیب سے کھڑے ہو جائیں۔ تاکہ اسی ترتیب سے آپ کا انٹرویو شروع کیا جائے۔ اشتہار آپ لوگوں نے پڑھ لیا ہو گا اس لیے میں شرائط دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اگر کوئی اشتہار میں بیان کردہ شرائط پر پورا نہیں اترتا تو وہ فقط وقت اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی سفارشی رقعے والا ہے تو اسے بھی یہی مشورہ ہے کہ خواہ مخواہ اسے کسی کا احسان لینے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ اس نوکری کے قابل ہوا تو اسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں اور اگر وہ ان شرائط پر پورا نہیں اترتا یا مطلوبہ پوسٹ ہی کے قابل نہیں ہے تو اسے کسی کی سفارش بھی فائدہ نہیں دے سکتی۔ کمپنی چیئرمین کے اصول اس بارے نہایت واضح اور سخت ہیں۔" یہ کہہ کر انوار الحق سانس لینے کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا۔

"اب لیڈی اکاؤنٹ آفیسر کی پوسٹ کے لیے جو خواتین آئی ہیں وہ اپنی اسناد مع سی وی میرے پاس لے آئیں۔" بیس پچیس خواتین نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی فائلز اس کے پاس لے آئیں۔ انوار الحق تمام فائلز ترتیب سے رکھتا گیا۔ اکاؤنٹ آفیسر کی پوسٹ کی امیدواروں کی فائلز جمع کرنے کے بعد اس نے خواتین کے شعبے کی

سیلنگ اور پرچیزنگ ڈائریکٹرز کی پوسٹ کے لیے فائلز جمع کیں۔اسوہ نے اپنے کاغذات سیلنگ ڈائریکٹر کی پوسٹ کے لیے جمع کروائے تھے۔خواتین کے بعد اس نے مردوں سے بھی ان کی فائلز جمع کیں۔ہر پوسٹ کے امیدواروں کو اس نے فائلز کی ترتیب سے بٹھا دیا۔

"جونھی آپ سے پہلے والا امیدوار باہر نکلتا ہے آپ بغیر پوچھے تشریف لے جائیں۔باہر آنے والے امیدوار کو یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔منتخب ہونے والے امیدواروں کو بذریعہ ٹیلی فون کال،کل یا پرسوں بلوالیا جائے گا۔ایک دو دن تک کال نہ آنے کی صورت میں انتظار میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں آپ کسی اور کمپنی میں کوشش کرسکتے ہیں۔"

یہ تفصیل بتا کر اس نے آفس بوائے کو بلوایا اور وہ تمام فائلز اسی ترتیب سے کمپنی کے چیئرمین کے آفس میں لے جانے کا کہا۔اور خود بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔تمام امیدواروں کو اس نے ترتیب سے بٹھا دیا تھا۔

"جی انوار بھائی!...."اس کے دفتر میں داخل ہوتے ہی عمار نے پوچھنے لگا۔"کیا انٹرویو شروع کیا جائے؟"

"جی سر!....تمام کو ترتیب سے بٹھا دیا ہے۔"انوار الحق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے سب سے پہلے پرسنل سیکرٹری کی امیدواروں کو بلائیں۔اور میرا خیال ہے مہ جبین کو بھی بلا لیتے ہیں تاکہ وہ بھی مشورہ دے سکے۔"عمار انٹر کام اٹھا کر مہ جبین کو اندر آنے کا کہنے لگا۔

انوار سر ہلاتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔تمام امیدوار اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔اس نے کہا۔

"سب سے پہلے پرسنل سیکرٹری کی امیدوار ترتیب سے اندر آئیں۔جب وہ ختم ہو گئیں تب جس کو بلوانا ہو گا میں بتا دوں گا۔"یہ کہہ کر وہ واپس دفتر میں داخل ہو گیا۔

عمار، مہ جبین کو اس کے لانے کی غرض وغایت بتا رہا تھا۔

"سر!....اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔" وہ محجوب سی ہو گئی تھی۔

"نہیں پرسنل سیکرٹری کے چناؤ میں تمھاری رائے بڑی اہمیت کی حامل ہو گی۔" عمار نے سنجیدہ انداز میں کہا اور وہ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

پہلی امیدوار نے اندر داخل ہو کر سلام کہا اور عمار کے اشارے پر وہ "شکریہ۔" کہتے ہوئے عمار کے سامنے رکھی کرسی پر ادب سے بیٹھ گئی۔

اس کی فائل کھول کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے عمار نے کہا۔"مس ہانیہ کریم!.... آپ بی ایس سی ہیں، ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کورس بھی کیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہیں نوکری کی ہے؟"

جی سر!.... میں قریباََ دو سال الکرم اینڈ سنز کمپنی میں کمپنی کے چیئر مین کے ساتھ یہ ڈیوٹی سر انجام دے چکی ہوں۔"

"وہاں سے نوکری چھوڑنے کی وجہ؟"

"تنخواہ کم تھی۔"

عمار دھیرے سے ہنسا۔"یہ مسئلہ یہاں بھی پیش آسکتا ہے؟"

وہ اطمینان سے بولی۔"تو کہیں اور چلی جاؤں گی۔ ویسے اشتہار میں جس تنخواہ کا اعلان کیا گیا ہے وہ مناسب ہے۔"

انوار الحق کو سر کے اشارے سے عمار نے سوال کرنے کا کہا۔ چند سوال اس نے کیے۔ اس کے بعد عمار نے مہ جبین کو دعوت دی مگر اس نے۔"شکریہ۔" کہہ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے مس ہانیہ!.... آپ اس کاغذ پر اپنا رابطہ نمبر لکھ کر جا سکتی ہیں۔ سلیکشن کی صورت میں آپ کو کال کر دی جائے گی۔" عمار نے ایک پیڈ اس کی جانب بڑھایا اور اس کے ساتھ اس کی فائل بھی اس کی جانب بڑھا دی۔

اپنا نام اور رابطہ نمبر درج کر کے ہانیہ نے رائٹنگ پیڈ میز پر رکھا اور سلام کہہ کر چل پڑی۔

اس کے بعد باری باری لڑکیاں آتی گئیں۔ پرسنل سیکرٹری کی امیدواروں کے ختم ہوتے ہی عمار نے انوار الحق اور مہ جبین کے مشورے سے ایک لڑکی کا انتخاب کیا۔ اور انوار الحق نے اس لڑکی کا رابطہ نمبر اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ اگلے مرحلے میں عمار نے لیڈی اکاؤنٹ آفیسر کے امیدواروں کو بھگتنا شروع کر دیا۔ مہ جبین کو اس نے واپس بھیج دیا تھا۔ کیونکہ اب اس کی ضرورت وہاں نہیں رہی تھی۔ اکاؤنٹ آفیسر کے انتخاب کے بعد اس نے سیلنگ ڈائریکٹر کی امیدوار لڑکیوں کا باری باری انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

قریباً آدھی لڑکیوں کو بھگتا کر وہ انوار الحق کو کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے ایک ایک کپ کافی کا ہو جائے۔''

''اچھا مشورہ ہے۔'' انوار الحق نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمار انٹر کام کا رسیور اٹھا کر مہ جبین کو کافی بھیجنے کا کہنے لگا ۔ اسی وقت اگلی امیدوار اندر داخل ہوئی۔ عمار دروازے ہی کی طرف متوجہ تھا۔ آنے والی لڑکی کی فائل اس نے اپنے سامنے رکھ لی تھی مگر ابھی تک کھول نہیں پایا تھا۔ اور پھر اس لڑکی کو دیکھتے ہی جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اسے لگا وہ جاگتے ہوئے کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ تو کبھی وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسوہ اسلم شکور نوکری کے حصول کے لیے اس کے سامنے آئے گی۔ انوار الحق عمار ہی کی طرف متوجہ تھا اور اس کی کیفیات دیکھتے ہی اس نے مڑ کر آنے والی کو دیکھا۔ حجاب اوڑھے ایک خوب صورت اور پرکشش لڑکی اپنے چہرے پر حیرانی بھرے تاثرات سجائے سن کھڑی تھی۔

☆☆☆

اسوہ اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے اپنے دائیں بائیں بیٹھی خواتین کی گفتگو سن رہی تھی۔ایک دو دفعہ انھوں نے اسوہ کو بھی اپنی گفتگو میں شامل کرنا چاہا مگر اس کی بے زاری بھانپتے ہوئے وہ آپس ہی میں محو گفتگو رہیں۔ان کی باتیں سن کر اسوہ کو اندازہ ہوا کہ یو اے کمپنی ایک منفرد سا کھ رکھتی ہے۔وہاں پر آئی ہوئی اکثر خواتین دوسری کمپنیوں میں جاب کر رہی تھیں۔اور آج اپنی کمپنی سے چھٹی کر کے بہ طور خاص یہاں قسمت آزمانے آئی تھیں ۔دو خواتین تو دس دس سال کا تجربہ رکھتی تھیں۔ان کی موجودی میں اسوہ کو اپنی دال گلتی نظر نہیں آ رہی تھی ۔تعلیم اور تجربے ہر دو لحاظ سے وہ اس سے برتر تھیں۔اور جو کچھ یو اے کمپنی کے چیئر مین اور سٹاف کے بارے وہ سن رہی تھی اس کے مطابق یہاں کام ہی کو فوقیت دی جاتی تھی۔خود اسے بھی کسی ایسی ہی کمپنی کی تلاش تھی جہاں اسے اس کی تعلیم اور کام کی بہ دولت پہچانا جائے نہ کہ شکل وصورت کی وجہ سے اس کی پذیرائی ہو اور اس سے ایسی توقعات وابستہ کر لی جائیں جن کا پورا کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔

اس نے نوٹ کیا کہ ہر امیدوار کو اچھا خاصا وقت دیا جا رہا تھا گویا وہ تمام کو اچھی طرح چھان پھٹک رہے تھے۔اور پھر اس کا نمبر بھی آ گیا۔اس سے پہلے بیٹھی ہوئی لڑکی اندر گئی اور وہ مستقل دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔قریبا پانچ دس منٹ لگا کر وہ باہر نکلی اور اپنے فائل ہاتھ میں سنبھالے پہلے والی امیدواروں کی طرح خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔اسوہ زیر لب دعائیہ کلمات دہراتے دفتر کی جانب بڑھ گئی۔باقی لڑکیوں اور خواتین کی بات چیت سن کر اس کے دل میں یہ خواہش شدت سے جاگ اٹھی تھی کہ اسے وہاں جاب مل جائے۔اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہاں خواتین کا شعبہ بالکل علاحدہ تھا جہاں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔اور بغیر چیئر مین کی اجازت کے وہاں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔اور یہ کہ خواتین کے شعبے کی منیجمنٹ ڈائریکٹر ایک خاتون تھی جو کمپنی کے چیئر مین کی کوئی رشتا دار تھی۔

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ اس کی نظر سامنے کرسی پر بیٹھے جواں سال شخص پر پڑی۔ اسے لگا اس کی نظریں دھوکا کھا رہی ہیں۔ گھومنے والی اعلا کرسی پر بیٹھا شخص عمار کیسے ہو سکتا تھا۔ یو اے چین آف کمپنیز کا چیئرمین عمار بشیر احمد، ایک کلرک کا بیٹا کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ جیسے اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی یاداشت نے چند سال پیچھے چھلانگ لگائی اور اس کے دماغ میں اپنی ہی آواز گونجنے لگی....

"نظر آ رہی ہے میری کوٹھی؟ ہو رہا ہے کچھ اندازہ کہ اسوہ اسلم شکور خان کس بلا کا نام ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے ایک کلاس میں پڑھنے کی وجہ سے ہم دونوں برابر ہو گئے ہیں۔ احمق انسان میرے لباس اور جوتوں کی قیمت سے تمھاری کلاس کے لوگوں کا سالانہ بجٹ تیار ہو سکتا ہے اور تم مجھے اپنی گھٹیا محبت سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ منع نہیں کیا تھا کہ اپنی حیثیت پہچانو۔ میرے نزدیک، تمھاری حیثیت سڑک پر پھرنے والے کتے کے آوارہ پلّے سے زیادہ نہیں ہے۔ گھٹیا نسل کے پنچ انسان! تمھیں میرے نرمی سے سمجھانے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا کیوں؟۔ آیندہ اگر مجھے فلمی محبت دکھانے کی کوشش کی تو آنکھیں نکال کر چیل کوّوں کو ڈال دوں گی۔ بڑا آیا مجنوں کی اولاد۔ تھانے جا کر تمھارے سر سے محبت کا بھوت اچھی طرح اتر جاتا مگر مجھے تمھاری ماں پر ترس آ رہا ہے۔ اور یاد رکھنا ہمیشہ یہ ترس نہیں آئے گا۔ بڑا آیا شادی کرنے والا.... انسپکٹر صاحب! اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال باہر کرو۔"

یہ ساری باتیں سوچتے ہی اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ کچھ بھی تھا وہ عمار کی مجرم تھی۔ چاہنے کے باوجود وہ اس وقت اس سے معافی نہیں مانگ سکی تھی۔ اور جس حالت میں وہ اس کے سامنے کھڑی تھی اب معافی مانگنا اپنی عزت نفس اور خودداری پر چھری چلانے کے مترادف تھا۔ قسمت اسے جانے کس موڑ پر لے آئی تھی۔ وہ ساری ساری رات جاگ کر عمار کے ملنے کے بعد اس سے کرنے والی گفتگو کے بارے سوچتی رہتی۔ کئی ہزار

مضامین اس نے معافی تلافی کے سوچے تھے۔لاکھوں مکالمے اس نے محبت بھری گفتگو کے یاد کرر کھے تھے جو اس نے عمار سے پہلی ہی ملاقات میں بولنا تھے۔ لیکن جس مقام پر اسے مقدر لے آیا تھا اب ایسی کسی گفتگو کے بارے سوچنا بھی محال تھا۔

عمار کو اس نے آخری مکالمے میں یہی کہا تھا کہ وہ اس کے لیے کتے کے پلے جتنی اہمیت رکھتا ہے تو آج دولت کی فراوانی سے وہ کتے کا پلا شریف النسل اور اعلا نسب کا مالک کیسے ہو گیا تھا۔وہ اسے کیسے یقین دلاتی کہ وہ اسے اپنی غربت کے باوجود اپنے جسم و جان کا مالک مان چکی تھی۔ کیسے بتاتی کہ صرف عمار کی خاطر وہ کتنے رشتے ٹھکرا چکی تھی۔ کیسے اسے باور کراتی کہ وہ کراچی کی سڑکوں پر پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتی رہی تھی۔ وہ کیسے اپنی ان راتوں کی روداد سناتی کہ جن راتوں میں اس نے تہجد میں اٹھ کر عمار کی خیریت کی دعائیں کی تھیں،اس کو پانے کے لیے اپنے پاک رب کے سامنے گڑ گڑائی تھی۔خیالوں ہی خیالوں میں اس کے لیے دلھن کی طرح سجی سنوری تھی۔ یہ سب باتیں کہنا اب مشکل نہیں نا ممکن تھا۔اب یوں بھی اس کا عمار کی کمپنی میں نوکری کی درخواست دینا ہی ہتک آمیز اور قابلِ توہین تھا۔

"بیٹی!.... آؤ نا،رک کیوں گئی ہو؟" انوارالحق نے اسے ایک ہی جگہ رکے دیکھ کر آواز دی۔ اتنا تو اس جہاں دیدہ شخص نے بھی جان لیا تھا کہ اس لڑکی کا عمار کی زندگی میں کوئی گہرا تعلق تھا۔یقیناً یہ وہی لڑکی ہو سکتی تھی جس کا سرسری تذکرہ عمار چند بار کر چکا تھا۔اور اس کی شکل دیکھ کر تو اس کا گمان یقین میں بدل چکا تھا کہ وہ یہی لڑکی ہو سکتی ہے کیونکہ ایسی لڑکی کے لیے ساری عمر بھی انتظار کیا جا سکتا ہے۔

اسوہ ایک دم چونکتے ہوئے بولی۔"جج....جی سر!" اور پھر اپنی ٹانگوں کی لرزش پر قابو پا کر نپے تلے قدم رکھتے آگے بڑھی۔

"بیٹھو۔"عمار کو خاموش پا کر انوار الحق نے اسوہ کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

انوار الحق کو اس بات پر حیرانی ہو رہی تھی کہ جس لڑکی کے بارے عمار بات کر رہا تھا وہ تو اس کے تیئں امریکہ میں تھی اور پھر وہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی کہ جس کی صرف کوٹھی ہی کروڑوں میں بکی تھی۔ایسی لڑکی کو نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔یا ممکن تھا یہ عمار کی کوئی اور جاننے والی ہوتی۔کوئی اور دوست یا دشمن کیونکہ یہی دو رشتے ایسے ہیں جنھیں بھلانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔یا تو بہت پیارے ہمیشہ یاداشت میں رہتے ہیں یا پھر قابل نفرت بھول نہیں پاتے۔مگر عمار کی آنکھیں جو کچھ کہہ رہی تھیں اس کے مطابق تو یہ وہی لڑکی تھی جسے وہ محبت کرتا تھا۔کسی قابلِ نفرت شخص کو دیکھتے ہوئے چہرے پر ایسے تاثرات نہیں ابھرتے۔

"شکریہ سر!"کہہ کر وہ بیٹھ گئی۔اس کی بھی عجیب حالت ہو رہی تھی۔جس کی تلاش میں پاگل ہو گئی تھی وہ ملا بھی تو یوں کہ نہ معافی مانگنے کی گنجائش رہی تھی نہ اظہار کرنے کی جرّات۔اگر یونیورسٹی ہی میں عمار سے معافی مانگنے کا موقع مل گیا ہوتا تو آج وہ یوں شرمساری اور ندامت محسوس نہ کرتی۔وہ تو اس کی وجہ ہی سے یونیورسٹی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔اور اب وہ ایک بلند رتبے اور مقام کے ساتھ اس کے سامنے آ رہا تھا۔نصیب کے چکر نے گھوم کر اسے اوپر اور اسوہ کو نیچے لا پھینکا تھا۔بہ قول شاعر.....

بلندی کا بھروسا کیا

کبھی ہم تھے جہاں تم ہو

اب اگر وہ معافی تلافی کی بات کرتی یا اپنی محبت کا اظہار کرتی تو یقینا عمار کے نزدیک اس کی رہی سہی قدر اور عزت بھی باقی نہ رہتی۔

اسوہ نے بڑی مشکل سے اس کے چہرے پر سے نظر ہٹائی تھی۔ وہی عمار جسے یونیورسٹی کے دنوں میں دیکھنا بھی اسے گوارا نہیں تھا آج کسی اور دنیا کی مخلوق نظر آ رہا تھا۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار تو وہ پہلے بھی تھا اب اعلا قیمتی لباس اور مرعوب کن کرسی پر بیٹھا وہ اسے اپنی رسائی سے بہت دور نظر آ رہا تھا۔

انوار الحق کی بات سن کر عمار کی محویت ٹوٹی اور اس کے ساتھ ہی اسے لگا کہ یوں اسوہ کو دیدے پھاڑ کر دیکھنا مناسب نہیں تھا۔ جانے وہ کیا سوچتی۔ یوں بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسوہ اس سے نفرت کرتی تھی ۔اس کے چہرے سے نظر پھیرنا اسے دنیا کا مشکل ترین کام نظر آتا تھا۔ ٹیوب لائیٹ کی دودھیا روشنی نے اس کے دودھ رنگ چہرے کو اور زیادہ اجال دیا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر اسوہ کی فائل اٹھا کر کھول لی۔ اور پھر بغیر پڑھے بند کر کے انٹر کام کا رسیور اٹھا کر مہ جبین کو کال کرنے لگا۔

"جی سر!...." اس نے رسیور اٹھاتے ہی کہا۔

"مہ جبین کافی تو بھیج دو؟"

"جی سر!.... ابھی دو تین منٹ پہلے ہی تو آپ نے بتایا ہے۔ جیسے ہی تیار ہوتی ہے میں لے آتی ہوں۔"

"ہاں یاد ہے، اب تین کپ لانے ہیں۔" اس نے جلدی سے بات بنائی۔

"ٹھیک ہے سر!" مہ جبین نے کہا اور اس نے رسیور رکھ دیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کرے۔ آیا اسوہ کو پرانا برتاؤ یاد کراتے ہوئے اس کی توہین کرے، اس سے پوچھے کہ اب بتاؤ کہاں گئی تمھاری دولت، کہاں گیا تمھارا غرور و تکبر وہ طنطنہ جس کے بل بوتے پر ایک غریب کلرک کے بیٹے کو بغیر کسی قصور کے تم نے پولیس کے ہاتھوں زدوکوب کرایا تھا۔ لیکن یہ خیال صرف

ایک لمحے کے لیے آیا تھا اس کے بعد اس کے دماغ سے نکل گیا کیونکہ ایسا توہین آمیز برتاؤ تو وہ کسی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا تھا اسوہ کو کیسے کچھ کہتا کہ جس کا وجود ہی اس کے لیے اتنا اہم پاکیزہ اور مقدس تھا۔دوسری صورت یہ تھی کہ وہ فوراً پرانا عمار بن کر اظہار محبت کر دیتا۔اور اس کا دل کچھ ایسا ہی کرنے کو کر رہا تھا ،مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اسوہ کے موڈ کا کچھ پتا نہیں تھا۔وہ مفلس دکھائی دے رہی تھی لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ غربت کے ساتھ اس کے دل میں عمار کی محبت بھی جاگ اٹھی ہو۔گو وہ نادم اور پشیمان دکھائی دے رہی تھی۔اور یقیناً یہ ندامت اسی وجہ سے تھی کہ اس نے عمار کے ساتھ ماضی میں کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔

اب لے دے کے اس کے پاس ایک طریقہ ہی رہ گیا تھا کہ وہ اسوہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسے بہت عرصے کے بچھڑے کلاس فیلو ملتے ہیں۔اس کے پرانے برتاؤ کو ایک طرف رکھ کر اور اپنی محبت پر پردہ ڈال کر۔یہی طریقہ ہی سب سے بہتر تھا۔اس نے دوبارہ اپنی بے قابو ہوتی نظروں پر سے ضبط کا پہرہ ہٹایا۔وہ اپنی کالی چادر کے کونے کو اضطراری انداز میں اپنی انگلی سے لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔دو تین بل دے کر وہ دوپٹے کو کھینچتی اور دوبارہ بل دینے لگ جاتی۔

”کیسی ہو اسوہ!“اس نے اپنا لہجہ بہ ظاہر نارمل رکھا تھا۔لیکن ان الفاظ کے پیچھے جو چاہت ابل رہی تھی،ان میں جو محبت چھپی تھی کسی حساس دل کے لیے اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔

اس کے عام سے سوال نے ایک دم اسوہ کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیئے۔کہاں تو وہ تہیہ کیے بیٹھی تھی کہ عمار کو فی الحال کچھ نہیں بتائے گی اور کہاں عمار کے فقط اتنا کہنے پر ہی اس کے آنسو یوں بہہ نکلے جیسے بارشوں کی زیادتی سے کسی بند کا پشتہ ٹوٹ گیا ہو۔دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر وہ بلک اٹھی۔

انوارالحق ایک دم۔ "ایسکیوزمی۔" کہتا ہوا باہر کی طرف چل دیا اس جہاں دیدہ شخص نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی وہاں ضرورت نہیں تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اسے مہ جبین کافی کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوتی نظر آئی۔

"واپس چلو۔" انوارالحق نے اسے واپس پلٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیرانی بھرے تاثرات چہرے پر سجائے واپس مڑ گئی ۔

عمار، انوارالحق کے باہر جانے کا نوٹس لیے بغیر ایک دم گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور وسیع و عریض آفس ٹیبل سے گھوم کر اسوہ کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھا۔ "کیا ہوا اسوہ!.... مجھے بتاؤ کیوں رو رہی ہو؟" اس نے بے ساختہ اس کا ملائم ریشمی ہاتھ تھام لیا تھا۔

اس کی سسکیاں بلند ہوئیں اور آنسوؤں کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ جانے کیوں عمار کے چاہت سے پکارنے پر دل بھر آیا تھا۔ اور ایک دم خود پر گزرے سارے مظالم اس کے دماغ میں چلنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا بتائے۔ اس کا پیارا والد کسی کے مظالم کی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ان کی دھن دولت جائیداد سب چھین لی گئی تھی، اسے بیچ سڑک پر زدوکوب کیا گیا، اوباش مردوں نے واہیات انداز میں اس کی عزت خراب کرنے کی کوشش کی تھی، ٹکے ٹکے کے مرد جنھیں وہ ملازم رکھنا گوارا نہ کرتی ان کے سامنے ملازم بن کر جی حضوری کرتی رہی تھی، اس کے کردار پر انگلی اٹھائی گئی تھی اسے استہزاء کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پتا نہیں کیا کیا ہوا تھا۔ آج عمار کو دیکھتے ہی اسے اس بچے کی طرح ساری باتیں یاد آ گئیں جو پرائے بچوں سے لڑتے ہوئے تو مار کھانے کے باوجود میدان میں ڈٹا رہتا ہے لیکن جونہی ماں کے سامنے پہنچتا ہے ایک دم اس کی چوٹوں میں درد کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے اور اسے دوسروں کی ساری زیادتیاں بھی یاد آ جاتی ہیں۔ اس وقت وہ گن گن کر بتاتا

ہے، امی مجھے انھوں نے تھپڑ بھی مارے، لاتیں بھی ماریں، گریبان سے بھی پکڑا، گالیاں بھی بکیں اور میں رو رو کر تمھیں آوازیں دیتا رہا۔ اسوہ کی بھی یہی حالت تھی، ایک چاہنے والا مرد ہی تو عورت کا اصل محافظ ہوتا ہے ۔ گندے اور اوباش مردوں کی نظروں سے بھی اسے وہی بچاتا ہے، دنیا کا ہر سرد و گرم اس حفاظت کی دیوار سے ٹکرا کر ہی عورت ذات تک پہنچ پاتا ہے۔

"پتا ہے تمھارے رونے سے مجھے کتنی اذیت اور دکھ ہو رہا ہے؟" اسے چپ نہ ہوتے دیکھ کر عمار نے اس کا ملائم ہاتھ سہلاتے ہوئے چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو کبھی نفرت بھرے انداز میں اس کے چہرے پر لگا تھا۔ اور آج وہی ہاتھ آسرا چاہنے کے لیے اس کے ہاتھوں کی پناہ میں آ گیا تھا۔ کچھ بھی وہ ہاتھ اس کے لیے دنیا کے ہر خزانے سے زیادہ پیارا، عزیز اور قیمتی تھا۔

اسوہ کی سسکیوں کی رفتار میں کمی آئی، عمار نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ جسے لے کر وہ اپنی آنکھیں رگڑنے لگی۔

"اچھا اب بتاؤ کیا ہوا ہے، کیوں اتنا رونا آ رہا ہے؟" عمار نے اس کے آنسو تھمتے ہی دوبارہ چاہت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں، بس پاپا یاد آ گئے تھے۔" اسوہ کو اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھا تھا۔

"مجھے ان کے بارے چند ماہ پہلے ہی معلوم ہوا۔ بہت افسوس ہوا ان کے انتقال پر۔ لیکن جانا تو ہر کسی ہوتا ہے نا؟"

اسوہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ بس آنسوؤں پر اس کا اختیار نہیں تھا ورنہ وہ کبھی یوں نہ بہاتی۔ لیکن آنسو بہانے سے ایک فائدہ تو ہو گیا تھا۔ عمار کا بے ساختگی سے اٹھ کر اس کے قریب آنا، یوں چاہت بھرے لہجے میں اسے مخاطب کرنا، اس کے رونے پر غم کا اظہار کرنا، یوں اجنبیت کی ساری دیواریں گرا کر محو گفتگو ہو جانا۔ یہ اس کے آنسوؤں ہی کا تو کمال تھا۔ عورت کے آنسو ہمیشہ اسے فتح دلا دیتے ہیں۔

"اچھا اگر برا نہ مناؤ تو ایک بات پوچھوں؟" عمار نے ابھی تک اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ نہ تو اس کا دل کر رہا تھا کہ اسوہ کا ہاتھ چھوڑ دے اور نہ اسوہ ہی کا جی چاہ رہا تھا ان ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑانے کو۔ بلکہ وہ تو اپنا ہاتھ کب کا ان ہاتھوں میں دینا چاہ رہی تھی بس مقدر نے کچھ رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔

زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"مجھے تو کسی سے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنی کوٹھی بیچ کر امریکہ چلی گئی ہو؟" عمار نے اپنے دل میں مچلتے سوالوں میں سے ایک سوال کو الفاظ کی شکل میں ڈھالا۔

"یہ آپ کو کس نے بتایا تھا؟" اس نے بہ مشکل چند الفاظ منہ سے نکالے۔

"جس سے آپ نے اپنی کوٹھی کا سودا کیا تھا۔"

"اس نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔ میری ساری جائیداد تو فراڈ کے ذریعے ہتھیالی گئی ہے۔" وہ سسکنے کے انداز میں بولی۔

"کیا.... کس نے، کیسے؟" عمار کے لہجے میں حیرانی کے ساتھ بھرپور غیض و غضب بھی شامل تھا۔

"کوئی ایک دکھ ہو تو بیان کروں نا....؟" وہ ایک مرتبہ پھر رونے لگ گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے، فی الحال اپنا موڈ ٹھیک کر و روؤ مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں آگیا ہوں نا، سب کو دیکھ لوں گا۔ جس جس نے دکھ دیا ہے اس سے پورا پورا بدلہ لوں گا، جس جس نے ستایا ہے اسے جواب دینا پڑے گا، جس نے تنگ کیا ہے اسے سختی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس نے کچھ چھینا ہے اسے واپس کرنا پڑے گا ۔بس اب تو ان اشکوں کو روک لو۔" اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے عمار ایک عزم سے بولا۔ اسوہ کے جلتے زخموں پر جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ اس نے پر سکون انداز میں سوچا۔

"یہی تو محبت ہوتی ہے۔" ایک کمینہ عرفان تھا جو جھوٹی تسلی بھی نہیں دے سکا تھا۔ جس کی نظر اسوہ کے خوب صورت بدن سے آگے نہیں گئی تھی اور عمار اس کے چند آنسوؤں اور دو تین الفاظ سن کر ہی بغیر کسی تردّد کے فوراً اسے دکھ دینے والے ذمہ داروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا اعلان کر دیا تھا۔ عمار کی بات ختم ہوتے ہی اس نے اشکوں سے دھلی سیاہ آنکھیں اس کی جانب اٹھائیں۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اور پھر اسوہ کی آنکھوں سے محبت سے لبریز ایسی شعاعیں خارج ہوئیں کہ عمار کی روح تک سرشار ہو گئی تھی۔ بے ساختہ اس کے دل سے دعا نکلی کہ یا اللہ یہ وقت یہیں ٹھہر جائے بس اس کی اسوہ یونہی اس کی جانب متوجہ رہے۔ اس وقت تو اسے یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا کہ سانس لینا اہم ہے یا اسوہ کو تکنا۔

چند لمحے اسے تکنے کے بعد اسوہ نے دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

"اچھا آج کل کہاں رہ رہی ہو؟" عمار نے اسے اداسی کی گرفت سے نکالنے کی سعی کی۔

”کرائے کا ایک کمرہ ملا ہے کسی کے گھر میں۔“ اسوہ نے صاف گوئی سے کہا۔ عمار سے کوئی بات چھپانے کا دل ہی نہیں کر رہا تھا۔

عمار بہ دقت تمام اٹھ کر اپنی کرسی کے پاس پہنچا اور انٹر کام کا رسیور اٹھا کر پوچھنے لگا۔

”مہ جبین ابھی تک کافی نہیں بھیجی؟“

”سر!.... میں لا تو رہی تھی، انوار صاحب نے دروازے ہی سے مجھے واپس کر دیا تھا۔“

”اچھا اب بھیج دو۔“

”جی سر!“ مہ جبین نے کہا۔ اور عمار نے رسیور رکھ دیا۔

”اچھا ایک بات کہوں خفا تو نہیں ہوں گی آپ۔“ اس نے ہمت مجتمع کی۔

”میں کیا اور میری خفگی کیا؟“ اسوہ کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”کیا میرے بارے بھی یہ گمان رکھتی ہو کہ آپ کی خفگی میرے لیے کوئی معانی نہیں رکھتی۔“

”آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ آپ تھک گئے ہیں؟“ اسوہ نے نظریں جھکاتے ہوئے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔ گویا بے لفظوں میں اس نے عمار کو اس نظم کی یاد دلائی تھی جو یونیورسٹی سے الوداع ہوتے اس نے آخری دن اپنی کلاس میں سنائی تھی۔

عمار کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”ارادے ہمیشہ تو پورا نہیں ہوا کرتے۔“

اسوہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ خوب صورت تبسم نمودار ہوا، اس نے فوراً کھانسی کا سہارا لے کر اپنی مسکراہٹ کو چھپانا چاہا لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ شوخی سے بولی۔

"تو ارادہ کوئی کرے کیوں؟"

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ "غلطی بھی انسان ہی سے ہوتی ہے۔"

وہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی فوراً بولی۔ "کچھ غلطیاں قابلِ معافی نہیں ہوتیں۔"

"اگر کوئی دوبارہ ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ کرے تو پھر تو گنجائش نکل سکتی ہے نا؟"

"سوچا جا سکتا ہے۔" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ دھیمے انداز میں بولی۔

"یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ، اگر کسی دن میں محسوس کروں کہ معاشی لحاظ سے آپ کے ہم پلہ ہو گیا ہوں، تب اپنے والدین کو آپ کے گھر رشتا لینے بھیج دوں، آپ کے والد صاحب انکار نہیں کریں گے۔ آج میں یو اے گروپ آف کمپنیز کا مالک ہوں اور آپ کے والد محترم نہیں رہے کیا میں اپنی امی اور ابو جان کو آپ کی امی کے پاس بھیج سکتا ہوں۔" عمار نے اجازت چاہنے والے انداز میں کہا۔ اس کے انداز میں ذرا بھر بھی طنز یا فخر کا اثر موجود نہیں تھا۔ یہ علاحدہ بات کہ یہ کہتے ہوئے اس کے دل میں ہزارہا اندیشے لرز رہے تھے۔ اتنے سال گزر گئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ اس نے شادی بھی کر لی ہوتی۔

اسوہ کے دل کی دھڑکن جیسے رکنے لگی تھی اتنی جلدی، اتنی سرعت سے، اتنی بے صبری؟ یقیناً آج بھی عمار اسے اتنا ہی چاہتا تھا۔ وہ ندامت بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ "مگر میرے پاس تو کچھ بھی باقی نہیں رہا، سوائے آہوں، سسکیوں اور دکھوں کے۔"

"اگر آپ نہ ملیں تو میرے پاس بھی کچھ باقی نہیں رہے گا۔" عمار نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس مرتبہ منہ سے کچھ کہے بنا اسوہ نے ایک کاغذ پر اپنا پتا لکھ کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس سے بڑھ کر اثباتی جواب کیا ہو سکتا تھا۔

"شکریہ۔" عمار شوخی سے بولا۔ اسوہ کے کچھ کہنے سے پہلے مہ جبین کافی کے کپ ٹرے میں رکھے دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔

کافی کے کپ ان کے سامنے رکھتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "سر!.... انوار صاحب انٹرویو کا پوچھ رہے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے گہری نظر اسوہ کے سراپے پر ڈالی تھی۔ گویا اسے بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔

"اوہ...." ایک دم عمار کو یاد آیا کہ بے چارے کتنے امیدوار منتظر بیٹھے تھے۔ "بس کافی پی کر شروع کرتا ہوں ۔انوار صاحب کو بھی اندر بھیج دو۔"

"جی سر!" کہہ کر وہ واپس مڑ گئی۔

"اپنی کلاس فیلو کو ملنے کی خوشی میں آپ نے جانے کتنی لڑکیوں کو انتظار کی کوفت میں مبتلا رکھا۔" اسوہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے انداز پر عمار بھی ہنس پڑا تھا۔ لیکن اس نے اسوہ کو جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

اجازت مانگ کر انوار الحق اندر داخل ہوا اور اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"انوار بھائی!....کافی؟" عمار نے پوچھا۔

"شکریہ سر!....میں نے پی لی تھی۔"

"اچھا میں کافی ختم کرلوں پھر انٹرویو شروع کرتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے، سیلنگ ڈائریکٹر کی امیدوار خواتین کا انٹرویو لینے کی تو ضرورت نہیں ہے نا۔" انوار الحق نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" عمار نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں نے سوچا شاید مس اسوہ کا چناؤ ہو گیا ہے۔"

"ہاہاہا۔" عمار کا قہقہہ بلند ہوا۔ "انوار بھائی!.... کمپنی کی مالکن کو نوکری کی کیا ضرورت۔"

"مالکن....؟" اب حیران ہونے کی باری انوار الحق کی تھی۔

"آپ پوچھتے تھے نہ کہ یوا سے کیا بنتا ہے، آج یقیناً معلوم ہو گیا ہو گا۔"

"اسوہ عمار....واہ شکریہ کہ آپ نے بتا دیا۔" انوار الحق نے خوش دلی سے کہا جبکہ اسوہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی، کہاں تو وہ عمار کو دیکھتے ہی اس فکر میں پڑ گئی تھی کہ کیسے اس تک اپنے دل کا حال پہنچائے گی اور کہاں لمحوں میں عمار نے اسے اسی مرتبے اور اونچائی پر بٹھا دیا تھا جہاں وہ خود کو سمجھتی تھی۔

وہ موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولی۔ "آپ نے اسماء اور مدثر کا نہیں پوچھا۔"

"اسماءاور مدثر۔" وہ ششدر رہی تو رہ گیا تھا۔" آپ سے کیا پوچھوں، ان کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا ۔"

"ایسا تو بس آپ ہی سمجھتے ہیں۔" وہ ناز سے بولی۔" آپ کے جانے کے بعد میں نے مدثر کو بھائی بنالیا تھا اور اسماء کو بہن۔اور آپ کو یہ بھی بتاتی چلوں کہ دونوں نے شادی بھی کر لی ہے۔"

"کیا.... مدثر اور اسماء نے شادی کر لی ہے۔" وہ مسلسل عمار کو حیران کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

"جی ہاں.... اپنے کوٹھی چھوڑنے کے بعد میں نے امی جان کے ہمراہ چند دن انھی کے ہاں قیام کیا تھا۔ابھی دو تین ماہ ہی ہوئے ہیں ان کا گھر چھوڑے ہوئے۔"

"یعنی اتنا زیادہ تعلق۔"

"اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے چھٹی کے بعد ان سے ہو آؤں۔" عمار خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"انھوں نے گھر بھی خرید لیا ہے یہ نہ ہو پرانے پتے پر پھرتے رہو۔" اسوہ کو یاد آیا کہ اب وہ پرانے گھر میں نہیں تھے۔اور یقیناً عمار نے مدثر کا پرانا گھر ہی دیکھا ہوا تھا۔

اچانک انٹر کام کی گھنٹی بجی۔عمار نے رسیور کان سے لگایا۔مہ جبین کی آواز آئی۔" سر...." اور پھر وہ کسی اور سے مخاطب ہو گئی۔" پلیز مس!.... آپ یوں اندر نہیں جا سکتیں....؟" اسی لمحے عمار کو دروازے پر کھٹکا سنائی دیا

۔مہ جبین نے بھی رسیور رکھ کر دیا تھادروازے پر ہلکا سا شور سنائی دیا اس کے ساتھ ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔مہ جبین کے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

"پلیز مس!.... آپ یوں نہیں جاسکتیں........ سر دیکھیں یہ میری بات نہیں سن رہی؟"

دوسری لڑکی غزالہ تھی۔جو مہ جبین کی بات کو درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔

"مہ جبین!.... ٹھیک ہے آپ جائیں۔"عمار نے اسے آواز دی۔اور وہ خشمگین نگاہوں سے غزالہ کو گھورتے واپس مڑ گئی۔

"عمار صاحب!.... کم از کم اپنے ملازموں سے تو میرا تعارف کرا دیں۔"وہ بے تکلفی سے فوم والی کرسی گھسیٹ کر عمار کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

"معذرت خواہ ہوں، لیکن آپ کو اس کی بات سن لینا چاہیے تھی۔"عمار نے نرم لہجے میں اسے تنبیہ کی۔

اسوہ عجیب سی نظروں سے اس خوب صورت لڑکی کو دیکھنے لگ گئی۔

"سن تو لی تھی، بس عمل نہیں کیا۔"غزالہ شوخ لہجے میں بولی۔

اور عمار افسوس بھرے انداز سر ہلا کر رہ گیا۔اسے بے زاری محسوس ہو رہی تھی۔اسوہ کے آجانے کے بعد اسے ایسی کسی لڑکی سے بات چیت گوارہ نہیں تھی۔

"اچھا آپ نے میری آمد کا مقصد نہیں پوچھا۔"بولی عمار کی بے زاری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولی۔

"جی بتائیں۔"

"آج میرے پیپرز اختتام پذیر ہو گئے ہیں، ابھی یونیورسٹی سے سیدھا آپ کے پاس آ رہی ہوں۔ آج رات آپ کا ڈنر میرے پاس ہے۔"

"مبارک ہو، اللہ کرے پاس ہو جاؤ۔"

وہ شوخی سے بولی۔ "آمین، ویسے میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے ہیں۔ اور آپ کی دعا کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔"

"چلو میں اپنی دعا واپس لے لیتا ہوں۔" عمار منہ بناتے ہوئے بولا۔

"اچھا کوئی ویکنسی میرے لیے بھی نکل آئے گی یا بس خوب صورت لڑکیوں ہی کو جاب پر رکھتے ہو۔" اس نے اسوہ کی جانب گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"انٹرویو دے دو اگر کامیاب ہو گئیں تو خوش آمدید۔"

"نہیں جی شکریہ، بلکہ میری جگہ اس لڑکی کو رکھ لو۔" اس نے اسوہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

اسوہ، اس کی بات سن کر تلملا گئی تھی، لیکن اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا کہ اب اس نے خود پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔ لیکن عمار کو بھی غزالہ کی بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔ کیونکہ اس نے اسوہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایسا انداز اپنایا تھا گویا وہ کوئی گری پڑی لڑکی ہو۔ وہ فوراً اس کا مزاج درست کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ، معذرت خواہ ہوں میں تعارف کرانا ہی بھول گیا۔ ان سے ملو یہ ہیں مس اسوہ اسلم شکور خان۔ میری منگیتر۔"

"ہا....ہا....ہا اچھا مذاق ہے۔" غزالہ نے قہقہہ لگایا۔

"میں مذاق نہیں کیا کرتا مس غزالہ!...." عمار اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا ٹھوس لہجے میں بولا۔ "یہ میرا وہی ماضی ہے جس کا ذکر میں نے آپ کے سامنے کیا تھا۔ اب یہ میرے حال اور مستقبل کو سنوارنے آ گئی ہے۔"

غزالہ کے لہجے سے ہنسی غائب ہوئی اور وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ مذاق ہے تو نہایت بھونڈا مذاق ہے۔"

"شاید آپ کو کسی نے بولنے کی تمیز نہیں سکھائی۔" اسوہ سے چپ نہیں رہا گیا تھا۔ عمار کی ملاقات نے اس کی خوداعتمادی لوٹا دی تھی۔

"تمھیں جرّات کیسے ہوئی مجھے مخاطب کرنے کی۔" غزالہ بپھر کر بولی۔

"پہل کرنے والے کو ایسا کہنا زیب نہیں دیتا۔" اسوہ کچھ کم تو نہیں تھی۔ اس نے غصے پر قابو پانا سیکھ لیا تھا، مگر کسی لڑکی کا عمار سے بے تکلف ہونا تو اسے پہلے بھی بہت تکلیف دیتا تھا اب تو بات ہی کچھ اور تھی۔

"میں نے عمار صاحب کو کہا ہے۔"

"اور عمار میرا منگیتر ہے۔ یقیناً اس کی جگہ میرا جواب دینا بنتا ہے۔" غزالہ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کو مخاطب ہے۔

”عمار صاحب!.... آئندہ مجھے فون کرنے زحمت نہ کیجیے گا۔“غزالہ سے اور کوئی بات نہیں بن پڑی تھی۔عمار کی دھیمی مسکراہٹ بھی اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہی تھی جو اسوہ کی ہر بات پر صدقے قربان ہوتا نظر آ رہا تھا۔یہ کہتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور دفتر سے باہر نکلتی چلی گئی۔

”اس قسم کے اور کتنے کردار ہیں؟“اسوہ نے انوارالحق کی موجودی کے بغیر غصیلے لہجے میں پوچھا تھا۔اس کا انداز ہوبہو شکی مزاج بیوی کا سا تھا۔

”بتاتا ہوں۔“اسے ہاتھ اٹھا کر روکتے ہوئے عمار نے انٹر کام کا رسیور اٹھا کر مہ جبین کو کہا۔”مہ جبین!.... آفس بوائے کو بھیجو۔“

اور اس کی۔”جی سر!....“سنتے ہی عمار رسیور رکھتے ہوئے انوارالحق کی طرف متوجہ ہوا۔

”انوار بھائی!.... آپ کو زحمت تو ہو گی مگر انٹرویو آپ کو اکیلے ہی لینا پڑے گا۔آفس بوائے یہ فائلیں آپ کے آفس میں رکھ دے گا۔“

”ٹھیک ہے سر!“انوارالحق صورت حال کو سمجھتے ہوئے بغیر کسی حجت کے کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت آفس بوائے اندر داخل ہوا۔عمار نے اسے فائلوں کا بنڈل انوارالحق کے آفس میں لے جانے کا کہا ۔وہ سر ہلاتے ہوئے فائلیں اٹھانے لگا۔

ان دونوں کے باہر نکلتے ہی وہ اسوہ کی جانب متوجہ ہوا۔”آپ پوچھ رہی تھیں کہ غزالہ جیسی کتنی ہیں،توبہ خدا خود غزالہ بھی وہ نہیں ہے جو آپ سمجھی ہیں۔“

"پھر وہ اتنا بے تکلف کیوں ہو رہی تھی۔" اسوہ نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

عمار نے پوچھا۔ "تفصیل جاننا چاہو گی؟"

"ہاں۔" اسوہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ جواباً عمار اپنے والد کی بیماری اور خواہش کا ذکر کرنے لگا۔ تمام تفصیل سنتے ہی اسوہ کو لگا کہ اللہ پاک نے اسے بال بال بچایا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عمار کو اس سے دور ہونا پڑ رہا تھا۔ لیکن یقیناً اللہ پاک نے اس کی دعائیں رائیگاں نہیں جانے دیں تھیں۔

"عمار!.... مجھے کوئی حق تو نہیں ہے کہ میں آپ کی کسی بھی بات پر اعتراض کروں، معذرت خواہ ہوں کہ مس غزالہ کے انداز کو دیکھتے ہوئے میں بے ساختہ آپ سے باز پرس کرنے لگ گئی۔"

"ان شاء اللہ آج یہ حق آپ کو باقاعدہ حاصل ہو جائے گا۔" عمار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اسوہ ایک بار پھر شرما گئی۔

"اچھا چلو چلتے ہیں۔" عمار کھڑا ہو گیا۔

"کہاں؟" اسوہ نے بے ساختہ پوچھا۔

عمار نے جواباً کہا۔ "مدثر اور اسماء کے گھر۔"

"نہیں آپ مجھے گھر ڈراپ کر کے وہاں چلے جائیں۔" اسوہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

وہ اطمینان سے بولی۔ "اپنے باقی بہت سارے سوالوں کی طرح اس سوال کو بھی بعد کے لیے اٹھا رکھو۔"

”جیسا تم کہو۔“ عمار نے بے تکلفی کی جانب ایک اور قدم بڑھایا۔

”آپ کا تم کہنا اچھا لگا۔“ اسوہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور عمار گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔ اسوہ اسے ہر قدم پر حیران کیے دے رہی تھی۔

دفتر سے نکل کر وہ شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے پارکنگ میں پہنچے۔ عمار نے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اسوہ فخر اور شکر گزاری کا گہرا احساس دل میں لیے بیٹھ گئی۔ وہ گھوم کر اپنی طرف پہنچا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار پارکنگ سے نکالنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ ایک جیولری شاپ کے سامنے کار پارک کر رہا تھا۔ راستے میں وہ اسوہ کو یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد اپنی جدوجہد کی داستان سناتا رہا تھا۔

”آؤ۔“ اس نے نیچے اترتے ہوئے اسوہ کو دعوت دی۔

”یہ کہاں لے آئے؟“ اسوہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”اپنی منگنی کی انگوٹھی پسند کر لو، یہ نہ ہو بعد میں میری پسند پر ناک بھوں چڑھاتی رہو۔“

وہ اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”حقیقت تو یہ ہے کہ اگر آپ میری انگلی میں اپنے نام کا دھاگا بھی باندھ دیں وہ بھی مجھے قبول ہو گا۔“

سچ۔“ عمار نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”آپ کو کیسے یقین آئے گا۔“ اس نے عمار کے ہاتھ پر اپنی گرفت سخت کر لی تھی۔

"مجھے یقین آگیا ہے۔" عمار نے چاہت سے بھرپور انداز میں کہا۔ اور اسوہ مسکرانے لگی۔ عمار کے کہنے پر سیلز مین نے اسوہ کے سامنے انگوٹھیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اسوہ نے دو انگوٹھیاں پسند کی تھیں۔ ایک اپنے لیے اور دوسری عمار کے لیے۔

"واہ جی واہ.... اپنی انگوٹھی کا بل بھی میں چکاؤں گا۔" عمار نے سیلز مین کو رقم کی ادائی کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔

اسوہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "جی جناب!.... بیوی کے ہر خرچے کا ذمہ دار شوہر ہی ہوتا ہے۔"

عمار مسکرانے لگا۔ سیلز مین کے چہرے پر بھی کاروباری قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔ جیولری شاپ سے باہر آکر عمار نے اسوہ کی بتائی ہوئی سمت کار موڑ دی۔ اسوہ کے گھر تک انھیں آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے کار روک کر وہ کہنے لگا شام کو آٹھ بجے میں امی جان اور ابو جان کے ہمراہ پہنچ جاؤں گا۔"

اسوہ نے دعوت دیتے ہوئے کہا۔ "کھانا بھی یہیں کھانا؟"

"اگر تم نے بنانا ہے تو میں یہ موقع کبھی ضائع نہیں کروں گا۔"

"ہاں، میں نے کھانا بنانا سیکھ لیا ہے۔" حیا لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے، کھانا بھی یہیں کھائیں گے۔" عمار فوراً متفق ہو گیا تھا۔

"آپ کو کیا پسند ہے کھانے میں؟"

"تم کچھ بھی بنا لینا، میرے لیے وہ دنیا کے ہر کھانے سے بہتر ہو گا۔"

"خیالی پلاؤ کیسا رہے گا؟" دروازہ کھول کر وہ باہر نکلتے ہوئے شوخی سے بولی۔

"شاید یہی بنانا ہی سیکھا ہے محترمانے۔" عمار برجستہ بولا۔ اور اسوہ نے کھکھلاتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا دیا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ماں کو آواز دی۔

"امی جان!" نسرین اس وقت فرخندہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بیٹی کے آواز میں شامل خوشی اور جوش نسرین کے لیے حیران کن تھا۔

"آئی بیٹی!" کہہ کر وہ فرخندہ سے اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جونھی وہ کمرے میں داخل ہوئی اسوہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔

"ارے کیا ہوا، میری گڑیا اتنا خوش کیوں ہے؟" نسرین نہال ہو گئی تھی۔

"امی جان!.... آج وہ اپنے والدین کو آپ سے ملانے آ رہا ہے۔" اسوہ کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی

۔

"کیا.... سچ۔" نسرین نے خوشگوار حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں امی جان!...." اسوہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور پھر والدہ کو عمار کے ملنے کے بارے تفصیل بتانے لگی۔ بیٹی کو خوش دیکھ کر نسرین بھی بہت کھل اٹھی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اسوہ کے جانے کے بعد وہ تو بالکل اکیلی رہ جائے گی۔ اور پھر وہ اپنے اندیشے زبان پر بھی لے آئی۔

"مجھے تو بالکل تنہا ہی کر جاؤ گی۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ اور یہ سنتے ہی اسوہ کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولی۔

"امی جان!.... میں آپ کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔ عمار میری کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتا۔"

"نہیں بیٹی!.... اسے کبھی بھی اس بارے مجبور نہ کرنا۔ بس کبھی کبھار یہیں آکر مجھے مل جایا کرنا۔ اور تھوڑی سی گزارے لائق رقم دے دیا کرنا، یہ نہ ہو تمھاری کہنے پر وہ بے دلی سے ہاں تو کر دے مگر بعد میں میری وجہ سے تمھاری خانگی زندگی میں کسی انتشار یا فساد کا شکار ہو جائے۔" ماں کی بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یقیناً یہ بات حقیقت کے خلاف نہیں تھی۔

اسوہ کو گھر کے سامنے اتار کر عمار نے مدثر اور اسماء کے گھر کا رخ کیا۔ اتنا عرصہ اس نے اپنے مخلص دوست کے بغیر گزار دیا تھا۔ دولت کمانے کے کٹھن چکر میں اسے کوئی یاد رہا تھا تو وہ اسوہ کی ذات تھی۔

رستے میں اس نے ایک مارکیٹ سے ان دونوں کے لیے چند قیمتی تحائف بھی خرید لیے تھے۔ سہ پہر کے پانچ ہونے کو تھے جب وہ مدثر کی گلی میں مڑا اس کے آگے ایک سفید رنگ کی سوزکی کار تھی۔ وہ دائیں بائیں مکانوں کے نمبر دیکھتا ہوا سست رفتاری آگے بڑھتا رہا۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ وہ سفید سوزکی اسی مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہ دروازہ بند کرنے والی پر پڑی۔

وہ اسماء احتشام کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ ذرا سی فربہ ہو گئی تھی باقی اس کی شکل و صورت بالکل بھی نہیں بدلی تھی۔ کار روک کر وہ نیچے اترا۔ اسماء نے دروازہ بند کرتے ہوئے بھی اپنے گھر کے سامنے کار رکتی ہوئی دیکھ لی تھی۔ مگر وہ زیادہ توجہ اس لیے بھی نہ دے سکی کہ اس کے خیال کے مطابق وہ پڑسیوں کا کوئی مہمان وغیرہ ہو سکتا تھا۔

عمار نے نیچے اتر کر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا اور اسماء جو مدثر کے ہاتھ سے بیگ لینے جا رہی تھی ٹھٹھک کر رکی۔ مدثر اسے بیگ تھماتا ہوا خود دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ذیلی کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا اور اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"تم....!" اس نے اتنے زور سے یہ کہا تھا کہ اندر جاتی اسماء بے اختیار رک کر اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ مدثر بے تابانہ باہر نکل کر عمار سے لپٹ گیا۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر عمار کی آنکھیں نم ہونے لگیں تھیں۔

"مدثر کون ہے؟" اسماء نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"خود آکر دیکھ لو۔" مدثر نے عمار سے لپٹے لپٹے جواب دیا۔

"کیا اندر نہیں جانے دو گے؟" عمار نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

"اس قابل تو نہیں ہو کہ تمھیں گھر میں گھسنے دیا جائے۔" مدثر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"کون ہے؟" اسماء تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہیں چلی آئی تھی۔

"ہے ایک بے شرم، بے وفا، دغا باز۔" مدثر اسے بازوؤں کے حلقے سے آزاد کرتا ہوا پیچھے ہٹا۔

"عمار بھائی!...." اسماء چیخی۔

"شکر ہے میری بہن نے پہچان تو لیا۔ ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں یہ سننے کو نہ ملے کہ اس بندے کو کہیں دیکھا تھا پر یاد نہیں پڑتا۔"

"واہ، اب طعنوں کے حق دار بھی ہم ٹھہرے۔" اسماء نے اس کے قریب ہو کر اپنا سر جھکایا اور عمار نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اچھا اب اندر چلیں، کیا یہیں سے لوٹنے کا ارادہ ہے۔" اسماء نے اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

عمار ہنسا۔ "مدثر کا ارادہ تو یہی لگ رہا ہے کہ مجھے یہیں سے رخصت کر دے۔"

مدثر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "میرا تو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنے کو دل کر رہا ہے۔ تو کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے؟"

"میری بہن کی موجودی میں تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"بڑا آیا بہن والا اور بہت جلد بہن کی یاد آگئی۔ تم جیسے بھائی کو لتّر لگانے چاہییں۔"

”مدثر!....بس کریں اب۔“ اسماء نے ہنستے ہوئے اسے ٹوکا۔ اور عمار کو گھر کے اندر گھسنے کا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ مدثر کی ماں چند منٹ کے لیے وہاں آئی تھی ۔عمار کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ اسے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔یوں بھی اسے جوانوں کی گفتگو سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

چائے پی گئی، ہلکے پھلکے گلے شکوے ہوئے اور پھر وہ عمار سے اس کے حالات دریافت کرنے لگے۔

”بس اپنا چھوٹا موٹا کاروبار ہے۔“ عمار نے انکساری سے جواب دیا۔

”کار تو بہت قیمتی رکھی ہوئی ہے۔“ اسماء مسکرائی۔

مدثر نے پوچھا۔”اچھا شادی وادی کا بھی کچھ سوچا ہے؟“

”جب آپ لوگوں نے کر لی تو میں کیونکر پیچھے رہ سکتا ہوں۔“ عمار نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”کیا....“ اسماء چلائی۔”اور وہ جو اسوہ بہن سے وعدے وعید کیے تھے؟“

عمار نے ہنستے ہوئے پوچھا۔”کون اسوہ؟“

”عمار بھائی!....مذاق نہ کرو۔اسوہ بہن نے آپ کی شادی کا سنا تو مر جائے گی؟“

"کیا....؟"عمار سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔"اور اسوہ آپ کی بہن کب سے ہو گئی۔"

مدثر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔"وہ بہت بدل گئی ہے۔بلکہ وہ تو اسی وقت بدل گئی تھی جس دن تم نے یونیورسٹی کو خیر باد کہا تھا۔تمھاری دو تین دن مسلسل غیر حاضری سے پریشان ہو کر وہ میرے پاس بھاگی چلی آئی ۔مجھ سے اپنے گزشتہ رویے کی معذرت چاہی،مجھے بھائی بنایا۔اور پھر تمھاری غیر حاضری کا سبب دریافت کیا ۔اور پورے کراچی میں پاگلوں کی طرح تمھاری تلاش میں گھومتی رہی۔ہم دونوں سے وہ بہت محبت اور خلوص سے پیش آتی۔اور پھر ایک دن اپنے کلاس فیلو ارشد طاہر سے اس کی ان بن ہو گئی۔قصور سراسر ارشد کا تھا ...."مدثر اسے اسوہ کے متعلق تمام تفصیل بتانا شروع کر دی۔آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔"یقین مانو اس نے تمھیں اس قدر چاہا ہے کہ جتنا شاید ہی کوئی کسی کو اتنا چاہے۔اور جب اس کی منگنی ہوئی تھی تو اتنا روئی تھی کہ ہمیں اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا تھا۔اسی طرح والد کی وفات اور ساری دولت جائیداد گنوانے کے بعد بھی جب اس کی منگنی ٹوٹی تو وہ اس طرح خوش تھی جیسے اسے من کی مراد مل گئی ہو۔اور اگر وہ چاہتی تو کسی کی بیوی بن کر بھی ان ساری تکلیفات اور مشکلات سے چھٹکارا پا سکتی تھی جو والد کی وفات کے بعد اس کا مقدر بن گئی تھیں۔لیکن اس نے میرے اور اسماء کے کئی بار سمجھانے کے باوجود تمھارے انتظار سے کنارہ کش ہونا گوارا نہ کیا۔اور اب تمھی بتاؤ کہ وہ تمھاری شادی کا سن کر اس پر کیا بیتے گی؟"

"اگر اجازت دو تو میں اسے کال کرتی ہوں،یقیناوہ اگلے آدھے گھنٹے میں یہیں ہو گی۔"اسماء نے لجاجت سے پوچھا۔

عمار اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔"مجھے آپ لوگوں کا پتا بتانے والی وہی ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ بڑے حضرت ہو بھیا!.... ہمیں خواہ مخواہ تنگ کر رہے تھے۔" اسماء کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

مدثر نے پوچھا۔ "اس نے تمھیں کیسے تلاش کر لیا؟"

"نوکری کا اشتہار پڑھ کر انٹرویو دینے آئی تھی، آگے سے میرا سامنا ہو گیا۔"

"ہا.... ہا.... ہا" مدثر اور اسماء نے بیک وقت قہقہہ لگایا۔ "اور تمھیں دیکھ کر کیا گزری اس پر؟" اسماء نے پوچھا۔

عمار جواباََ بولا۔ "اس کا تو معلوم نہیں، میں البتہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کیونکہ جس آدمی سے میں نے اس کی آبائی کوٹھی خریدی تھی اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ امریکہ چلی گئی ہے۔ وہاں اس کا کوئی رشتادار ہے جس سے اس نے شادی کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"اس کی کوٹھی تم نے خرید لی ہے۔" مدثر کے لہجے میں خوشگوار حیرت تھی۔

"ہاں۔" عمار نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آج کل وہیں رہائش پذیر ہوں۔ لیکن یہ بات اسوہ کو نہیں معلوم اور تم بھی بتانے کی زحمت نہ کرنا۔"

"بھیا.... !یقینا نہیں معلوم ہو گی ورنہ وہ کب کا آپ کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ بہت چاہتی ہے آپ کو۔ پچھلے دنوں یہیں رہ رہی تھی تو مجھ سے پراٹھا بنانا سیکھتی رہی۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں مجھے کہنے لگی۔ "وہ آپ کے لیے روٹی بنانا سیکھ رہی ہے کہ وہ آپ کا کھانا اپنے ہاتھوں سے تیار کرے گی اور آپ کو کبھی بھی ملازموں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گی۔ اتنا کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنسی اور کہنے لگی اس مفلسی میں بھی ملازموں کا خیال ذہن سے چپکا ہوا ہے۔ بھیا!.... حساس تو وہ پہلے سے تھی غریب ہونے کے بعد زود رنج بھی ہو گئی۔"

عمار نے انکشاف کیا۔ ”آج ہمارا شام کا کھانا اسی کی طرف ہے۔“

دونوں نے بیک آواز پوچھا۔ ”کیا.... کیوں؟“

وہ اطمینان سے بولا۔ ”رشتا مانگنے جا رہے ہیں۔“

”اللہ پاک کا شکر ہے۔“ اسماء کے منہ سے بے ساختہ دعائیہ کلمات ادا ہوئے۔ ”ویسے مجھے یقین تھا کہ آپ اپنی شادی کی بات مذاق میں کر رہے ہیں۔“

”بس اللہ پاک نے کرم فرما لیا ورنہ اسوہ اگر چند دن مزید نہ آتی تو شاید امی جان اور ابو جان مجھے کسی کھونٹے سے باندھ چکے ہوتے۔“

مدثر نے پوچھا۔ ”یوں ایک دم کیسے؟.... اتنا عرصہ گزار لیا تو اب ایسا کیا ہو گیا کہ آنٹی، انکل نے آپ کو گھیر لیا؟“

”اس دن ابو جان کو ہلکا سا دل کو دورہ پڑا، میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ بس اسی بیماری میں مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کر لیا۔ اور اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو امی جان اور ابو جان حق پر تھے۔ ایسی لڑکی جو پاکستان چھوڑ کر امریکہ چلی گئی ہو اور جس کے دل میں میری نفرت بھری ہو، کسی بھی ضابطے، کلیے اور نظریے سے اس کا انتظار کرنا نہیں بنتا۔“

”اللہ پاک انکل کو شفا دیں۔ اب وہ کیسے ہیں؟“ اسماء نے پوچھا۔ مدثر بھی سوالیہ نظروں سے اسے گھورنے لگا تھا

۔

"الحمد اللہ بالکل ٹھیک ہیں۔" یہ کہہ کر عمار نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی شام کے سات بج رہے تھے۔"اچھا مجھے اجازت دیں، ابھی تک امی جان اور ابو جان کو ڈنر کا بھی نہیں بتا سکا ہوں۔یقیناً یہ سن کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے۔"

اسماء مسکرائی۔"آپ کو کھانے کے بغیر کبھی بھی جانے نہ دیتے مگر اب مجبوری ہے۔"

"اچھا اپنا وزٹنگ کارڈ وغیرہ ہی دیتے جاؤ۔" مدثر شاید اس کی کمپنی کا نام وغیرہ جاننا چاہ رہا تھا۔

"یہ لو۔"عمار نے خوب صورت، دیدہ زیب کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

"یو اے چین آف کمپنیز۔مدثر تقریباً چیخ پڑا تھا۔

عمار کے چہرے پر انکسارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔اسماء بھی حیرانی سے مدثر کو دیکھنے لگی۔

"ایسی انوکھی بات کیا ہے کہ آپ اتنا حیرانی سے چیخ پڑے ہیں۔"

"کاروباری افراد میں آج کل اس کمپنی کا نام کامیابی کی ضمانت کے طور پر ابھر کر سامنے آرہا ہے۔بلکہ یقین کرو میں خود بہتر نوکری کی تلاش میں اسوہ کمپنی کا رخ کرنے والا تھا۔"آخری فقرہ مدثر نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

"خوش آمدید یار!....بلکہ ایسا کرو سچ مچ آجاؤ۔میرا دست راست اب ڈھکے چھپے لفظوں میں کئی بار کہہ چکا ہے کہ اس کا ہاتھ بٹانے والا بھی کوئی ہونا چاہیے۔لیکن مجھے ایسا مخلص شخص نظر نہیں آرہا تھا۔اب تمھاری صورت میں یقیناً اس کا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

مدثر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔"میری تنخواہ ایک لاکھ کے ہندسے کو عبور کر رہی ہے؟"

عمار بے پرواہی سے بولا۔"ڈیڑھ گنا کر لینا۔"

"مذاق کر رہا تھا یار!" مدثر پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"لیکن میں سنجیدہ ہوں۔اور اگر پسند کرو تو میری بہن کے لیے بھی جگہ خالی ہے۔ہمارے پاس عورتوں کا شعبہ علاحدہ ہے۔آج بھی خواتین کا سیلنگ، پرچیزنگ ڈائریکٹر اور اکاؤنٹ آفیسر کی آسامیوں کے لیے انٹرویو ہوا ہے۔ان میں سے کوئی عمدہ بھی اسماء بہن کو پسند ہو تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"مدثر....!" اسماء نے لجاجت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے مدثر کی جانب دیکھا۔

"صبح صبح تمھیں اٹھائے گا کون؟" مدثر نے منہ بنایا۔

"وہ تو میں رات کو دیر تک ٹی وی دیکھتی رہتی ہوں یا مطالعہ کرتی ہوں تبھی صبح آنکھ نہیں کھلتی۔جب نوکری کروں گی تو پھر رات کو جلدی سویا کروں گی نا۔" اسماء نے فوراً حل تلاش کر لیا تھا۔

"جو مرضی آئے کرو۔" مدثر نے فوراً گیند اسی کے کورٹ میں پھینک دی۔

"شکریہ، بہت بہت شکریہ۔" اسماء نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔اس سے پہلے بھی وہ کئی بار دبے لفظوں میں مدثر کو کہہ چکی تھی لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا تھا۔اب عمار کی وجہ سے اس نے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"تو بتاؤ کون سا عہدہ پسند ہے۔"

اسماء نے فوراً کہا۔"مجھے اکاؤنٹس میں دلچسپی ہے۔"

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے عمار نے موبائل فون نکالا اور انوار الحق کو کال کرنے لگا۔

"جی سر!" انوار الحق نے کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"انوار بھائی!.... انٹرویو تو مکمل ہو گیا تھا نا؟"

"جی سر!.... چناؤ بھی کر لیا ہے۔ بس آپ کی منظوری بقایا ہے۔"

"اچھا یہ کرو کہ اکاؤنٹ آفیسر کے لیے میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ میری منہ بولی بہن ہے کل سے وہ آئے گی۔"

"ٹھیک ہے سر!...." انوار الحق نے خوش دلی سے کہا۔

"اور خوش ہو جاؤ، مجھے اپنا پرانا کلاس فیلو مل گیا ہے۔ آپ کو ایک مددگار چاہیے تھا نا؟.... وہ مل گیا۔ بس چند دن تک وہ اپنی موجودہ کمپنی سے استعفا دے کر آجائے گا۔"

"شکریہ سر!.... مجھے واقعی کسی مددگار کی ضرورت تھی کام بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔" انوار الحق نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔ اور عمار نے ہنستے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

"اسماء بہن!.... آپ نے کل آجانا ہے۔ مدثر صاحب!.... تمھارے پاس ایک دو ہفتے کا وقت ہے۔ استعفا دو آجاؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ "اب اجازت چاہوں گا۔" وہ دونوں بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔

دروازے تک وہ اسے چھوڑنے گئے تھے۔ مدثر نے الوداعی مصافحہ کیا جبکہ اسماء نے سر کے اشارے سے سلام کہا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ بولی۔

”عمار بھائی!....ایک بات کہوں خفا تو نہیں ہوں گے؟“

”بہنوں کی بات پر خفا ہونا کم عقلی کی نشانی ہے۔مجھے آپ مدثر کی طرح سمجھتی ہیں؟“

”بھائی صاحب!....اتنے سال بہن یاد نہیں تھی،اب تمھیں بڑی محبت آرہی ہے بہن پر۔“ مدثر نے فوراََ حساب چکتا کیا۔

”آپ لوگوں نے پھر بحث شروع کر دی۔شام کی آذان ہو گئی ہے کیا نماز یہیں قضا کرنے کا ارادہ ہے ۔؟“اسماءنے دونوں کو ڈانٹا۔

”اچھا اسے چھوڑیں آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“عمار فوراََاسماء کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”بھائی!....اسوہ سے شادی کے بعد اس کی امی جان کے بارے بھی کچھ بہتر سوچ لیناوہ غریب اسوہ کے بعد اکیلی رہ جائیں گی۔اسوہ کے علاوہ ان کا کوئی بھی نہیں ہے۔“

”یاددہانی کا شکریہ بہنا!“عمار نے خوش دلی سے سر ہلایا اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔عقبی نشست پر پڑے تحائف دیکھ کر اسے یاد آیا کہ ملاقات کی خوشی میں وہ انھیں تحائف بھی نہیں دے سکا تھا۔اس نے فوراََ تحائف کے پیکٹ اٹھا کر زبردستی انھیں پکڑائے اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔اس کے گاڑی موڑ کر رخصت ہونے تک دونوں میاں بیوی وہیں پر کھڑے اسے دیکھتے رہے۔عمار کی قیمتی کار کو دیکھ کر دونوں کے سینے فخر سے چوڑے ہو گئے تھے۔

☆☆☆

گھر داخل ہوتے ہی وہ سیدھا ماں باپ کی خواب گاہ کی طرف بڑھا۔والدہ تو باورچی خانے میں تھیں البتہ والد بیڈ پر بیٹھا تسبیح گھمارہا تھا۔

"اسلام علیکم ابو جان !"کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سلام کہا اور پھر مزاحیہ لہجے میں بولا۔"بس کریں ابو جان آپ کی دعائیں رنگ لے آئی ہیں۔" یہ کہتے ہی اس نے باپ کے پاؤں کی طرف بیٹھتے ہوئے ان کی پنڈلیاں تھام کر دابنی شروع کر دیں۔

"کون سی دعا برخوردار!....میں تو ہمیشہ یہی دعا مانگتا ہون کہ اللہ پاک تمھیں عقل دے۔"

عمار نے ہنس کر پوچھا۔"عقل دے یا عورت دے؟....اور جہاں تک میرا اندازہ ہے عورت بڑے بڑوں کا عقل خبط کر دیتی ہے۔"

"گویا غزالہ بیٹی ہماری بہو بن کر ہی رہیں گی۔"بشیر احمد خوشی سے چہکا۔

"اسوہ اسلم شکور کیوں نہیں ابو جان"!

"خود تو اس کے امریکہ جانے کے قصے سناتے ہو اور پھر مجھ سے بھی وعدہ کر لیا کہ جلد از جلد مجھے بہولا کر دو گے ،اب یہ اسوہ پھر کہاں سے ٹپک پڑی۔"

"کیا آپ کو غزالہ زیادہ پسند ہے؟"

"مجھے بہو چاہیے یار!....کوئی ایک لڑکی لادو جو تمھیں سیدھا کر سکے اور ہماری خدمت کر سکے باقی لڑکی کالی ہے یا گوری، پڑھی لکھی ہے یا ان پڑھ ،امیر ہے یا غریب اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔"

”ٹھیک ہے ابو جان!.... پھر تیار ہو جائیں۔ آج شام کا کھانا لڑکی والوں کے ہاں جا کر کھانا ہے۔“

”سچ۔“ بشیر احمد خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

”ہاں ابو جان!.... اسوہ امریکہ نہیں گئی، مجھے کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ اس غریب کے والد کی وفات کے بعد ان سے سب کچھ ہتھیا لیا گیا۔ آج کل وہ دفتروں میں چھوٹی چھوٹی جاب کرتی پھرتی ہے۔“

”آزمائش کسی پر بھی آسکتی ہے بیٹا!“ بشیر احمد نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”جی ابو جان!.... اور میں ذرا امی جان کو بھی بتا دوں یونہی باورچی خانے میں پسینہ بہاتی رہیں گی۔ پتا نہیں ملازمہ کس مقصد کے لیے رکھی ہے میں نے جو آپ کی بیگم صاحبہ چوبیس گھنٹے باورچی خانے ہی میں گھسی رہتی ہیں۔“

”خود ہی تو کہتے ہو میاں کہ تمھیں ان کے ہاتھ کے بنے کھانے پسند ہیں پھر گلہ کیسا؟“

”تو صرف میرے لیے بنائیں ناں.... اپنے شوہر صاحب! کے ناز کس لیے اٹھاتی ہیں۔“ عمار نے شرارتی لہجے میں کہا اور والد کا سنے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ بشیر احمد بھی مسکرا پڑا تھا۔

”امی جان!....“ عمار باورچی خانے میں جا کر چولھے کے سامنے کھڑی والدہ سے لپٹ گیا۔

”میرا شہزادہ بڑا خوش نظر آرہا ہے۔“ سکینہ نے بیٹے کی پیشانی پر بوسا دیا۔

”امی جان!.... چھوڑیں ہانڈی روٹی کی جان آج آپ کو آپ کی ہونے والی بہو کے ہاتھ کا کھانا کھلا کر لاتا ہوں۔“

”کیا....؟“ سکینہ خوشگوار حیرت سے چلائی۔ ”میرے کان بج رہے ہیں یا میرے بیٹے سے بات کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔“

”نہ میری پیاری امی جان کے کان بج رہے ہیں اور نہ میں مذاق کیا ہے۔“

”ویسے غزالہ ہے بھی بہت پیاری اور اچھی لڑکی۔“سکینہ بیگم نے چولھا بند کرتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔

”ضرور ہو گی ماں جی!.... میں نے کب کہا کہ غزالہ اچھی لڑکی نہیں ہے، لیکن آپ کی بہو کی جیسی تو کراچی بھر میں کوئی نہیں ہے نا؟“

”کیا مطلب ؟.... کیا تم غزالہ کے علاوہ کسی اور سے شادی کا پروگرام بنائے بیٹھے ہو ؟“

”امی جان !.... یہ وہ لڑکی ہے جس کے لیے آپ کے بیٹے نے آج تک شادی سے انکار کیے رکھا۔“

سکینہ متبسم ہوئی۔”اچھا، تو وہ سیٹھ زادی مل گئی ہے میرے لال کو۔“

”جی ماں جی!“عمار نے حیا آلود لہجے میں اعتراف کیا۔”اور یہ لیں میں اس کے لیے انگوٹھی بھی خرید لایا ہوں ۔“اس نے جیب سے ہیرے کی انگوٹھی نکال کر ماں کی طرف بڑھائی۔

انگوٹھی لے کر سکینہ نے اس کے کان سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔”اب تو انگوٹھی بھی نہیں بھولی تمھیں۔“

”ماں جی!.... یہ کان اصلی ہے۔ آپ جتنا بھی کوشش کریں یہ نہیں اکھڑ سکتا۔“

”بے شرم۔“سکینہ نے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس کان چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

گھڑی کی سوئیاں رات کے ساڑھے آٹھ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں جب عمار نے اسوہ کے گھر کے سامنے کار روکی ۔وہ چھوٹا سا مکان بھی اسے کسی محل کی طرح پر رعب اور دیدہ زیب دکھائی دے رہا تھا۔اسماء اور مدثر کی زبان

سے اسوہ کی محبت کے بارے جان کر وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسوہ اسے اتنا چاہنے لگی گے۔

اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبانے پر مالک مکان نے دروازہ کھولا۔ اور عمار کے ساتھ اس کے والدین کو دیکھتے ہی وہ ایک طرف ہوتے ہوئے بولا۔

"آئیں جی!.... آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے۔" یقیناً اسے اسوہ یا اس کی ماں نے اس بارے پہلے سے مطلع کر دیا تھا۔

"اس سے رہنمائی لے کر وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسرے پورشن پر پہنچ گئے۔

نسرین اور اسوہ بے تابی سے ان کی منتظر تھیں۔ خاص کر اسوہ کی تو دل کی دھڑکن ہی قابو میں نہیں آ رہی تھی ۔ عمار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی میں آنے والا تھا۔ وہی عمار جو کبھی غیر اہم تھا اور اب اس جیسی اہمیت وہ کسی کو دے ہی نہیں سکتی تھی۔

"اسلام علیکم!" بشیر احمد نے اندر داخل ہوتے ہی اسوہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

دونوں ماں بیٹی نے "وعلیکم اسلام!" کہا۔

اسوہ کو دیکھ کر سکینہ خوشی سے اچھلنے کو ہو گئی تھی۔ "ماشاءاللہ، چشم بد دور۔" اس نے اسوہ کو اپنے ساتھ لپٹا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا۔

اسوہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔ عمار کی نظریں بھی جیسے اسوہ کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ تیار بھی تو اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ کھانے کے لیے اسوہ نے ماں کی بات مانے بغیر فرش پر ہی دستر خواں بچھا دیا تھا۔ وہ

عمار کو کھل کر اپنی مفلسی دکھانا چاہتی تھی۔ یوں بھی ریاکاری اور دکھاوا اسے ناپسند تھا۔ ورنہ اس کی ماں نے تو کہا تھا کہ انھیں مالک مکان کو کہہ کر ان کی ڈائینگ ٹیبل پر بٹھا کر مہمانوں کو کھانا کھلایا جائے۔ مگر اسوہ نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ دونوں چارپائیوں دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس نے کمرے کے فرش کے درمیان میں کمبل بچھایا اور اس پر دستر خوان بچھا کر برتن لگا دیئے تھے۔

"ارے واہ!...." فرشی دستر خوان کو دیکھتے ہی بشیر احمد نے نعرہ بلند کیا۔ "جی خوش کر دیا بہن فرش پر دستر خوان بچھا کر۔ یقین مانو جانے کتنا عرصہ ہوا نیچے بیٹھ کر نہیں کھایا۔ مشرقی روایات تو ہم نے ترک ہی کر دی ہیں۔"

"جی چچا جان!...." اسوہ دھیرے سے بولی۔ "جب مغربی روایات پر عمل کرنا ممکن نہ رہے تو ہم جلدی سے مشرقی بن جاتے ہیں۔"

"ایسا نہیں کہتے بیٹا!" بشیر احمد اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آزمائشیں سدا نہ آتی ہیں اور نہ باقی رہتی ہیں۔"

اسوہ کے آنسو بہنے کو جیسے تیار تھے۔ وہ کھانا لانے کے بہانے جلدی سے چھوٹے سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ کھانے کا اس نے کافی اہتمام کیا تھا۔

کھانا خوش گپیوں میں کھایا گیا۔ اسوہ خود کھانے کے بجائے ان کے آگے مختلف پکوان اٹھا کر رکھتی رہی۔

بشیر احمد نے تعریفی لہجے میں کہا "ہماری بیٹی تو بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔"

"انکل!....میں نے صرف روٹیاں اور چکن کری بنائی ہے۔باقی سب کچھ امی جان نے بنایا ہے۔"عمار جو بریانی کی پلیٹ بھر کر بیٹھا تھا غیر محسوس انداز میں بھری ہوئی پلیٹ کو ایک طرف کر کے اپنے لیے چکن کری کا سالن ڈالنے لگا۔اس کی حرکت اسوہ کی نظر سے چھپی نہیں رہی تھی۔اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

کھانے کے بعد بشیر احمد نے باقاعدہ اسوہ کا رشتا طلب کیا۔

"بہن!.... آپ ہماری آمد کا مقصد تو جانتی ہوں گی،پھر بھی رسمی طور پر کہہ دوں کہ ہم آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔"

"آپ کی اپنی بیٹی ہے بھائی جان"!

"شکریہ بہن!....اب اگر ہم اپنی بیٹی کو انگوٹھی پہنانا چاہیں تو یقینا آپ کو اعتراض نہیں ہو گا۔"

"کہہ جو دیا بھائی جان!...."نسرین بیگم نے انکساری سے کہا۔

بشیر احمد نے بیوی کو اشارہ کیا اور اس نے انگوٹھی نکال کر عمار کو پکڑائی۔اسوہ نے بھی اپنی ماں کو انگوٹھی دی ہوئی تھی۔اس نے بھی وہ خوب صورت انگوٹھی اسوہ کو پکڑا دی۔سب سے پہلے عمار اسوہ کا ہاتھ تھام کر اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈالی اور پھر یہی کام اسوہ نے کیا۔

عمار گویا ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔اسوہ بھی کم خوش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔سکینہ بیگم نے مٹھائی کا ڈبا کھول کر سب کا منہ میٹھا کیا۔

"اچھا بھئی اب ہم اجازت چاہیں گے۔شادی کی تاریخ دونوں خود ہی طے کریں گے۔لیکن میں اس موقع پر صرف ایک مطالبہ پیش کروں گا۔گو جہیز مانگنا کوئی اچھی روایت نہیں اور اللہ پاک کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے۔اس کے باوجود میں یہ چاہوں گا کہ دلہن اپنے ساتھ ایک قیمتی چیز ضرور لائے۔"بشیر احمد کا انداز ایسا تھا کہ اسوہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔کہتے ہیں سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔اس کے دل میں بھی خواہ مخواہ ہول اٹھنے لگے تھے۔

ایک لمحہ رک کر بشیر احمد نے کہا۔"اور وہ قیمتی چیز اسوہ کی امی جان ہے۔"بشیر احمد کی بات مکمل ہوتے ہی اسوہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔نسرین بیگم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"بھائی جان!.... آپ کا یہ احسان شاید کبھی بھلا نہ پاؤں۔"

"کیسا احسان بہن!.... میں نے سچ کہا ہے نہ میری کوئی بہن ہے نہ بیٹی۔چلو اسوہ کی صورت مجھے بیٹی کی رحمت تو مل رہی ہے اس کے ساتھ بہن بھی نعمت کی صورت گھر آجائے تو کیا مضائقہ۔کہتے ہیں ایسا موقع گنوانا نہیں چاہیے۔"

نسرین نے ممنونیت سے سر جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

جو بات عمار اور اسوہ کے ذہنوں میں پیدا ہوئی تھی وہ بشیر احمد نے بغیر کسی کے بتائے جان لی تھی۔عمار اپنے والد کا حد سے زیادہ ممنون و احسان مند تھا کہ جس اس خوب صورت انداز میں اسوہ کی ماں کو گھر لانے کی دعوت دی تھی۔جونھی وہ اپنی خواب گاہ میں اکیلا ہوا اسوہ دھم سے اس کی آنکھوں میں آن کودی اچانک اسے یاد آیا کہ

وہ اب تک اسوہ سے اس کا موبائل فون نمبر نہیں مانگ سکا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی کسی ان جان نمبر سے کال آ رہی تھی۔

"یس!" اس نے دوسری تیسری گھنٹی پر کال رسیو کی۔

"اسلام علیکم!" اس کے کانوں میں جلترنگ بجے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اسوہ کی آواز فون پر سنی تھی مگر اسے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا تھا اسے پہچاننے میں۔

اس نے فوراً شرارتی انداز میں کہا۔ "وعلیکم اسلام!.... شکر ہے آواز سن لی ہے۔"

"ابھی گھنٹا بھر تو ہوا ہے یہاں سے گئے ہوئے۔" وہ ناز سے مسکرائی تھی۔

"تم سے دوری کا ایک منٹ مجھے ایک صدی کے برابر لگتا ہے۔ باقی حساب خود ہی کر لو کہ میں یوں بھی ایم اے فیل ہوں۔"

"اور وہ جو اتنے سال مجھ سے دوری میں گزار دیئے ان کا حساب کون دے گا؟" اسوہ کی آواز میں گہرا دکھ در آیا تھا۔

"میں دوں گا۔ ایک منٹ بھی اب دور نہیں رہوں گا۔ بس اب پرسوں شادی کی تاریخ طے کر رہا ہوں۔"

"اتنی لیٹ؟" اسوہ شرارت سے بولی اور عمار کا قہقہہ نکل گیا۔

"اچھا ایک بات مانو گے۔" اس نے منت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں.... " عمار فوراً بولا۔ "بلکہ ساری کی ساری مانوں گا۔"

اور اسوہ جو اس کے انکار پر خفا ہونے لگی تھی کھل کھلا کر ہنس دی۔

"اچھا میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اپنی پرسنل سیکرٹری بنا لیں۔"

"بھلا وہ کیوں....؟" عمار سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔ "کیا مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

"اعتبار ہے بس ڈرتی ہوں صبح سے لے کر شام تک آپ کو دیکھے بغیر کیسے رہ پاؤں گی۔"

"میں نے تمھیں امی جان اور ابو جان کی خدمت کے لیے گھر لا رہا ہوں سمجھیں۔ پرسنل سیکرٹری کی کچھ لگتی۔"

"ٹھیک ہے میں آپ سے بات ہی نہیں کرتی۔" اسوہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ عمار نے فوراً کال بیک کی اور بڑی مشکل سے اسے راضی کیا۔ مگر اسوہ نے آخر اسے منا کر ہی دم لیا تھا۔

آخر دونوں نے مشورے سے شادی کے لیے جمعہ کے بابرکت دن کا انتخاب کیا تھا۔

صبح آفس کے وقت بھی اسوہ کی کال آ گئی اور پھر اس کا کام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ کبھی کبھی وہ اپنی ذات کے لیے اسوہ کی بے چینی اور وارفتگی دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ وہ اس کے وہم و گمان سے کئی گنا بڑھ کر اسے چاہتی تھی۔ فون پر گھنٹوں محو گفتگو رہتے ہوئے اس نے عمار کو ہجر و فراق کی ساری کہانیاں تفصیل سے سنائی تھیں۔ ان کے درمیان کوئی پردہ کوئی آڑ اور کوئی تکلف باقی نہیں رہا تھا۔ اور پھر آخر جمعہ کا دن بھی آن پہنچا۔ پوری یو اے کمپنی عمار کی شادی میں شرکت کے لیے اکٹھی ہو گئی تھی۔ تمام ورکرز ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح تھے۔ جمعرات اور جمعہ کا دن شادی کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا تھا۔ ہفتے کی رات وہ اسوہ کو لینے پہنچ گئے۔ کار کی عقبی نشست پر عمار کے ساتھ بیٹھی ہوئی گویا وہ جنت کے سفر پر روانہ تھی۔ عمار کو لگ رہا تھا کہ اس کے پہلو میں

عطر کی شیشی یا پرفیوم کی بوتل کسی نے رکھ دی ہو۔ اسوہ کے وجود کی بھینی بھینی خوشبو اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔

گھر کے اندر داخل ہو کر جب اسوہ کو کار سے باہر نکال کر اس کے کمرے کی طرف لے جایا گیا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ جگہ اس کی دیکھی بھالی ہو۔ لیکن گھونگھٹ نکالے وہ ارد گرد کا جائزہ نہیں لے سکتی تھی۔ اور پھر جب اسے گھر کے اندر داخل کر کے اس کی خواب گاہ میں بٹھایا گیا تو وہ اپنی حیرانی پر قابو نہ پا سکی۔ اس نے لڑکیوں کی موجودی کی پروا کیے بغیر گھونگھٹ سے سر نکال کر دیکھا۔ اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس کا اپنا کمرہ ہی تو تھا۔ لیکن وہ سوال کرنے کی حالت میں نہیں تھی۔ اسماء، شمائلہ، ثوبیہ، مہ جبین وغیرہ نے اسے گھیرا ہوا تھا۔

وہ اسماء کا ہاتھ تھامتے ہوئے آہستہ سے مستفسر ہوئی۔ "اسماء!.... یہ کمرہ....؟"

"ہاں میری جان!...." اسماء اس سے لپٹ کر بولی۔ "یہ تمھاری اپنی خواب گاہ ہے۔ عمار بھائی نے یہ کوٹھی کب کی خرید لی تھی، لیکن تمھیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

اسوہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے تھے۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آ پہنچا جب عمار اندر داخل ہوا۔ نپے تلے قدم رکھتا ہوا وہ اس کے قریب پہنچا۔ اور " اسلام علیکم!" کہہ کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ "آخر میں نے تمھیں پا لیا۔"

مگر اسوہ خاموش بیٹھی رہی۔ "مجھے علم ہے تمھارے ساتھ بہت زیادتیاں ہوئی ہیں، بہت ظلم ہوئے ہیں اور میں ان ساری زیادتیوں کا ازالہ تو نہیں کر سکتا البتہ تمھاری یہ خاندانی کوٹھی تمھارے نام کر سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر

اس نے ایک فائل اس کے ہاتھ میں تھمائی۔"یہ اس کوٹھی کا کاغذات ہیں جو میں نے تمھارے نام کر دی ہے ۔اس کے علاوہ میں نے ارشد اور اس کے والد کو تلاش کرانے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہو گیا مگر ان کے بارے جو آخری اطلاع ملی وہ بہت بھیانک ہے۔دو ماہ پہلے مسٹر ارشد اور اس کا والد کسی نامعلوم فرد کی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں ارشد موقع ہی پر ہلاک ہو گیا اور اس کا والد ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا ہے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔"مجھے نہ تو کوٹھی چاہیے اور نہ کسی سے بدلہ۔میں نے اپنے رب سے جو مانگا وہ مجھے مل گیا تو باقی سب کچھ بونس ہے۔"

"تو تم نے اپنے رب سے کیا مانگا تھا۔"عمار نے اس کا گھونگھٹ الٹتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔"میں نے اپنے اللہ پاک سے مانگا تھا کہ کوئی تو ایسا ہو جو میرا گھونگھٹ بھی اٹھا سکے۔"اور کمرے کی فضا عمار کے بے ساختہ قہقہے سے گونج اٹھی۔

ختم شد